دو افسانہ نگار

(غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان)

ستارہ

دو افسانہ نگار

(غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان)

ستارہ

حسنِ ادب فیصل آباد

03217044014

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

ASIAN RESEARCH INDEX

Do Afsana Nigar

(*Ghulam Fareed Kathya aur Shahid Rizwan*)

By

Sitara

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ھیں

ضابطہ

نام کتاب: دوافسانہ نگار

(غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان)

تحقیق نگار: ستارہ

کمپوزنگ: محمد مظہر قیوم

سرورق: ڈاکٹر عارف حسین عارف

اہتمام: حسنِ ادب فیصل آباد

باراول: جنوری2023

تعداد : 500

قیمت : 600روپے

ARI ID: 1689952519654

یہ کتاب مہکاں پنجابی ادبی بورڈ اور اکادمی ادبیات
پاکستان کے تعاون سے شائع ہوئی

انتساب

والدین کے نام

ترتیب

❖	پیش لفظ	۵
❖	اردو افسانہ۔۔۔موضوعات وارتقا	۷
	اردو افسانہ (قیام پاکستان سے پہلے)	۱۱
	اردو افسانہ (قیام پاکستان کے بعد)	۱۳
	اردو افسانے کے موضوعات	۲۲
	تانیثیت ،جنسیت ،حقیقت نگاری	۲۳،۲۲
❖	غلام فرید کاٹھیا کے افسانے (موضوعاتی مطالعہ)	۲۷
	مزدوروں کی ترجمانی	۳۱
	پسماندہ طبقے کی ترجمانی	۴۳
	کسانوں کی ترجمانی	۵۴
❖	شاہد رضوان کے افسانے (موضوعاتی مطالعہ)	۶۵
❖	غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان کے افسانے (تقابلی مطالعہ)	۱۲۹
❖	حاصل تحقیق	۱۸۳
❖	کتابیات	۱۹۵

❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پیش لفظ

بے انتہا حمد وثنا اس خالقِ ارض وسما کے لیے جس نے مجھے عقلِ سلیم اور فہم وفراست کی دولت سے مالا مال کیا اور جس نے مجھے لفظوں سے کھیلنے کی قوت اور ملکہ بخشا۔ کروڑوں درود وسلام اس نبی ﷺ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں کہ جنھوں نے انسانیت کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی سے متعارف کروایا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تحقیق انتہائی کٹھن امر ہے۔ اس کتاب کی تکمیل کے دوران اگرچہ مجھے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، کئی بار میرے قدم بھی ڈگمگائے مگر اس وقت میرے شفیق استاد ڈاکٹر مشتاق عادل صاحب نے اس مشکل کام میں میری رہنمائی کی اور مجھے آبلہ پائی کی مشقتوں سے بچائے رکھا اور اپنی مصروفیات سے قیمتی وقت نکال کر ہر لحاظ سے میری مدد کی۔

میں ممنون ہوں اپنے والدین کی کہ جن کی حوصلہ افزائی سے مجھے تقویت ملتی رہی۔ تحقیق کے دوران اکثر شب بیداری والدہ کی نیند میں خلل کا باعث بنی مگر انھوں نے کبھی اس کی شکایت نہیں کی، انتہائی معذرت کے ساتھ ان کی شکر گزار ہوں۔ اپنے اہل خانہ کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے میرے حوصلے کو قائم رکھا۔ میری تحقیقی سرگرمیوں کے دوران انھوں نے میری گھریلو ذمہ داریوں میں تخفیف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ میں بالخصوص اپنے والد محترم کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی مکمل پروف ریڈنگ کی۔ انگلش اور اردو پر ان کا مکمل عبور میری تحریر کے مختلف گوشوں میں آپ کو واضح جھلکتا نظر آئے گا۔ ان کی رہنمائی کے بغیر یہ کام میرے لیے انتہائی کٹھن تھا۔

میں یونیورسٹی آف سیالکوٹ اور اپنے شعبہ کے اساتذہ ڈاکٹر یاسمین کوثر، میڈم ماریہ بلال، ڈاکٹر یوسف اعوان اور ڈاکٹر عامر اقبال کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی شفقت اور حوصلہ افزائی کے باعث میرا یہ تحقیقی کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

میں انتہائی شکر گزار ہوں اپنی دوست عائشہ کی، جس کے بہترین مشوروں اور معاونت سے میں اپنے کام میں یک گونہ ذہنی انہماک پیدا کر سکی، اس کی حوصلہ افزائی نے میرے دشوار کام کو آسان بنا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں شکر گزار ہوں اپنی عزیز دوستوں ماہم، ماریہ، حفصہ کی اور ساتھ عامر بھائی کی بھی کہ ان سب نے میری حوصلہ افزائی کی۔

کتاب کی کمپوزنگ بطریق احسن کرنے کے لیے میں شکر گزار ہوں مظہر بھائی کی کہ ان کی مدد سے میری کاوش پایہ تکمیل کو پہنچی۔

دراصل یہ کتاب سندی تحقیق سے تعلق رکھتی ہے جو ایک مقالے کے طور پر یونیورسٹی آف سیالکوٹ میں پیش کیا گیا۔ اپنی اس تحقیق کو منظر عام پر لانے کے لیے ایک بار پھر شکر گزار ہوں اپنے استادِ محترم مشتاق عادل صاحب کی جنھوں نے ہمیشہ شفقت و محبت اور رہنمائی فرمائی جو میری زندگی کی تاریک راہوں میں ٹمٹماتے جگنو کی طرح تاحیات لَو دیتی رہے گی۔

کوئی بھی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی سی کاوش کی ہے کہ غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان کے افسانوں کا موضوعاتی تقابل کر سکوں۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں یہ آپ لوگوں کی رائے بتائے گی۔

بارگاہِ رب العزت سے دعا ہے میری، کہ میری اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے اور ان سب افراد کو جنہوں نے میری مدد کی جزائے خیر دے۔ (آمین)

ستارہ

سیال کوٹ

جنوری ٢٠٢٣

اردو افسانہ۔۔۔موضوعات وارتقا

ادب کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ادب صرف معاشرتی زندگی کا عکاس ہی نہیں بلکہ اس میں زندگی کی ناہمواریوں کا دکھ اور شخصی اور اجتماعی زندگی کا عکس بھی ملتا ہے۔''ادب'' زندگی سے جنم لیتا ہے۔ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ناممکن ہے۔معاشرے میں رونما ہونے والے سارے عناصر ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔افسانے میں ایک طرف تخلیق کار کی ذات کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف اس سے انسانیت کی اعلیٰ اقدار بھی جھلکتی ہیں۔ادب معاشرے کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور سماجی، تہذیبی اور فکری رجحانات ومیلانات پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ادب معاشرے کا آئینہ اور ترجمان ہے جو تمام حقیقتوں کو من وعن پیش کرتا ہے۔یعنی ادب ہی کے ذریعہ سے کسی بھی بستی، علاقے، خطے، یا ملک وقوم کے باشندوں کی ثقافت، رہن سہن، اطوار اور ان کی بودوباش کا علم ہوتا ہے۔یہ ادب ہی ہے کہ جس کی بدولت کسی بھی قوم کے رہنے والوں کے مجموعی اندازفکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ادب اور زندگی ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ابوالخیر کشفی ادب کے متعلق لکھتے ہیں:

''ادب کے وسیلے سے مختلف سماجوں اور معاشروں نے اپنے
مجموعی اندازِ فکر، مختلف رویوں اپنی ثقافت اور اپنے شعور کا اظہار کیا
ہے۔ادب کو ہر مہذب معاشرے نے نہ صرف گہری توجہ کا مستحق ہی
نہیں سمجھا بلکہ ادب کے آئینے میں اپنے بطون کو پیش کیا ہے۔''(1)

افسانہ جدید ادب کی ایک صنف ہے۔جس میں افسانوی انداز میں حقیقی واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔یہ ناول کے مقابلے میں خاصا مختصر ہوتا ہے۔افسانے میں ناول کی طرح کہانی کو پھیلایا نہیں جاتا بلکہ مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔افسانے سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اصل افسانہ وہ ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکے انگریزی ادب میں افسانے کے لیے''Short Story'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔اردو میں افسانے کی اصطلاح انگریزی سے آئی۔بیسویں صدی میں اردو افسانے کا آغاز ہوا۔افسانے سے قبل ناولوں اور لمبی لمبی داستانوں کا دور تھا۔لوگوں کے پاس جنوں پریوں اور جھوٹی من گھڑت کہانیوں کو سننے کے لیے وافر وقت موجود تھا۔ترقی کے دور کے ساتھ ہی لوگوں کی مصروفیات بڑھتی گئیں۔اور لمبی داستانیں پڑھنے اور سننے کے لیے وقت کی قلت ہونے لگی۔

افسانے کو وجود میں لانے کا مقصد ہی انسان کی بڑھتی ہوئی مصروفیت ہے۔ایک مصروف انسان کم ترین وقت میں افسانے سے اپنے ذوق کی تسکین کر سکتا ہے۔افسانہ سماجی مسائل سے نجات دلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس نے بہت کم عرصے میں اپنی الگ اور نمایاں شناخت قائم کی ہے۔افسانہ اپنے عصری حالات کو بیان کرتا ہے۔افسانہ نہ صرف معاشرے کے مجموعی رویوں کو پیش کرتا ہے بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔افسانہ کسی بھی معاشرے کی تاریخ کو اپنے اندر سمونے کا ہنر رکھتا ہے۔قیامِ پاکستان کے دلخراش واقعات اور شہادت و ہجرت کے مناظر ہوں یا غربت کی چکّی میں پستے ہوئے غریب مزدور ہوں،قدرتی آفات ،سیلاب و زلزلے ہوں یا ڈکٹیٹر شپ ، مارشل لاء،کرپشن کرتے ہوئے سیاسی مگر مچھ ہوں یا مردوں کے معاشرے میں ہوس کا نشانہ بنتی ہوئی خواتین ، افسانے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ سماج کے بے رحم رویوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔یوں وہ تاریخ میں جیتی جاگتی کہانیوں کی صورت سدا زندہ رہتا ہے۔

پاکستان کی سماجی زندگی کے مطالعہ کے لیے اردو افسانہ نے جس نوع کا مواد ہمارے سامنے رکھا وہ ہماری سماجی تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔ہم اردو افسانے کے آئینے میں پاکستان کی بدلتی ہوئی صورتحال کا جس طرح ادراک کر پاتے ہیں۔۔۔۔وہ تحقیقی کتب کے ذریعے تو ممکن ہے لیکن اس نوع کے مطالعہ میں جس چیز کی کمی رہ جائے گی، وہ خود پاکستانی سماج کی جیتی جاگتی تصویر ہوگی۔عام طور پر کہا جاتا ہے کہ:

> ’’ناول وہ لوگ پڑھتے ہیں جن کے پاس روپیہ پیسہ ہے اور فرصت و فراغت بھی انہی کے پاس ہوتی ہے۔افسانہ عام انسانوں کے لیے لکھا جاتا ہے جن کے پاس نہ دولت ہے اور نہ وقت اور نہ فرصت یہاں تو اختصار ہی انتہائے کمال ہے۔‘‘(2)

جس طرح ایک باغ میں رنگ برنگے پھول ملتے ہیں،اسی طرح ہمارے اردو ادب کے گلشن میں بھی افسانے کی بے شمار تعریفیں ملتی ہیں،جن میں زمانے کے ساتھ ساتھ وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نئے مشاہدوں، تجربوں اور جدید حالات کے زیر اثر مفاہیم کے نئے باب کھلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا افسانے کے متعلق کسی بھی حتمی تعریف یا حرف آخر پر پہنچنا آسان نہیں۔ تاہم افسانہ ’’فارسی‘‘ زبان کا لفظ ہے۔ افسانے کے لغوی معنی سرگزشت، جھوٹی کہانی، قصہ، روداد یا کہانی حال وغیرہ کے ہیں۔ کہانی، داستان، قصہ، افسانہ بلحاظ معنی تو ایک جیسے ہی معلوم ہوتے ہیں، تاہم ان کے

مفاہیم میں خاصا فرق ہے جو انہیں ایک دوسرے سے الگ بناتے ہیں۔

مختلف لغات میں اس کے درج ذیل معنی بیان کیے گئے ہیں۔فرہنگ آصفیہ میں افسانے کے یہ معنی درج کیے گئے ہیں: حکایت بے اصل، قصہ، کہانی، من گھڑت کہانی، گھڑا ہوا قصہ، جھوٹی بات، سرگزشت حال، ماجرہ، ذکر۔۔۔''علمی لغت'' کے میں افسانے کے یہ معنی بیان ہوئے ہیں: داستان، قصہ، کہانی، سرگزشت، حال، روداد، مشہور، اصل بات، طویل بات چرچا، ذکر۔۔۔۔۔ جبکہ ''نسیم الغات'' کے مطابق: ''افسانہ، مذکر، قصہ، کہانی، مشہور، جھوٹی بات اور شارٹ سٹوری کہلاتا ہے۔مولوی نورالحسن کی نورالغات کے مطابق افسانے کے درج ذیل معنی ہیں:

''افسانہ (ف بالفتح) ذکر، داستان، قصہ، کہانی سرگزشت۔''(3)

مختصر افسانہ ایسا نثری بیانیہ ہے جسے آدھ گھنٹے سے ایک یا دو گھنٹوں کے وقت میں پڑھا جا سکے۔اردو افسانے کی صنف مغربی ادب سے آئی اور اس نے رفتہ رفتہ ہمارے ہاں ارتقائی مدارج طے کیے۔افسانہ سب سے پہلے ترجمہ کی شکل میں جبکہ بعد ازاں تخلیقات کی صورت پروان چڑھا۔مغرب سے آنے والی اس صنف کے پنپنے اور بار آور ہونے کے لیے یہاں زمین پہلے ہی سے ہموار تھی۔

یوں تو مختلف ادوار میں مشرقی اور مغربی ناقدین افسانے کی بے شمار تعریفیں کر چکے ہیں۔لیکن ان میں سے کوئی بھی تعریف حتمی اور کلی نہیں قرار دی جاسکتی۔تاہم انگریزی ویبسٹر ڈکشنری میں افسانہ کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے:

''A Story in Prose varying videly in length, but Shortly than either a novel or a novelett aund conectrating on a single effect which the writer wants to achive''
(4)

افسانہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں مصنف کسی کردار، ماحول، واقعے اور جذبے کی کہانی کوفنی تقاضوں کے تحت بیان کرتا ہے۔فن افسانہ نگاری وحدت تاثر، اشاریت، اختصار، ایمائیت اور مواد کی فنکارانہ ترتیب کا تقاضا کرتا ہے۔مختلف ادوار میں افسانہ مختلف ادبی اصناف سے متاثر ہوا، ناول سے اس نے فن لیا اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں کیں، ڈرامے سے اس نے سادگی، اثر اور اختصار لیا اور داستان سے منظر کشی لیکن ان تمام خصوصیات کو اس نے اس طرح اپنایا کہ قاری کو پڑھتے ہوئے ناول داستان یا ڈرامے کا گمان بھی نہ گزرے۔انسائیکلو پیڈیا آف لٹریچر نے افسانے کی

تعریف یوں کی ہے:

''مختصر افسانہ سب سے زیادہ قدرتی صنف ہے اس کی پہچان خواہ کسی بھی انداز سے کرائی جائے یہ مختصر طور پر اظہار کا ذریعہ ہی رہتا ہے، یہ سب سے آزاد طرزِ تحریر ہے کسی بھی قسم کی شاعری سے زیادہ آزاد اور شاید ناول سے بھی زیادہ آزاد طرزِ تحریر ہے۔ ایک افسانے میں وہ سب کچھ ہوسکتا ہے جو ایک نظم یا ناول میں نہ ہو۔ ایک افسانہ ایک نظم ہوسکتا ہے اور بنیادی طور پر ایک ناول، یا بیک وقت دونوں ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن کوئی بھی نظم مختصر افسانہ نہیں ہوسکتی اور نہ ہی کوئی ناول مختصر افسانہ ہوسکتا ہے۔''(5)

انسانی حیات مسلسل ارتقا پذیر ہے، اسی لیے حرکت و عمل بھی جاری ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگی کے لیے افسانے میں فکری و فنی تبدیلیاں لازمی کرنا پڑیں۔ ایک بہترین افسانے میں درج ذیل خوبیوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔

1۔ افسانے کی بنیادی خوبی اس کا اختصار ہے۔ یہ اختصار ہی ہے کہ جس کی وجہ سے افسانہ دیگر اصناف سے ممتاز ہے۔

2۔ افسانے میں وحدت کا پایا جانا بھی بہت ضروری ہے۔

3۔ افسانے کو ایسا ہونا چاہیے کہ اسے پڑھنے سے قاری کے جذبات ابھریں اور اسے حقیقت کا گمان ہو۔

4۔ افسانے میں کرداروں کی تعداد بھی کم ہونی چاہیے۔

سید وقار عظیم افسانے کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''مختصر افسانہ ایک ایسی نثری داستان ہے جسے ہم آسانی سے آدھ گھنٹے سے لے کر دو گھنٹے تک پڑھ سکتے ہیں اور جس میں اختصار اور سادگی کے علاوہ اتحادِ اثر، اتحادِ زمان و مکان اور اتحادِ کردار بدرجہ اُتم موجود ہو۔''(6)

افسانہ ایک مختصر قصہ ہوتا ہے۔ جس میں حقیقی ماحول اور کردار مکمل طور پر پلاٹ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ افسانے کی زبان عام فہم ہوتی ہے۔ اس میں معنی خیز الفاظ کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ افسانے میں طوالت پر قابو رکھا جاتا ہے، افسانے میں کرداروں کے نفسیاتی تجربات کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

مختصر افسانہ عام طور پر اس کہانی یا قصہ کو کہا جاتا ہے جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو بیان کیا جائے۔مختلف ناقدین نے افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں لیکن ان میں سے کسی تعریف کو بھی حتمی نہیں کہا جا سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ناقد یا فنکار نے افسانے کے کسی نہ کسی پہلو کو بیان کیا ہے اس کی جامع تعریف نہیں کی۔

مختصر افسانہ ایک ایسی مختصر فکری داستان ہے جس میں کسی خاص واقعہ یا کسی ایک خاص کردار پر روشنی ڈالی گئی ہو۔اردو ادب کی دوسری اصناف کی طرح افسانے کے بھی کچھ اجزائے ترکیبی یا کچھ ایسے عناصر ہیں جن کی بدولت اس کا وجود عمل میں آتا ہے۔اجزائے افسانہ میں بعض عناصر بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان میں پلاٹ، کردار، ماحول اور فضا خاص طور پر اہم ہیں۔ان سب کو مختصر افسانے کی بنیادی خصوصیات کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔کسی بھی افسانے کے سب اجزاء یعنی عنوان، پلاٹ، کردار، مکالمے، تاثرات کی وحدت اور مجموعی ماحول مل کر ایک سے دوسرے واقعے کے درمیان تعلق پیدا کرتے ہیں۔ واقعات کا آغاز، درمیان اور اختتام سب ایک جمالیاتی توازن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ افسانے میں ایک طرح سے مکمل وحدت دکھائی دیتی ہے۔ مختصر افسانے کو نام کی رعایت سے مختصر ہی ہونا چاہیے۔کیوں کہ ناول کے مقابلے اس کا عملی دائرہ کار ذرا محدود ہوتا ہے۔ڈاکٹر محمد احسن کے نزدیک:

> ''مختصر افسانے کی تعریف یہ ہے کہ وہ چند ایک افراد یا واقعات اور حالات کا بیان ہو۔۔اس کا سیٹ ایک ہی واقعہ یا ایک ہی نقطہ نظر یا کسی ایک ہی نفسیاتی پہلو کا احاطہ کیے ہو۔افسانے کے لوازم میں ہم کردار نگاری، منظر نگاری اور مکالمے کے علاوہ اتحاد و مکان اور وحدت تاثر کی شمولیت ضروری سمجھتے ہیں۔''(7)

گویا افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس میں کردار، ماحول، کسی واقعہ یا جذبے کی کہانی کو خاص فنی تقاضوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔

اردو افسانے کا ارتقا:

اگر چہ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ موجودہ مختصر افسانے کا ارتقا شعور کے ایسے بہترین زمانے میں ہوا جب ہماری قومی زندگیوں میں ادب ایک طرح سے خاص تعمیری کام سرانجام دے رہا تھا۔اردو افسانے کے ارتقا سے قبل اردو زبان سے متعلق جاننا ضروری ہے۔اردو زبان جس ملک یا

قوم میں پیدا ہوئی اس سے پہلے وہاں کئی ارتقا یافتہ زبانیں بھی رواج پا چکی تھیں۔اس لیے جب قصہ گوئی کی طرف توجہ دی جانے لگی تو سب سے پہلے انہی قصوں کو اردو کے قالب میں سمویا گیا جو پہلی زبانوں میں موجود تھے۔اردو کی ابتدا میں سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش زبانوں کا اہم کردار رہا ہے۔ویدی ادب بھی قصوں، کہانیوں کے حوالے سے بہت اہم رہا۔سنسکرت اور دیگر زبانوں کے بعد عربی و فارسی قصص بھی زبان میں شامل ہوتے چلے گے۔اول تو تراجم کی صورت میں، پھر اس کے بعد منظوم نثری دکنی و شمالی داستانوں سے گزرتے ہوئے یہ سلسلہ فورٹ ولیم کے قصوں کہانیاں تک جا پہنچا۔اس سب کے بعد تمثیلی قصوں اور ناولوں نے اس تسلسل کو آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی میں اخبارات اور رسائل میں قصہ گوئی کا رجحان بڑھا۔یوں رفتہ رفتہ افسانے کے لیے فضا سازگار ہوئی۔

ٹیکنالوجی کے دور میں وقت اور فرصت کی اہمیت زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اب فن نے اپنے آپ کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے جو عین معاشرے کے مزاج کے مطابق ہے۔اس طرح نیا فن پیدا ہوا اور پرانے فن میں تبدیلی آئی۔ نئے زمانے کے مزاج کا بہترین فن افسانہ ہے۔افسانہ کہانی، قصہ اور داستان کی ارتقائی شکل ہے جو جدید دور کی مصروفیت کے پیش نظر سامنے آئی۔ڈاکٹر پروین اظہر لکھتی ہیں:

> ”اردو میں قصے کہانی کی ابتدا اٹھارویں صدی سے شروع ہوئی۔ 1857ء کے غدر کے بعد معاشرتی زندگی میں تبدیلی ناول کے آغاز کا سبب بنی تو بیسویں صدی کی ہندوستانی زندگی کے بحران و انتشار نے با قاعدہ مختصر افسانے کی راویت قائم کی۔“(8)

اگرچہ قصے، کہانی سے انسان کا تعلق بہت پرانا ہے۔انسان کی فطرت میں ہی کہانی سے دلچسپی موجود ہے اسی لیے زندگی کی ابتدا سے ہی کہانیوں کا آغاز ہو گیا۔کہانی کا رواج ہر دور میں اور ہر قوم میں رہا تھا۔برصغیر میں بھی کہانی نویسی کی روایت نہایت پرانی ہے جو بعد میں لوک داستان کے فروغ کی وجہ سے اساطیری روپ اختیار کر لیتی ہے۔داستان ایک طویل قصہ یا کہانی کو کہا جاتا ہے جو پہلے زمانے میں انسانی تفریح کے طور پر سنائی جاتی تھی۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں انسان ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا قصہ و کہانی کا رواج ختم ہو گیا۔ نئے زمانے میں کہانی نے نیا روپ سدھار لیا اور ناول کے روپ میں سامنے آئی اور پھر بیسویں صدی میں افسانے کے روپ میں نظر آئی۔

اردو افسانہ (قیام پاکستان سے پہلے)

مختصر افسانے کا آغاز امریکہ میں ہوا مغرب میں جدید افسانے کا بانی ''ایڈگر ایلن پو'' کو مانا جاتا ہے۔ اردو ادب میں افسانہ کی ابتداء بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہوئی مگر اردو کے اولین افسانہ نگار کا تعین کرنا ایک مشکل اور اختلافی کام ہے۔ مختلف ناقدین اور محققین اردو کے اولین افسانہ نگاروں کے طور پر پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور راشد الخیری کا نام لیتے ہیں۔ محمد اشرف اردو کا پہلا افسانہ نگار پریم چند کو قرار دیتے ہیں جبکہ بعض محققین علامہ راشد الخیری کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ اردو میں مختصر افسانے کا آغاز پریم چند کے ہاتھوں ہوا اور یہی اس کے میر کارواں کہلائے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند نہیں بلکہ سجاد حیدر یلدرم تھے۔ ان کے مطابق اردو کا پہلا افسانہ پریم چند کا ''انمول رتن'' نہیں بلکہ یلدرم کا ''نشہ کی پہلی ترنگ ہے۔'' جبکہ ڈاکٹر صغیر افراہیم اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''سجاد حیدر یلدرم کے افسانے ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' اور ''نشہ کی پہلی ترنگ'' ان کے طبع زاد افسانے نہیں بلکہ ترکی اور انگریزی افسانوں کے تراجم ہیں۔'' (9)

اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم اردو افسانے کے دو اہم ستون ہیں۔ پریم چند نے افسانے میں حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ اردو افسانہ میں سب سے اہم روایت حقیقت نگاری کی ہے اور یہ روایت پریم چند اور ان کے معاصرین کے ہاں ہی ملتی ہے۔ جب پریم چند کی حقیقت نگاری کو فروغ ملا تو اس دور میں رومانوی تحریک کا بھی آغاز ہوا۔ رومانوی تحریک کے بانی سجاد حیدر یلدرم ہیں۔ یلدرم نے اردو افسانے میں رومانویت کو فروغ دیا۔ اس کے علاوہ مجنوں گورکھ پوری، مہدی افادی اور نیاز فتح پوری نے رومانوی طرز کے افسانے لکھے۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے میں حقیقت نگاری اور رومانویت دو الگ الگ رجحانات کو فروغ دیا۔

ترقی پسند تحریک نے سماجی حقیقت نگاری کو فروغ دیا اس سلسلے میں ''انگارے'' کی اشاعت نے اردو ادب کو ایک نیا موڑ بخشا۔ ''انگارے'' 1932 میں شائع ہوا۔ ''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے پریم چند کی اصلاح پسندی اور مقصدیت کو وسعت دی۔ انگارے کے مصنفین میں احمد علی، محمود الظفر، سجاد ظہیر اور رشید جہاں شامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر طاہر طیب:

> ''ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اسلوبیاتی، ہیئتی اور تکنیکی اعتبار سے اردو

افسانے میں کامیاب تجربات کیے۔ان افسانہ نگاروں پر جہاں مغربی
ادب کے اثرات تھے وہیں مغربی نفسیات دانوں خصوصا فرائیڈ کے
اثرات بھی نمایاں تھے۔''(10)

''انگارے'' میں مذہبی انتہا پسندی کے خلاف بغض، پرانی قدروں سے نفرت، جنسی گھٹن کو توڑ دینے کی خواہش، محبت کی زندگی میں آزادی کی تمنا، سماج کی عائد کردہ پابندیوں کا لبادہ اتار پھینکنے کا اعلان اور صحت مند معاشرے کی تعمیر جیسے موضوعات ملتے ہے۔''انگارے'' کی اشاعت پر جہاں مذہبی اور سماجی لوگوں نے کئی اعتراضات کیے وہیں ایک بڑے طبقے نے اس کی حمایت بھی کی۔''انگارے'' نے نہ صرف مقصدیت اور سماجی حقیقت پسندی کو فروغ دیا بلکہ جدید تقاضوں کے مطابق ادب برائے زندگی کو بھی فروغ دیا۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں میں، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، اختر حسین رائے پوری اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ڈاکٹر سبینہ اویس کے مطابق:

''حلقے کے زیر اثر اردو افسانے میں تکنیکی تبدیلیاں بطور خاص اہم
ہیں۔یہ تحریک مغرب کی جدید تحریکوں سے متاثر اور تجدید کی داعی تھی۔
اس لیے علامتیت، تاثرات اور جدید نفسیات کے حوالے سے مغرب
میں ہونے والے نئے تجربات کو افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں
شامل کیا''۔(11)

ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں نے جہاں مارکسی، اشتراکی ادب اور ادب برائے زندگی کو فروغ دیا، وہیں اس دور میں افسانہ مغربی ادب سے بھی متاثر ہوا۔اس طرح ترقی پسند تحریک کے بعد حلقہ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا۔اس حلقے نے ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں ادیبوں کو لکھنے کی زیادہ آزادی دی۔حلقہ کے افسانہ نگاروں میں ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، انتظار حسین، آغا بابر، الطاف فاطمہ اور شیر محمد اختر وغیرہ شامل ہیں۔اس حلقے نے اردو افسانے میں بہت سی تبدیلیاں کیں اور اس تحریک نے نفسیاتی اور علامتی رجحان کو فروغ دیا۔

اردو افسانہ (قیام پاکستان کے بعد)

قیامِ پاکستان نے اردو ادب کے ادیبوں کے اذہان اور فکر پر کئی طرح کے اثرات مرتب

کئے ہیں۔ برصغیر میں جہاں معاشرتی، معاشی اور سیاسی طور پر انقلاب آیا، وہیں ادب پر بھی اس کے گہرے نقوش مرتب ہوئے۔ یوں دیگر اصناف کی طرح اردو افسانہ پر بھی اس کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانے میں نئے رجحانات اور نئے موضوعات شامل ہو گئے، اس طرح افسانہ ایک نئے روپ میں سامنے آیا۔قیامِ پاکستان کے بعد اردو افسانے کے موضوعات ہجرت اور فسادات پر مبنی رہے۔ ہندوستان کی تقسیم نے ہر طرف انسانی استحصال ،عصمت دری، لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ایک طویل عرصے تک لوگوں پر اضطرابی کیفیت طاری رہی اور برصغیر کی عوام ایک ناقابلِ بیان بحران اور کرب کی کیفیت میں مبتلا رہی۔آزادی کے بعد اردو افسانہ جن حالات سے دوچار ہوا ان میں، فسادات ہجرت، مہاجرین کی آبادکاری اور جمہوری نظام کا قیام وغیرہ شامل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کے افسانوں میں آزادی کے نتیجے میں ہونے والی قربانیوں،ہجرت کے واقعات،شہادتوں، جانی و مالی نقصان وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔عائشہ سلطانہ لکھتی ہیں:

''آزادی سے قبل اردو افسانوں کا موضوع اگرچہ وسیع تھا لیکن آزادی کے بعد افسانہ نگاروں نے نئے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی جن میں ہجرت، فسادات و مسائل، مہاجرین کی پناہ گیری و آبادکاری کا انتظام اور ان کی دردناک زندگی کی تصویر کشی وغیرہ اہم ہیں۔''(12)

ہجرت و فسادات کے موضوع پر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں زیادہ تر وہ مصنفین شامل ہیں جو ترقی پسند تحریک سے متاثر یا ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔قیامِ پاکستان کے بعد نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ ڈاکٹر ظفر سعید کے مطابق فسادات پر لکھے گئے افسانوں میں نئی اور پرانی نسل کے افسانہ نگاروں کی فنی مہارت کا فرق بالکل واضح ہے۔مگر نقطہ نظر میں سب کے یہاں یکسانیت ہے۔ان لوگوں نے فسادات کے موضوع کو پیش کرتے وقت ترقی پسند نظریے کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔

فسادات کے موضوع پر سب سے پہلے کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے کے دو افسانوں ''لال باغ'' اور ''جیکسن'' میں رجعت پسند اور سازشی طاقتوں کے بارے میں بیان کیا گیا جو فسادات کے ذمہ دار تھے۔افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' اور ''اندھے'' میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ہونے والے حیوانیت سوز واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

افسانہ ''طوائف'' میں دو کم سن بچیوں کے لٹنے اور تباہ ہونے کی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔افسانہ ''امرتسر'' میں آزادی سے پہلے اور بعد میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے ماحول کا

ذکر ملتا ہے۔منٹو نے افسانے تحریر کیے اور انسان کا وحشی روپ دکھایا۔ان کے فسادات کے موضوع پر لکھے گئے بہترین افسانوں میں ''کھول دو''،''ٹوبہ ٹیک سنگھ''،''ٹھنڈا گوشت''اور''موذیل''وغیرہ شامل ہیں۔افسانہ''موذیل''میں ان فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر ہے جو بمبئی میں برپا ہوئے۔ڈاکٹر فوزیہ اسلم کے مطابق:

''فسادات کے زمانے میں دوافسانہ نگاروں نے سب سے زیادہ لکھا۔
ان میں ایک کرشن چندر اور دوسرے سعادت حسن منٹو،لیکن جو مرتبہ اور
شہرت منٹو کو حاصل ہوئی وہ کرشن چندر کے حصے میں نہیں آئی''۔(13)

عصمت چغتائی کا افسانہ''جڑیں''آزادی سے پہلے اور بعد کا منظر نامہ ہے۔حیات اللہ انصاری کے افسانے''شکر گزار آنکھیں''اور''ماں بیٹا''میں تقسیم کے وقت ہونے والے خونی فسادات کا ذکر ہے۔اس سلسلے میں بلونت سنگھ کے افسانے''نیلا پتھر''اور''لمحے''بہترین افسانے ہیں۔ہندو مسلم فسادات کے زمرے میں لکھے جانے والے علی عباس حسینی کے افسانے''ایک ماں کے دو بچے''،''بوڑھا اور ماں''،''دیش و دھرم''اہم ہیں۔ان کے افسانوں میں جہاں ظلم و زیادتی اور انسانی بربریت کا ذکر ملتا ہے وہیں انسان دوستی کے نادر نمونے بھی دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے افسانے''سردار جی''،''میں کون ہوں''،سہیل عظیم آبادی کا''اندھیرے میں ایک کرن''،مہندر ناتھ کا''پاکستان سے ہندوستان تک''،''گالی''،''چاندی کے تارے''،بیدی کا''لاجونتی''محمد احسن کا''او جانے والے''اور اوپندر ناتھ اشک کا''ٹیبل لیمپ''وغیرہ اہم ہیں۔عائشہ سلطانہ لکھتی ہیں:

''ترقی پسند تحریک کے بعد افسانہ نگاروں نے تقسیم ہند کے موضوع پر نہ
صرف دل کھول کر لکھا بلکہ اس موضوع کو تاریخ کا ایک حصہ بنادیا۔یہی
وہ مسائل ہیں جنہیں اردو افسانوں کا موضوع بنایا گیا''(14)

پچاس کی دہائی کے بعد جو افسانہ نگار منظرِ عام پر آئے وہ رومانویت کی طرف مائل ہوئے۔انہوں نے تلخ سماجی حقیقتوں کو رومانویت میں پیش کرنا شروع کیا۔اس رومانویت کے دور کو''نو رومانویت''کے نام سے پکارا جانے لگا۔نو رومانویت کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک نام ''انتظار حسین''کا ہے۔ان کے لکھے ہوئے افسانے نو رومانویت کی بہترین مثال کہے جا سکتے ہیں۔انتظار حسین نے فرد کے عروج و زوال اور ماضی میں کھو جانے والے افراد کی تلاش کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کی رومانویت ناسٹلجیا (ماضی پرستی) کی کتھا معلوم ہوتی ہے۔اے حمید کی کہانیوں

میں محبت کی معصومیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ان کے افسانے رومانوی فضا بندی اور ماحول سازی کا بہترین مرقع کہے جاسکتے ہیں۔

ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی اور اے حمید کی کہانیوں میں رومان کے ساتھ نفسیاتی اور جنسی فضا بھی نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ اس عہد میں لکھنے والے نو رومانوی افسانہ نگاروں میں رحمان مذنب، شفیق الرحمٰن اور آغا بابر شامل ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے اس دور میں بے یقینی اور مایوسی کی فضا میں رومان اور مثالیت پسندی کے رویے کے ذریعے سچ، امید اور محبت کے دیے جلائے۔محمد عالم خان رقمطراز ہیں۔

> ''اردو افسانے میں رومانوی رجحان پہلے بھی تھا۔۔۔لیکن تقسیم کے بعد جدائی کا تجربہ ایک اجتماعی آشوب میں تبدیل ہوگیا اور رومانوی طرز احساس اجتماعی کرب کی سرحدیں پار کر کے اجتماعی تجربے میں ڈھل گیا۔''(15)

اسی دور میں اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کا آغاز ہوا۔ یہ دونوں الگ الگ تحریکیں ہیں۔ لیکن ان کے نظریاتی اور فکری رویوں میں مطابقت کی وجہ سے ان کا ذکر ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ پاکستانی ادب کی تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں ثقافتی، تہذیبی اور مذہبی علائم و تلمیحات اور استعاروں کا استعمال کیا جس سے اسلامی فضا اور پاکستانی مزاج افسانہ میں فروغ پانے لگا۔ یہ تحریکیں وقتی طور پر اردو افسانے پر اثر انداز ہوئیں مگر بعد کے افسانہ نگاروں نے اس کا اثر قبول نہیں کیا۔

ان تحریکوں کے بعد جدیدیت کا آغاز ہوا۔یوں کبھی جدت اور انفرادیت اور کبھی روایت کو جدیدیت کا نام دیا گیا ہے۔جدیدیت کے رجحان کے تحت اردو افسانے میں اسلوبیاتی اور فنی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اس تحریک کے زیر اثر علامتی اور استعاراتی اسالیب افسانے میں استعمال ہونے لگے۔گویا علامتوں کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ڈاکٹر عارف ثاقب لکھتے ہیں:

> ''روایت کے مروجہ پہلو میں اپنے عہد کی تخلیقی قوتوں کو نمو یاب کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تو اسی کے بطن سے ایک نئے وجود کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنا مرکز تلاش کر کے جدیدیت بن جاتے ہیں۔''(16)

اردو ادب میں علامت نگاری نے بھی فروغ پایا۔علامت نگاری ایک کثیر الجہت جدید اصطلاح ہے۔ادب میں علامت سے مراد ایک ایسی پیشکش ہے جو ذہن کو کسی خیال یا چیز کی جانب

راغب کرے اور معنویت کی ایک ایسی سطح سامنے لاتی ہو جس کو عام الفاظ میں ہم اپنی گرفت میں نہ لے سکتے ہوں۔ جدید افسانے سے قبل بھی علامتی اسلوب کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ جدیدت کے بعد علامتی اسلوب کا رجحان غالب ہوا۔ نئے نئے استعارے، علامتیں، تمثیل، شعری زبان، علامتی کردار، پیچیدہ و غیر مرکب پلاٹ اور کلیدی جملوں کی تکرار نمایاں نظر آتی ہے۔ جدید افسانہ نگاروں میں جوگندر پال، انتظار حسین، مسعود اشعر، انور سجاد، خالدہ حسین اور رشید امجد قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے علامتی اور تجریدی افسانے تحریر کیے۔

انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں علامتی و تمثیلی پیرائے، شعور کی رو اور آزاد تلازمہ جیسی تکنیکوں کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے ہجرت، فسادات، اور ماضی کی بازیافت اور مسلمانوں کے باطنی زوال کو علامتی پیرائے میں بیان کیا۔ انتظار حسین کا افسانوی مجموعہ ''آخری آدمی'' علامتی افسانے کی بہترین مثال ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں کے کرداروں کی تشکیل حکایتوں، علامتوں اور اساطیری حوالوں سے کی گئی ہے۔ تمثیلی انداز میں اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، ذہنی انتشار اور روحانی زوال کو پیش کیا گیا ہے۔

انور سجاد نے علامتی و تجریدی افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''استعارے'' اور ''چوراہا'' میں استعاراتی تجریدی عنصر پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ذات کی گھٹن اور داخلی تنہائی کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر دیو مالائی اور اساطیر علامتوں کا استعمال نظر آتا ہے۔

رشید امجد بھی علامتی اور تجریدی افسانہ تخلیق کرنے والوں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے میں موضوعاتی، تکنیکی اور لسانی سطح پر نت نئے تجربات کیے ان کے افسانوں میں شعری اسلوب کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ افسانہ ''پت جھڑ میں خود کلامی''، ''سہ پہر کی خزاں'' اور ''ریت پر گرفت'' میں انہوں نے نئی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں سیدہ حنا پروین، شکیلہ رفیق، خالدہ حسین، شہناز رفیق، زاہدہ حنا کے نام شامل ہیں۔ ان خواتین افسانہ نگاروں نے ہیت، تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے افسانوں میں کئی تجربات کیے اور اپنی الگ پہچان بنائی۔ شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> ''جدید افسانہ نگاروں کا زندگی اور اس کے مسائل کے سمجھنے اور اسے
> پرکھنے کا انداز فطری تھا۔ اس لیے انہوں نے صنعتی دور کے انسان کی

معاشی بدحالی اور سماجی پس ماندگی کے مقابلہ میں اس کی فکری اور جذباتی ناآسودگی، انسان کی داخلی شخصیت کے بکھراؤ، اقدار کی شکست وریخت جیسے موضوعات کو اہمیت دی۔۔۔۔اس کے اظہار کیلیے انہوں نے بیانیہ اسلوب کی بجائے علامتی طرز کو اپنایا۔'' (17)

1965ء کی جنگ نے بھی اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اس دور میں لکھے جانے والے افسانوں میں محبت اور خود شناسی جیسے موضوعات ملتے ہیں۔70ء کی دہائی میں علامتی اور تجریدی افسانے لکھے جانے لگے۔اس دور میں افسانہ نگاروں نے گزشتہ سات دہائیوں کے تجربات سے استفادہ کر کے افسانے کو ایک نیا موڑ دیا۔ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے مطابق:

''جدیدیت نے جس علامت نگاری کو بڑھاوا دیا تھا وہ جب شدت اختیار کر گئی تو مبہم علامتیں اور گنجلک نثر کا زور بڑھتا گیا۔تمثیلی اور تجریدی کہانیوں کے نام پر جو عجیب وغریب نثر لکھی گئی اور اسے افسانہ تسلیم کرنے پر زور دیا گیا۔انشائیوں پر افسانے کو چسپاں کر دیا گیا۔'' (18)

سقوطِ ڈھاکہ پاکستان کی تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔جس کے نتیجے میں ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔اس سانحے کا اثر اردو افسانے پر بھی ہوا۔اس دور کے بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں اجتماعی کرب کی کیفیت نظر آتی ہے۔آغا سہیل، مسعود اشعر، غلام محمد اور زین الدین نے اپنے افسانوں میں بنگال کے زوال پذیر معاشرے کا ذکر خوبصورتی سے کیا۔ڈاکٹر انوار احمد کے مطابق شہزاد نے جرات کے ساتھ اپنے ہی ہم نسلوں کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ اس سرزمین کے بارے میں سچ کے دوسرے رخ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔اسّی کی دہائی میں جدید افسانے نے مابعد جدیدیت کی طرف سفر کیا اور مابعد جدید افسانے کا آغاز ہوا۔مابعد جدید افسانہ نگاروں کا ایک اہم کارنامہ یہ کہ انہوں نے افسانے کو ذات کے حصار سے نکال کر اس کا رشتہ سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل وحقائق سے وابستہ کیا۔اس دور میں افسانے کے اجزائے ترکیبی اور فنی لوازمات پر نئے طریقے سے غور کیا گیا۔80 کی دہائی میں مارشل لاء کے حوالے سے اردو افسانے کو ایک نیا مزاحمتی رنگ دیا۔جس کے تحت اردو افسانے میں نئی نئی علامتیں استعمال ہونے لگیں۔اس دور کو علامتی افسانے کا ایک نیا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر طاہر طیب کے مطابق:

''اس دور میں اظہار کی پابندی نے معاشرے میں نفسیاتی سطح پر ایسی صورتحال پیدا کی جس سے گھٹن زدہ ماحول، بیزاری اور جھنجھلاہٹ کا

احساس ہوتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اس سیاسی جبر کو افسانے میں سمونے کی کوشش کی اور بدترین اور خوف واستحصال کے ماحول کو بیان کیا۔''(19)

اس دور میں کئی افسانے تخلیق ہوئے جن میں معاشرتی مسائل، آزادی اور مارشل لاء کے وقت کے جبر واستبداد کا اظہار ملتا ہے۔اس حوالے سے منشا یاد کا ''رکی ہوئی آوازیں'' اور ''ہوکا'' مرزا حامد بیگ کا ''مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا''، رشید امجد کے ''سہ پہر کی خزاں''، ''دھند لکے''، ''ریزہ ریزہ شہادت'' احمد داؤد کے ''وہسکی''، ''پرندے کا گوشت''، فرید حفیظ کا ''رب نہ کرے'' اور اکرام اللہ کا ''سیاہ آسمان'' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔90ء کی دہائی میں اردو افسانے میں حقیقت نگاری کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔اس دور میں افسانے میں ابلاغ وترسیل کے مسائل کا خاتمہ ہوا۔اس دور کے افسانہ نگاروں نے تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی مسائل پر گہری نظر رکھی اور متنوع موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔اس دور میں افسانے میں کہانی کا ایک نیا انداز نکھر کر سامنے آتا ہے اور اردو افسانے کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

''اسی اور نوے کی دہائی میں نئے افسانے نے اپنی پہچان بنالی تھی۔اس لیے اس کی تفہیم میں کوئی رکاوٹ نہ رہی جسے کہانی کی واپسی سے تعبیر کیا گیا۔۔۔ہوا صرف یہ کہ نئی کہانی کا فن نکھر گیا اور قاری اس سے مانوس ہوگیا''(20)

اکیسویں صدی میں نت نئے موضوعات پر افسانے تحریر ہوئے جس میں معاشرتی، معاشی اور سیاسی موضوعات کے علاوہ جدید ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ مسائل زلزلے، ایٹمی دھماکے اور سیلاب سے پیدا شدہ مسائل، دہشت گردی خودکش بم دھماکہ اور نائن الیون جیسے موضوعات کو افسانوں میں جگہ دی۔اس دور کا افسانہ بین الاقوامی صورتحال کا ایک بہت خوبصورت نمونہ پیش کرتا ہے۔

جدید دور میں اردو افسانے نے بہت ترقی کی۔دورِ جدید کا افسانہ نگار ایک وسیع ذہنی افق رکھتا ہے۔اس نے فرد کی نجی مجبوریوں اور ذاتی سوچ کو اس طرح افسانے میں پیش کیا کہ ہمارا پورا سماجی اور سیاسی نظام افسانے کی گرفت میں نظر آتا ہے۔جدید دور کے افسانے کی بنیاد محض مشاہدے پر نہیں بلکہ تجربات پر استوار ہے۔دورِ جدید کے افسانہ نگاروں کے سامنے ماضی کے نمونے موجود تھے لہٰذا انہوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افسانے میں فکری، فنی اور اسلوبیاتی لحاظ سے کامیاب تجربات کیے ہیں۔آج کے افسانوں میں معاشرتی زندگی، سیاسی حالات، بین الاقوامی تناؤ، انسانی افکار واقدار

اور نظریات کی واضح تصویر کشی نظر آتی ہے۔

جدید دور کے افسانہ نگاروں میں ناصر عباس نیر اہمیت کے حامل ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں نو آبادیاتی صورتحال میں جکڑے ہوئے معاشرے کی روح کے کرب کو بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں مذہبی انتہا پسندی، ان پڑھ لوگ، ریاستی مجبوری، مولوی کی اجاہ داری اور فرقہ واریت کو موضوع بنایا۔ سلمیٰ اعوان کے افسانوی مجموعے ''بیچ بچولن''، ''کہانیاں اپنی اپنی'' اور'' کہانیاں دنیا کی'' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں میں معاشرتی اور سماجی مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے افسانوں میں کرداروں اور جزئیات نگاری کی طرف خاص توجہ دی ہے۔حمیرا اشفاق کے افسانوں میں'' گھگو گھوڑے''، ''مسٹر چڑ چل'' اور'' تھوک'' قابل ذکر ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کے مسائل وڈیرے اور جاگیردار طبقے ،عورتوں کی تعلیم، اور عورتوں کے حقوق کی پامالی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا افسانوی مجموعہ'' سیاہ آنکھ میں تصویر'' شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی جبر، آمریت، مغربی تہذیب، توہمات پرستی، دور جدید کی بڑھتی ہوئی مصروفیات، اور تیسری دنیا کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں عصری تاریخ کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ان کے افسانوں میں علامت، اساطیر اور وجودی حوالے کہانیوں میں دلچسپی پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

شہناز نقوی نے زندگی کی تلخیوں کو بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ معاشی ناہمواریوں اور سماجی رویوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ عورت کے دکھ، کرب اور اس کے مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ شہناز نقوی کی کہانیوں میں ایک ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔

علی اکبر ناطق کے افسانوں کا بنیادی موضوع پنجاب کی دیہی ثقافت ہے۔انہوں نے دیہی زندگی کے مناظر کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ ناطق کے افسانے ادب کے قاری کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے اہم افسانہ نگار نجم الدین احمد ہیں۔ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان میں پہلا'' آؤ بھائی کھیلیں'' کے نام سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ جس میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں۔اس افسانوی مجموعے کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور انہیں پاکستان رائٹرز گلڈ ایواڈ سے نوازا گیا۔ جبکہ دوسرا افسانوی مجموعہ ''فرار اور دوسرے افسانے'' کے نام سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔ نجم

الدین احمد کے افسانوں میں ''آؤ بھائی کھیلیں''، ''بقدر جثہ''، ''تیسری شادی''، ''داشتہ''، '' کتے کی موت'' اور'' زلزلہ'' قابل ذکر ہیں۔

اردوافسانے کےموضوعات

ایک بنیادی افسانے کے لیے بنیادی عنصر اس کے موضوع پر منحصر ہے، ہمارے ارد گرد بہت سے واقعات موجود ہیں جنہیں افسانے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔موضوع کے لحاظ سے افسانے کی کئی اقسام ہیں۔نفسیاتی، معاشی، معاشرتی، سیاسی مزاحمتی اور جنسی وغیرہ۔موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے غور کریں تو عہدِ حاضر کے افسانے میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے موضوعات واسلوب اور تکنیک کے واضح اثرات ملتے ہیں۔نئے افسانے کے موضوع کا کینوس یوں تو بہت وسیع ہے لیکن موجودہ دور میں جن موضوعات پر بطور خاص افسانے تحریر کئے جا رہے ہیں ان میں سیاسی کشمکش، طبقاتی فرق، سماجی آویزش، معاشرتی مسائل، جہیز کا مسلہ، ازدواجی زندگی کی پیچیدگیاں، اخلاقی اقدار کی شکست وریخت، انسانی رشتوں کا ٹوٹنا، بھوک اور افلاس، نفسیاتی، پیچیدگیاں، عالمی سیاست، صارفیت وغیرہ لیکن ان تمام افسانوں میں بیشتر افسانے فرقہ واریت، کساد بازاری اور عدم تحفظ کے احساس سے متعلق ہیں۔یہ تمام موضوعات انسانی زندگی کے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں اور ہر انسان کسی نہ کسی صورت میں شعوری یا لاشعوری طور پر ان مسائل سے وابستہ ہے۔

تانیثیت

تانیثیت کا تعلق براہِ راست عورت اور اس کے حقوق سے ہے۔تانیثی تحریک کا بنیادی مقصد عورتوں کو مردوں کے برابر سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور قانونی برابری دینا۔تانیثی تحریک عورتوں کے لیے انصاف کی طالب ہے، معاشرے میں رائج مختلف امتیازات کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے۔اردو افسانے میں نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں تانیثی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔جہاں عورتیں سماجی، معاشی، سیاسی، معاشرتی اور علاقائی مسائل پر قلم اٹھا رہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کے ساتھ پیش آنے والے مسائل کو بھی قلم بند کر رہی ہیں۔اس ضمن میں غور کریں تو ذکیہ مشہدی ایک معتبر نام ہے۔انہوں نے عورتوں کی زندگی کو بڑی فنکاری سے پیش کیا۔ان کو افسانہ ''تھکے پاؤں'' اور ''حصار'' تانیثی پہلو سے ان کے بہترین افسانے ہیں۔نسائی زندگی کو بیان کرنے والی ایک اور اہم افسانہ نگار ترنم ریاض بھی ہیں۔ترنم ریاض کی عورت مشرقی تہذیب کی نمائندگی بھی کرتی ہے اور بغاوت کا جذبہ بھی رکھتی ہے۔ان کا افسانہ ''ہم تو ڈوبے صنم'' اسی قسم کا افسانہ ہے۔اس

کے علاوہ نگار عظیم، شائستہ فخری، غزالہ ضیغم اور دیگر افسانہ نگاروں نے عورتوں کے حوالے سے اپنے خیال کو جس طرح تخلیق کی شکل میں ابھارا ہے اس میں ہندوستانی عورت کے تمام حالات اجاگر ہوتے ہیں۔

جنسیت

انگارے کے مصنفین نے پہلی بار سماجی مسائل کو مغربی زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔انہوں نے ادب اور سماج کے بندھے ٹکے اصول واقدار سے انحراف کرتے ہوئے جنسی بھوک، ذہنی پریشانیوں نفسیاتی الجھنوں کو شعور کے پردے میں اجاگر کیا۔انہوں نے سماجی لبادہ اوڑھے چہروں کو بے نقاب کیا اور ان کی گھناؤنی ذہنیت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں سجاد ظہیر کا افسانہ ''دالری'' اور احمد علی کا افسانہ ''بادل نہیں آتے'' پیش کیے جاسکتے ہیں۔رشید جہاں اردو کی حقیقت پسند اور انقلابی افسانہ نگار ہیں اور انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے جنسی مسائل کو بہت ہی تلخ اور طنزیہ لہجے میں بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کا افسانہ ''سودا'' قابل ذکر ہے جس میں ایک عورت سے تین تین مرد ایک ساتھ جنسی تلذذ حاصل کرتے ہیں، جن کی نظر میں عورت کی حیثیت صرف جنسی تسکین کا ذریعہ ہے۔اردو میں جنسی مسائل پر لکھنے والوں میں سب سے اہم نام سعادت حسن منٹو کا ہے منٹو نے اپنے افسانوں میں جنسیات کے متعلق لکھا ہے اور بہت عمدہ لکھا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ انسان کتنا خودغرض اور وحشی ہوتا ہے کہ اپنی جنسی ہوسنا کی کے لئے دنیا کی ہر شے بھول جاتا ہے، اسے سماج کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوتا ہے۔

حقیقت نگاری

ادب میں اشیاء، اشخاص اور واقعات کو کسی قسم کے تعصب، حیثیت، موضوعیت اور رومانیت سے آلودہ کیے بغیر دیانت وصداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش حقیقیت پسندی یا حقیقت نگاری کہلاتی ہے۔بطور حقیقت نگار پریم چند کی انفرادیت یہ کہ انہوں نے بجائے کسی ایک قوم، ذات، فرقہ، دھرم اور مذہب کے تمام انسانوں اور معاشرے سے جڑے ہر فرد اور تمام انسانوں کو درپیش مسائل اور سماجی برائیوں کی نشاندہی کی۔اردو ادب میں پریم چند کے علاوہ اور بھی کئی نام قابل ذکر ہیں جن کا حقیقت نگاری کے حوالے سے کردار اہمیت کا حامل ہے۔ان میں منٹو اور دیگر بھی کئی نام ہیں مگر منٹو کا نام حقیقت نگاری کے حوالے سے پریم چند کے بعد لیا جاسکتا ہے۔منٹو کے افسانوں میں بھی بہت سے ایسے کردار ملتے ہیں جو سماجی اور معاشی ناہمواریوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

اردو افسانے کے موضوعات میں خاصی وسعت ہے۔آج ہمارے افسانہ نگاروں کی

کہانیاں تقریباً زندگی کے تمام ہی پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ پھر وہ چاہے انسانی حیات کی حقیقتیں ہوں، ہماری ثقافت و اقدار کا زوال ہو، معاشی ناانصافیاں ہوں، روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی ہو، خوف و دہشت گردی کے ماحول کی تصویر کشی ہو، معاشرتی بے حسی ہو یا کہ انسانی سیاسی و سماجی زندگی کے تضادات ہوں۔ ہمارے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ان سب موضوعات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو افسانہ ابتدا سے اب تک اپنے فن، تکنیک، ہیئت، زبان کی سطح اور اسلوب کی بنیاد پر بہت سے تجربات سے گزر کر اپنے دامن میں خاصی وُسعت، گہری تہہ داری، تنوع، فکر کی گہرائی، نفسیاتی اور فلسفیانہ جہات پیدا کر چکا ہے۔ اب اردو افسانے میں موضوع، پلاٹ اور کرداروں کے ساتھ ساتھ تخیل و احساس کو بھی بھرپور جگہ مل چکی ہے۔ یہ اردو افسانہ ہی ہے کہ جس نے افسانوی ادب کو فنی و جمالیاتی اقدار سے روشناس کروا کر اسے تحقیقی سطح تک پہنچایا۔ افسانے کی ابتداء سے اب تک کے منظرنامے پر اگر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور افسانے کا تجرباتی دور ہے۔ یہ دور کہانیوں کے حوالے سے گزشتہ ادوار کی نسبت کہیں زیادہ زرخیز ہے اور ہمارے اُردو افسانے میں یہ دور ہمیشہ تابناک و درخشاں رہے گا۔ اردو افسانہ اپنے آغاز وارتقا سے لے کر اب تک مسلسل ترقی کی منازل طے کر رہا ہے افسانہ نگاروں نے اسلوبیاتی، ہیئتی اور تکنیکی اعتبار سے اردو افسانے میں کامیاب تجربات کیے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ایک معیاری افسانے کے لیے بنیادی اور لازمی عناصر میں سب سے اہم اس کا موضوع ہے، جس کی بنا پر افسانہ، افسانہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ہمارے اردگرد بہت سے واقعات موجود ہیں جنہیں افسانے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے افسانے کی کئی اقسام ہیں۔ نفسیاتی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، جنسی، مزاحمتی وغیرہ۔ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے اقعات دوسروں کو بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ بتانے، کہنے اور سننے کے عمل نے بالآخر کہانی کا روپ اختیار کر لیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ایک ترقی یافتہ کہانی وجود میں آ گئی زمانے کے ساتھ ساتھ موضوعات میں تنوع پیدا ہوتا گیا۔ اصلاحی، معاشی، معاشرتی، عشق و محبت اور زندگی سے جڑے ہوئے دوسرے موضوعات کہانیوں میں پیش کیے جانے لگے، جنہیں لوگ اب تک دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔

زمانہ قدیم سے لیے جبکہ افسانہ جدید دور کی تخلیق اور تحقیق ہے۔ اس طرح کہانی جاگیردارانہ اور افسانہ صنعتی دور کا عکاس ہے۔ افسانہ میں عموماً مکالمے، ڈرامے اور ناول کے برعکس

ضرورت کے وقت استعمال کیے جاتے ہیں۔ دوسری سب سے اہم بات یہ کہ ہر وہ موضوع جو زندگی سے قریب تر ہو، افسانے کا موضوع ہوسکتا ہے۔ کہانی افسانے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور جب کہانی کو فنی خوبیوں کا جامہ پہنا دیا جائے، تو یہ پلاٹ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کہانی کا دورانیہ جتنا بھی ہو اُسے افسانے کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے افسانے کی فنی خوبیوں اور لوازمات پر پورا اترنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کہانی ان لوازمات اور فنی خوبیوں پر پوری اترے، تو اسے اس وقت افسانہ کا نام دیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی کہانی ایک خاص ترتیب میں نہ ہو، پلاٹ اس میں نہ ہو، واقعات ایک دوسرے سے پیوست نہ ہوں، تو یہ افسانویت کے دائرے میں شمار نہیں ہوگی۔ کہانی افسانہ کے لیے ایک لازمی اور ضروری جز ہے۔ کہانی کے بغیر افسانے کا وجود ہی نہیں ہے۔ کہانی میں فکری عنصر پیدا کرنے کے لیے سب سے ضروری چیز موضوع ہے اور کہانی کے فن میں اتنی وسعت موجود ہے کہ تھوڑی سی محنت سے ایک واقعہ یا کردار افسانے کا موضوع بن سکتا ہے اور افسانہ نگار اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت اسے ایک اچھے افسانے کی شکل میں منتقل کر سکتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ افسانے کے لیے ایک ایسا موضوع درکار ہوتا ہے، جو زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو۔ افسانے کا موضوع زندگی کے چھوٹے بڑے واقعے پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ واقعہ سچائی پر مبنی ہو یا خیالی واقعہ ہو، لیکن اسے پیش کرنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے کہ سچائی اور حقیقت سے قریب تر ہو۔ کیوں کہ بعض اوقات افسانہ نگار کو اچانک ہی کوئی خیال کسی واقعہ کا کردار نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور وہ اس پر قلم اٹھا لیتا ہے لیکن اس کے لیے اسے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے اور اسے اپنے خیالات کو ایسے فنکارانہ طریقے پر پیش کرنا ہوتا ہے کہ اس سے ایک دل لبھانے والی کہانی بن جائے اور پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہ چھوڑے۔ اگر کوئی کہانی پڑھنے والے کے جذباتی اور ذہنی سرمایہ سے ہم آہنگی نہ رکھتی ہو، تو اسے افسانے کا مقام دینا سراسر ناانصافی ہے۔ افسانے کے لیے کہانی، موضوع کا انتخاب تب ہی ممکن ہے اور وہی افسانہ نگار اس معیار پر پورا اتر سکتے ہیں جن کا مشاہدہ وسیع ہو، وہ اپنے میدانِ علم کا بہتر شہسوار ہو اور جسے اپنے موضوع پر مکمل عبور حاصل ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ابوالخیر کشفی،سید،ادب اور قومی شعور،مشمولہ،پاکستانی ادب،جلد اول،مرتبین،رشید امجد،فاروق علی،ایف جی سرسید کالج،راولپنڈی،مئی 1981ء،ص:493
2۔قمر رئیس،ڈاکٹر،مضامین پریم چند(مرتبہ)،دہلی:علی پرنٹنگ پریس،1960،ص:176
3۔مولوی نیر الحسن نیر،نورالغات(جلد دوم) لاہور،سنگ میل پبلشرز،1959ء،ص:325
4۔Robison Quinn Afred a, knops New, York Third, Edition, 1958, p.958.
5۔Steinberg, S.H (Ed) Encyclopedia of Literature, 1953, vol1, p.504.
6۔وقار عظیم،افسانہ نگاری،آلہ آباد:سرسوتی پبلشنگ ہاؤس1930،ص:3
7۔محمد احسن ڈاکٹر،کرشن چندر اور مختصر افسانہ نگاری،نئی دہلی،موڈرن پبلشرز ہاؤس،1989ء،ص:3
8۔پروین اظہر،ڈاکٹر،اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید،علی گڑھ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،ص:12
9۔صغیرا افراہیم،پروفیسر،اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل،علی گڑھ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،طبع دوم،2009ء،ص:11
10۔طاہر طیب،ڈاکٹر،لاہور میں اردو افسانے کی روایت،فیصل آباد،مثال پبلشرز،2015ء،ص:104
11۔سبینہ اویس،ڈاکٹر،افسانہ شناسی،فیصل آباد،مثال پبلشرز،2015ء،ص:40
12۔عائشہ سلطانہ،ڈاکٹر،مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ(1947ء سے تا حال)،دہلی،ایجوکیشنل پبلشرز ہاؤس،ص:74
13۔فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات،اسلام آباد،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،2005ء،ص:365
14۔عائشہ سلطانہ،ڈاکٹر،مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ،ص:69
15۔محمد عالم خاں،ڈاکٹر،اردو افسانے میں رومانوی رجحانات،لاہور،علم وعرفان پبلشرز،1958ء،ص:88
16۔عارف ثاقب،ڈاکٹر،بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس،لاہور،کتاب نما،1999ء،ص:65
17۔شہزاد منظر،جدید اردو افسان(تنقید)،کراچی،منظر پبلشرز،1982ء،ص:48،49
18۔اسلم جمشید پوری،ڈاکٹر،اردو افسانہ تعبیر وتنقید،نئی دہلی،ماڈرن پبلشرز ہاؤس،2006ء،ص:59
19۔طاہر طیب،ڈاکٹر،لاہور میں اردو افسانے کی روایت،ص:360
20۔رشید امجد،ڈاکٹر،پاکستانی ادب(مرتبہ)،اسلام آباد،اکادمی ادبیات پاکستان،2009ء،ص:17

☆☆☆☆☆☆☆

غلام فرید کاٹھیا کے افسانے

(موضوعاتی مطالعہ)

سرزمین ساہیوال شروع ہی سے علم و ادب کے جگمگاتے ستاروں یعنی شاعروں، نثر نگاروں، سخن وروں، دانشوروں اور ادباء کا مرکز رہی ہے۔اس مٹی سے بہت سی نامور علمی و ادبی شخصیات نے جنم لیا۔ 60 کی دہائی میں ''کیفے ڈی روز'' دبستان ساہیوال والوں کے لیے ادبی سرگرمیوں کا ایک یادگار، اولین اور مرکزی ٹھکانہ تھا۔شاعروں، دانشوروں، نثر نگاروں اور ادیبوں کی رات دیر تک کی بیٹھکوں کے سبب کیفے کی شامیں پر رونق رہتیں۔مجید امجد، مراتب اختر، منیر نیازی، ظفر اقبال، مصطفیٰ زیدی و دیگر عظیم شاعروں اور دانشوروں کا ایک گروہ اپنے ادبی سفر کے لیے اسی دھرتی سے چلا اور بعد میں اردو ادب کے وقار کا باعث بنا۔ان شعراء و ادباء کے بعد 2000ء کی دہائی سے اب تک اس علمی سفر کو آگے بڑھانے والوں میں جہاں رزاق شاہد، لقمان شیدائی، ڈاکٹر کاظم بخاری، علی وارث انصاری، محمود علی محمود، سرفراز تبسم، غضنفر عباس سید، شہزاد انجم، مرتضی ساجد، جہانگیر قمر، اوصاف شیخ، مشتاق عادل، فاروق اظہر، امین رضا، ناز کفیل گیلانی، قمر شفیق، مطلوب حسین، عمران اسلم، سید علی ثانی، نعیم نقوی، مظفر حسین وڑائچ، زاہد حسین رانا، ملک مہر علی، ندیم عباس اشرف، پیر اظہر فرید، اسلم سحاب ہاشمی، بابر صغیر، سجاد نعیم، افتخار شفیع، شاہد رضوان، اختر خان، ریاض ہمدانی، علی اظہر خان، راحت جبیں، سعید خان، اورنگزیب، رانی آکاش، حنا جمشید، بیگم افتخار نذیر، اللہ یار ثاقب، نورین کیانی اور دیگر شعراء و ادباء کے نام قابل ذکر ہیں، وہیں اس صف میں ہمیں ایک جدید اور بہترین اسلوب کے مالک افسانہ نگار ''مہر غلام فرید کاٹھیا'' بھی نظر آتے ہیں۔غلام فرید کاٹھیا نے اردو ادب میں بڑا نام کمایا، بڑی محنت اور لگن سے ادب کے لیے خدمات سرانجام دیں اور اردو ادب کے قابل قدر اسلوب میں اضافہ کیا۔''ورثہ ساہیوال'' کے تحت ماضی میں ''کیفے ڈی روز'' سے منسلک شعراء اور ادباء کے کارناموں کو سراہنے کی روایت کا آغاز بھی غلام فرید کاٹھیا کے زیر سایہ ہوا۔پورے ملک سے بہترین محققین، معیاری کتب اور اعلی افسانوی ادب کو خاص ایوارڈز اور پوزیشنز نوازے جانے کی روایت کی ابتدا ہوئی۔شاعروں اور دانشوروں کے کلام، ان کے مقالہ جات، افسانوں اور مختلف تحریری کاوشوں کو اکٹھا کر کے ہر دو ماہ بعد ایک مجلّہ نکالنے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔اس کے علاوہ

مستحق مگر غریب دانشوروں اور شاعروں کی مالی معاونت کا انتظام بھی مہر غلام فرید کاٹھیا کی ادبی خدمات ہی کا نتیجہ ہے۔ اپنی قومی وصوبائی اسمبلی کی رکنیت اور مملکت برائے تعلیم پاکستان کی وزارت کے دوران مہر غلام فرید کاٹھیا نے علم کی ترویج کے لیے بہت سی خدمات سرانجام دیں۔ ''مہکاں ادبی مرکز'' اور ساہیوال کا ''مجید امجد پارک'' آپ کی خدمات ہی کا حصہ ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اردو ادب کے لئے بہت کام کیا۔ آپ کے تخلیقی سفر میں جو شاہکار ہمارے سامنے آئے وہ قابل قدر ہیں۔ جون 2008ء میں شائع ہونے والا آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''لمحوں کی قید'' ہے. جو 10 افسانوں اور 136 صفات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد آپ کا خوبصورت سفر نامہ ''سفر درپیش'' کے نام سے مئی 2010 میں منظر عام پر آیا، جو کہ 20 ابواب اور 164 صفحات پر مشتمل ہے۔

سفر نامے کے بعد آپ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''سرسوں کے پھول'' 2016 میں شائع ہوا، جو کہ 11 بہترین افسانوں پر محیط ہے۔ جبکہ آپ کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''سفید تتلیوں کا ہار'' ہے۔ جس میں کل 12 افسانے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں میں کسانوں، مزدوروں اور ہاریوں کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترقی پسند سوچ کے حامل اس افسانہ نگار کے افسانوں میں غربت کے مظاہر اجاگر کیے گئے ہیں۔

علم وادب سے محبت رکھنے والے مہر غلام فرید کاٹھیا کی پیدائش یکم مارچ 1939ء کو ہڑپہ جیسے تاریخی قصبے کے نواحی گاؤں ''مراد کے کاٹھیا'' میں ہوئی۔ مہر غلام فرید کی ابتدائی تربیت میں ان کے والد نور محمد کا بڑا کردار ہے۔ جو پیشے کے اعتبار سے کاشتکار تھے۔ نور محمد اصولی مگر سخت مزاج بندے تھے، اپنی اولاد کو کامیاب دیکھنے کے لیے وہ ان کو شیر کی آنکھ سے دیکھنے کا فارمولا رکھتے تھے۔ یہ ان کے والد کی تربیت اور محنت ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کی تمام تر مشکلات کو ہمت و جوانمردی سے برداشت کیا۔ مہر غلام فرید کاٹھیا نے اپنی پرائمری تعلیم 1952ء میں اپنے آبائی گاؤں مراد کے کاٹھیا سے مکمل کی۔ 1955 میں کمالیہ سے انہوں نے اپنی مڈل جبکہ 1957ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ ساہیوال کے گورنمنٹ کالج چلے گئے جہاں سے انہوں نے ایف اے اور بی اے کی تعلیم 1962 تک مکمل کی۔ اس کے بعد لاہور ایف۔ سی کالج چلے گئے اور 1964 میں ایم اے پولیٹیکل سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ پھر یہیں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت شروع کردی۔

مہر غلام فرید کاٹھیا نے اپنے دور طالب علمی میں بہت دشوار وقت دیکھا۔1970ء میں جب غلام فرید کاٹھیا کے والد محترم کا انتقال ہوا، تو ان کے برادران زراعت و دیگر شعبہ جات سے منسلک تھے، جبکہ آپ حصول علم میں مکمل طور پر مشغول رہے اور روشنی کی راہوں کے مسافر بنے رہے۔

مہر غلام فرید کاٹھیا نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے خاندان اور برادری میں ایک خاص مقام حاصل کیا، جو قابل فخر بات تھی۔ اگر مہر غلام فرید کاٹھیا کے دور طالب علمی پر نگاہ ڈالیں تو وہ ایک دشوار اور مشکل وقت تھا۔ آپ جب طالب علم تھے تب بھی اور والد محترم کے انتقال کے بعد بھی آپ نے اپنی ملازمت اور تعلیم کو ایک ساتھ جرأت، بہادری، اور عقلمندی سے نبھایا، اور اپنی تمام تر مشکلات کے باوجود زندگی کی منازل بخوبی طے کیں۔18 فروری 1979ء کو غلام فرید کاٹھیا کا نکاح اپنی برادری کی ایک بہت ہی سلجھی ہوئی خاتون سے طے پایا۔ ان کی زوجہ بہت وفادار، باہمت، اور بہادر خاتون تھیں۔ اپنی زندگی کی ساتھی کے حوالے سے آپکا کہنا تھا کہ:

> ''میری مرحومہ بیوی نے ہر طرح کے حالات میں میرا ساتھ نبھایا۔ میں جیل میں ہوتا تو میری خبر گیری کرتی، میں سیاسی مصروفیات کے سبب وقت نہ دے پاتا تو وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دیتیں۔ انہوں نے پوری طرح کوشش کی کہ میں گھریلو پریشانیوں سے آزاد ہو کر سیاست کروں۔ قید و بند کی صعوبتوں کے دوران بھی وہ گھبرائی نہیں بلکہ ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا۔''(1)

مہر غلام فرید کاٹھیا کی اولاد میں دو بیٹے محمد علی فرید، احسن فرید اور ایک بیٹی مدیحہ فرید شامل ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے محمد علی پیشے کے اعتبار سے وکالت کے شعبے سے وابستہ اور پاکستان پیپلز پارٹی لائیرز ونگ ساہیوال ڈویژن کے صدر بھی ہیں جبکہ آپ کے چھوٹے بیٹے احسن فرید ماسٹرز اور بیٹی مدیحہ فرید اسٹیٹ لائف کارپوریشن آف پاکستان میں آفیسر ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا کو سیاست سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ آپ نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والے بھٹو کی "پاکستان پیپلز پارٹی" کو 1972ء میں جوائن کیا۔ آپ نے اپنے علاقے کے غریبوں، مزدوروں، کسانوں، ہاریوں پسے ہوئے لوگوں کے مسائل اور اپنے علاقے کی ترقی کے لیے بہت کام کیا۔ غلام فرید کاٹھیا MNA اور MPA بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو یوسف رضا گیلانی کے دور میں وزیر مملکت برائے تعلیم کا منصب سنبھالنے کا بھی اعزاز حاصل رہا۔ اس دوران آپ نے تعلیم کے فروغ کے لئے بہت کام کیا۔ آپ پارٹی کے وفادار، کٹھن اور بھلے وقتوں کے ساتھی

رہے۔انہوں نے اپنی جوانی کے 30 سال پاکستان پیپلز پارٹی کی ضلعی صدارت کے نام کیے۔اب بھی وہ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر اورڈویژنل صدر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔انھوں نے اپنے اس تیس سالہ سفر کے دوران بہت سی تکالیف بھی سہیں۔ضیاء مارشل لاء کے دوران مہر غلام فرید کاٹھیا کو کئی بار قید و بند جیسی اذیتوں سے بھی گزرنا پڑا مگر وہ پھر بھی چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔اس سفر میں درپیش تکلیفوں کے بارے میں غلام فرید کا کہنا ہے:

> ''1977ء کے بعد کا دور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے لیے ایک امتحان تھا۔ہم تین ماہ جیل میں ہوتے تو چار ماہ آزاد اور چار ماہ آزاد ہوتے تو چھ ماہ جیل میں، یہ سلسلہ 1985ء تک چلتا رہا۔آمر نے پیپلز پارٹی کو ختم کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر ناکامی اس کا مقدر ہوئی۔میرے جیل کے متعلق لکھے گئے افسانے اسی دور کی یاد ہیں۔مجھے یاد ہے کہ فروری 1979ء میں میری شادی ہوئی اور اپریل میں میں تین ماہ کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔''(2)

مہر غلام فرید کاٹھیا کو زمانہ طالب علمی ہی سے ادب سے بہت لگاؤ تھا۔اپنے تخلیقاتی سفر کا آغاز تو آپ 1960-1970 میں ہی کر چکے تھے، تاہم آپ کا کام ادبی سطح پر بہت بعد میں چھپ کر تقریباً 2000ء میں ظاہر ہوا۔مہر غلام فرید کاٹھیا نے اپنے کیریئر کا آغاز شاعری سے کیا، مگر جلد ہی آپ کو احساس ہوا کہ آپ تو افسانہ نگار کے طور پر تخلیق کیے گئے ہیں، یوں آپ نے فکشن میں طبع آزمائی شروع کی اور بہترین افسانہ نگار کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔اپنے ادبی سفر کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

> ''مجھے سکول کے زمانے سے ہی لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔میں کبھی نثر میں لکھتا تو کبھی شاعری کی کوشش کرتا۔1976ء میں جب میں ممبر پنجاب اسمبلی تھا تو میری ملاقات اقبال صلاح الدین سے ہوئی۔میں نے انہیں اپنی چند غزلیں اور کچھ نثری کاوشیں دکھائیں۔مسودہ دیکھنے کے بعد علامہ صلاح الدین کہنے لگے کہ قدرت نے آپ کو فکشن نگار بنایا ہے شاعر نہیں۔وہ دن اور آج کا دن میں نے شاعری ترک کر دی اور تمام تر توجہ فکشن کو دینے لگا۔''(3)

غلام فرید کاٹھیا کے افسانوی موضوعات میں، غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور ہاریوں کی

زندگی کے مسائل اور مشکلات کا ذکر ملتا ہے۔انہوں نے غربت کی چکی میں پسنے والے کمزوروں کی زندگی کے دردوغم ،انکے جنسی وذاتی استحصال اور یونیورسٹی لائف وغیرہ کواپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ آپ کی تخلیقات اپنے دور کے لوگوں کی عکاسی کرتی ہیں اور یہی ایک بہترین ادیب کی خاصیت و خوبی ہے۔مہر غلام فرید کاٹھیا کی تخلیقات میں ''لمحوں کی قید''،''سرسوں کے پھول''،اور''سفید تتلیوں کا ہار'' تین افسانوی مجموعے اور''سفر در پیش'' نامی ایک سفرنامہ شامل ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کا پہلا افسانوی مجموعہ''لمحوں کی قید'' گنجی بار پبلشرز ساہیوال سے 2008ء میں شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے کے کل 136 صفحات ہیں۔کمزور طبقے کے غریبوں اور بے چاروں کی مشکلات اور جیل کی کہانیوں کوغلام فرید کاٹھیانے اس مجموعے کا موضوع بنایا۔

''لمحوں کی قید'' کے بعد''گنجی بار پبلشرز ساہیوال'' سے 2010 میں آپ کا ایک سفرنامہ ''سفر در پیش'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔170 صفحات پر مشتمل مہر غلام فرید کاٹھیا کا یہ سفرنامہ ان کے سیاسی سفرلندن کی روداد ہے۔20 عنوانات پر محیط اس سفرنامے کی زبان سلیس اور اسلوب بڑا دلچسپ ہے۔پڑھنے والا خود کولندن کی گلیوں اور اس کی خوبصورتی میں کھویا ہوا پاتا ہے۔غلام فرید کاٹھیا کا یہ سفرنامہ اردوسفرنامے کی سرزمین میں ایک عمدہ اضافہ اور مصنف کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''سرسوں کے پھول'' غلام فرید کاٹھیا کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں کل 12 افسانے شامل ہیں۔اس مجموعہ کے افسانے دور جدید کے فرعونیت زدہ رویوں،غریبوں کے استحصال اور ان کی سماجی زندگی کی مشکلات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔''سفید تتلیوں کا ہار'' غلام فرید کاٹھیا کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔2021ء میں شائع ہونے والا آپ کا یہ مجموعہ 10 شاندار افسانوی کہانیوں کواپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔غلام فرید کاٹھیا نے کمزوروں کے جذبات واحساسات، اور غربت ومہنگائی کے سبب سامراجی قوتوں کے ذریعے ان کے استحصال کو بڑے ہی پر درد انداز میں بیان کیا ہے۔مہر غلام فرید کاٹھیا بلاشبہ نچلے طبقے کے ترجمان،بہترین تخلیق کار،عمدہ فکشن نگار،اور ایک منجھے ہوئے بہترین سیاست دان ہیں۔

مزدوروں کی ترجمانی

انسان کو دنیا میں خدا کی عبادت کے لیے بھیجا گیا۔رب تعالیٰ نے انسانوں کی بہترین پہچان اور تفریق کے لیے انہیں مختلف گروہوں،قبیلوں اور نسلوں میں بانٹ دیا۔جس طرح مختلف قبیلے،گروہ اور خاندان بنائے گے بالکل اسی طرح دولت کو بھی مختلف درجوں کے حساب سے بانٹا گیا۔

جہاں امیری، غریبی جیسے درجوں میں لوگوں کو تقسیم کیا گیا، وہیں دولت کی منصفانہ تقسیم اور روپے پیسے کی گردش کے لیے صدقہ اور زکوٰۃ بھی فرض کیے گئے۔ اپنے غریب بہن بھائیوں کے ساتھ ہمدردی، رحم دلی، ایثار کا رویہ اپنانے، انکی مدد کرنے، انکو ان کا پورا پورا حق دینے اور ان کے ساتھ بہترین سلوک کرنے کا درس دیا گیا۔

تاریخ انسانی شاہد ہے کہ امیر طبقے نے ازل ہی سے غرباء سے ظلم و جبر کا سلوک روا رکھا ہے۔ اپنے ذاتی مفاد کے لیے جائز ناجائز کی پروا کیے بغیر غریبوں سے ان کے حقوق چھینے ہیں۔ کم معاوضے کے عوض دگنی مشقت کروائی گئی، انکی عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ بچوں کو تعلیم سے محروم رکھا۔ غرض شاید ہی کوئی ایسا ظلم ہو جو ان غریبوں پر روا نہ رکھا گیا ہو۔ یہ سلسلہ تقریباً ازل سے اب تک جاری ہے۔ غریبوں پر ڈھائے جانے والے ان مظالم کے خلاف کوئی بھی آواز بلند نہیں کرتا۔ حکومتی سطحوں پر ان کمزوروں کی کے لیے بڑے بڑے فنڈز کا اعلان تو کیا جاتا ہے، مگر بیچارے غریب اور مزدور تک کوئی ریلیف یا سبسڈی نہیں پہنچ پاتی۔ اس سب پر ایک ظلم یہ کہ خود بچارے غریب کو بھی اپنے حق کے لیے آواز بلند ہی نہیں کرنے دی جاتی۔ اگر وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف بات بھی کرے تو جبر و تشدد کے ذریعے سے اس کی آواز ہی کو دبا کر اسے خاموش کروا دیا دیا جاتا ہے۔ یوں غریب برسوں غربت کی چکی میں ہی پستا رہتا ہے۔

اردو ادب میں بہت سے ادباء اور شعراء کرام نے کمزوروں پر ہونے والے مظالم کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ کارل مارکس کے نظریہ مارکسزم اور ترقی پسندیت سوچ کے حامل افسانہ نگاروں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے آواز بلند کی۔ کارل مارکس کے نظریے کے حامیوں نے مزدوروں پر ہونے والے مظالم، ان کو کم اجرت دیئے جانے اور سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ جبکہ ترقی پسند تحریک سے منسلک ادیبوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے پسے ہوئے طبقے کی مشکلات کی عکاسی کی۔ ترقی پسند سوچ کے تحت پریم چند، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، اختر حسین رائے پوری، عصمت چغتائی وغیرہ نے غریبوں کے لئے قلمی جہاد کیا اور آوازِ حق بلند کی، آج اسی کی ایک کڑی مہر غلام فرید کاٹھیا کی صورت ہمارے سامنے موجود ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں غریبوں، کسانوں، ہاریوں، اور پسے ہوئے نچلے طبقے کے لوگوں کے مسائل اور مشکلات کی بہترین انداز سے تصویر کشی کی ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں مزدوروں کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ آپ کا افسانہ ''دیوانے لوگ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ''عابو''

ہے، جس سے تھوڑی سی اجرت کے عوض بہت زیادہ مشقت کروائی جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں آجکل بہت سارے عابو پائے جاتے ہیں، جن سے سرمایہ داران کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوگنی مشقت کرواتے ہیں۔ سماج کے مزدوروں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ روزگار کے عدم تحفظ کا ہے۔ جس کے باعث بیچارے مزدور اپنے ٹھیکیداروں اور مالکوں کے آگے زبان نہیں کھولتے، مالک تھوڑی بہت جتنی بھی اجرت دے بیچارے مزدور کو چپ چاپ اسے لینا ہی پڑتا ہے، کیونکہ اسے اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ اگر اس نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی تو اسے کام سے نکال دیا جائے گا، اور دوسری جگہ جلد مزدوری ملنا بہت مشکل ہوگا۔ یوں گھر کی ضرورتوں اور فاقوں کے ڈر سے اسے مجبوراً کم معاوضے پر مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ ٹھیکیدار اور مالک مزدوروں کی انہی مجبوریوں سے فائدے اٹھا کر انہیں بلیک میل کرتے ہیں۔ یہ ٹھیکیدار کسی بھی قدرتی آفت، کسی قریبی کی وفات، مجبوری، یا بیماری کی وجہ سے مزدوروں کو چھٹی کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر وہ کام پر دیر سے پہنچیں یا غیر حاضر ہوں تو ان کی تنخواہ سے کٹوتی کی جاتی ہے۔ سب کے سامنے بے عزت کیا جاتا ہے، اور کام سے فارغ کرنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔

آجکل مہنگائی کے اس دور میں بیچارے غریب مزدور کے لیے تو عزت سے دو وقت کی روزی روٹی کمانا مشکل ہوگیا ہے۔ گھر کے خرچوں، بجلی کے بلوں، بچوں کے فیسوں اور قرضوں کے بوجھ تلے دبے غریب کے لیے بیماری کی صورت میں علاج معالجہ ایک طرح سے ناممکن ہوگیا ہے۔ کم تنخواہ میں اس کے پاس صرف اتنے ہی پیسے ہوتے ہیں کہ وہ بمشکل گھر کی دال روٹی چلا سکے، برے وقت کے لیے پیسے بچا کر رکھنا اس کے لئے ناممکن سی بات ہےکیوں کہ وہ بیماری کی صورت میں ہسپتالوں کے خرچے، ٹیسٹوں اور ڈاکٹروں کی فیس دینے کی طاقت نہیں رکھتا، یوں وہ کینسر، ہیپاٹائٹس، ٹی بی، تپ دق اور دمہ، جیسی بڑی اور خطرناک بیماریوں کا علاج کروانے سے قاصر ہوتا ہے۔ اور اگر ان موذی بیماریوں کا تدارک وقت پر نہ کیا جائے تو یہ اندر ہی اندر ناسور کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور آخر کار انسان بیماری کے سبب موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ لیکن بیچارے غریب مزدور کے پاس اس جیسی مہلک بیماریوں کے علاج کے لیے اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ کسی اچھے یا پرائیویٹ ہسپتال سے بیماری کے خاتمے تک علاج کرواسکیں۔ چنانچہ ان کو ان عام دیہاتوں نیم عطائیوں کی دوا پر گزارا کرنا پڑتا ہے، جس سے وقتی طور پر تو راحت ملتی ہے مگر اس بیماری کا جڑ سے خاتمہ نہیں ہوتا اور غریب بالآخر موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''دیوانے لوگ'' بھی ایک ایسی دردناک کہانی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، افسانے کا مرکزی کردار عابو اپنے گھر کا واحد کمانے والا ہے۔اس کی ایک سالہ معصوم بیٹی کو دینے کے لیے دودھ، اور بیمار بیوی کو بلا ناغہ دوا کی اشد ضرورت ہے۔اگر اس کی بیوی کی ایک بھی دن کی دوا چھوٹ گئی تو اس کی طبیعت بگڑ جائے گی۔

عابو کے معاشی حالات بہت خراب ہیں۔ بیمار بیوی، اور ننھی بچی کی دوا اور خوراک کے اخراجات نہ ہونے جیسی تکلیف دہ صورتحال میں اگر اس کی ایک دیہاڑی بھی چھوٹ گئی تو اس کے خاندان پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔اس کی چھوٹی بیٹی بھوک سے بلک بلک کر، جبکہ اس کی بیوی دوائی کے بنا سسک سسک اپنی جان کی بازی ہار جائے گی۔عابو بیچارہ انہی خوف و خدشات کے باعث ٹھیکیدار کی جلی کٹی سننے اور تھوری اجرت پر زائد مزدوری کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔وہ اپنے اوپر ہونے والے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے سے بھی کتراتا ہے کیوں کے ایسے کسی بھی عمل کے بعد اسے اپنے رزق حلال اور اس مزدوری سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

> ''عابو اپنے حساب کے دس روپے لیتے وقت ڈر رہا تھا۔اس کے سامنے اس کی بیمار بیوی اور ایک سالہ معصوم بچی کے چہرے گھوم گئے۔ یہ دس روپے کب تک چلیں گے۔ بچہ دودھ پیتا ہے، اس کی ماں بیمار ہے، اس کی دوائی روزانہ آتی ہے۔عابو یہ سوچ کر ہی کانپ گیا کہ اگر اگر کہیں دیہاڑی نہ ملی، اگر اس کی ایک دیہاڑی بھی چھوٹ گئی تو کیا ہوگا۔اس کی بیوی بیماری سے مرجائے گی اور بچی بھوکی''(4)

مزدور طبقہ معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہوتا ہے۔یہ طبقہ ملکی وقار میں خوشحالی اور ترقی کا سبب ہوتا ہے، مگر حکومتی سطح پر سب سے زیادہ اسی طبقے کو نظر انداز کیا جاتا ہے، ان کے حقوق کا خیال نہیں کیا جاتا۔انہیں کمزور اور کمتر تصور کیا جاتا ہے۔سماجی و معاشی لحاظ سے اس طبقے کی زندگی نہایت مشکلات اور مسائل کے بوجھ تلے دب کر رہ چکی ہے۔سارا سال محنت و مشقت کرنے والا یہ طبقہ معاشی اعتبار سے اس قدر پسماندہ ہوتا ہے کہ فصل کی کٹائی کے موسم میں اپنے کھانے کے لیے آناج، گندم اور چاول تک نہیں خرید پاتا، اس لیے یہ مزدور طبقہ شدید گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں اپنے سال بھر کے اناج کی خاطر بڑے نوابوں، سرداروں اور چوہدریوں کی زمینوں پر فصل کی کٹائی کا کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔اس سب کے بدلے انھیں فصل کا کچھ حصہ دیا جاتا ہے۔یوں ان غریبوں کی روٹی مشکل سے پوری ہو پاتی ہے۔

گندم کی بوائی سے کٹائی تک کا عمل جہاں کسانوں کی خوشی کا باعث ہوتا ہے وہیں گاؤں کے دیگر پسماندہ طبقوں مثلاً لوہاروں، نائیوں، ترکھانوں، موچیوں، چوکیداروں، اور مزدوروں کی مسرت کی وجہ ہوتا ہے کیونکہ اسی مہینے وہ اپنے گھر والوں کے لیے سال بھر کی گندم اکٹھی کرتے ہیں۔ کام کے سلسلے میں دوسرے شہروں کا رخ کرنے والے مزدور بھی ان دنوں میں گاؤں لوٹ آتے ہیں، ہر کسی کا چہرہ خوشی کے باعث کھلا ہوتا ہے، فصل کی کٹائی سے قبل جشن کا سماں ہوتا ہے، ہر کوئی پر عزم اور پر جوش ہوتا ہے۔

مزدور طبقے کو ان دنوں کا شدت سے انتظار ہوتا ہے، کیونکہ یہاں نہ اس کی دیہاڑی ضائع جاتی ہے اور نہ ہی کوئی ان کا حق چھینتا ہے۔ انہیں اپنی محنت و مشقت کا پورا صلہ ایک ایکڑ کے بدلے 3 من گندم کی صورت ادا کر دیا جاتا ہے۔ مزدور اپنے خاندان بچوں اور خواتین سمیت کھیتوں میں جتنی زیادہ مشقت کرتے ہیں انہیں معاوضہ بھی اتنا ہی زیادہ دیا جاتا ہے۔

''چالیس من گندم'' افسانے میں غلام فرید کاٹھیا نے بکو کی مشقت، اسکی کام سے وفاداری اور محنت کو سراہا ہے۔ اور بتایا ہے کہ بکو کس طرح اپنے گھرانے کی خوراک کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کوشش کرتا ہے۔

> ''چلچلاتی دھوپ میں وہ سال بھر کی روٹیاں جمع کرنے میں لگے تھے اور روٹیاں جمع کرنے کا یہی ایک وقت ہوتا ہے۔ جتنی گندم کاٹ لو اتنی روٹیاں جمع کر لو۔ آگے پیچھے سال بھر گاؤں میں بے کار کسی بڑے ڈیرے پر حقہ دھر کر روٹی کھا لو اور ڈھور ڈنگروں کو چرا پھرا کر پلا نہلا کر تن ڈھانپنے کے لیے چند پھٹے پرانے کپڑے لیے اور بس'' (5)

عورت خدا کی خوبصورت مخلوق ہے۔ یہ دکھ سکھ میں مرد کی ساتھی اور زندگی کی غمگسار ہوتی ہے۔ یہ گھر بار کو سنبھالتی اور بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ جبکہ مرد باہر کے کام کاج اور روزگار کی ذمہ داریوں کو دیکھتا ہے۔ یوں عزت و بھرم سے روکھی سوکھی کھا کر یا جیسے بھی زندگی کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا کہ فقط مرد ہی باہر جا کر کمائے اور عورت گھر کی ذمہ داریاں سنبھالے بلکہ پاکستان کے بہت سے پسماندہ علاقوں میں غریب طبقے کی عورتیں بھی گھریلو حالات سے تنگ، معاشی پریشانیوں کی وجہ سے مرد کے ساتھ باہر نکل کر کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں، کیوں کہ مہنگائی کے اس دور میں صرف ان کے مردوں کی تھوڑی سی تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ عورت کی خوشحالی اور بہتر روزگار کے بارے میں بہت سے منصوبے تو بنائے جاتے ہیں تاہم ان پر عمل

نہیں کیا جاتا۔شہر ہو یا دیہات، عورت کی عزت و آبرو کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں دیہاتوں میں نچلے اور متوسط طبقے کی عورتیں اکثر بہت محنتی اور اپنے مردوں کی وفا شعار ہوتی ہیں۔وہ بڑی ایمانداری سے گھر کے کام کاج بھی سرانجام دیتی ہیں اور معاشی حالات سے تنگ آکر، گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنے خاوند کے ہمراہ باہر کی ذمہ داریوں کا بھی بوجھ اٹھاتی نظر آتی ہیں۔

دیہی علاقوں کی خواتین کو جہاں تعلیم، روزگار، صحت جیسے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہیں دیہات کی عورتوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ جنسی استحصال کا بھی ہے۔گاؤں کے بااثر چودھریوں، زمینداروں، وڈیروں، اور ان کے پالتو ملازموں کے ہاتھوں عورتوں کی عصمت دری اب معمولی سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ یہ چوہدری اور وڈیرے نچلے طبقے کی خواتین کے تقدس کا خیال نہیں رکھتے۔ان کی نگاہ میں پسے ہوئے طبقے کے مزدوروں کی ماں، بہن، بہو، بیٹی اور عورتوں کی کوئی عزت و آبرو نہیں ہوتی۔ یہ سب عورتیں ان کے لیے فقط جسمانی لذت کا کوئی کھلونا، یا ٹیشو پیپر کی طرح ہوتی ہیں۔وہ انہیں اپنی ہوس اور درندگی کا شکار بنانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

مزدور طبقے کی ستم زدہ عورتیں اس مہنگائی کے دور میں اپنے بال بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اگر باہر کا رخ کرتی ہیں تو ان کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے، مردوں کی ہوس بھری نگاہوں کے نشتر اور چبتے ہوئے تلخ و تیز جملے ان کا استقبال کرتے ہیں۔انہیں گرمی، شدید دھوپ اور دوسری مشکلات کے ساتھ ساتھ اپنی عفت کو بھی داؤ لگانا پڑتا ہے۔

مہر غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے ''ٹھنڈے ہونٹ'' میں صغریٰ کے کردار کے ذریعے غریب مزدور عورتوں، اور بیواؤں کے مسائل کو ابھارا ہے, اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ ہوس کے پجاری خواتین کو اپنی ناپاک خواہشات اور درندگی کا نشانہ بناتے ہیں۔

صغریٰ جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے، اک شدید دھوپ بھری دوپہر میں اپنے شوہر ''عنایتے'' کے ہمراہ گندم کے کھیتوں میں چھٹائی کرنے میں مصروف تھی، ہوا گرم اور جسم کو جلسانے والی تھی۔تھریشنگ سے اڑتا ہوا بھوسہ ماحول کو آلودہ کر رہا تھا۔ ٹی بی، دمہ اور سانس جیسی بیماریوں کے مریضوں کے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔صغریٰ بھی سانس کے عارضے میں مبتلا تھی۔ اس کی سانس چلنا رک گئی۔تمام مزدور فکرمندی کے عالم میں دائرے کی صورت جمع ہو چکے تھے۔ چوہدری نے جب دیکھا کہ کام رک گیا ہے، تو وہ غصے کے عالم میں ان کے پاس آیا تاکہ ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے لوگوں کو منتشر کر کے دوبارہ کام شروع کروا سکے، مگر جب اس کی نظر چارپائی پر لیٹی

حسین صغریٰ پر پڑی تو اسکا سب رویہ ہی بدل گیا۔ چوہدری کی خاموشی کے پیچھے چھپی خباثت ملاحظہ ہو:

''دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اپنا کام شروع کر دو مگر ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ چوہدری نے چارپائی پر پڑی صغریٰ کو دیکھا تو دم بخود رہ گیا۔ غصہ کہاں اس کے دماغ پر اوس پڑ گئی۔ وہ کبھی عنایت کی طرف دیکھتا تو کبھی صغریٰ کی طرف۔ صغریٰ کی زبان گنگ تھی اور نظر پریشان حال تھی۔ کیا اس نے کوئی گدڑی میں ہیرا دیکھ لیا تھا یا جنت سے گری ہوئی کوئی حور جو زمین پر پریشان حال تھی۔'' (6)

آج ہمارے ملک میں رشوت جیسی لعنت کا کاروبار بہت عام ہو چکا ہے۔ طاقتور آدمی سے لے کر چھوٹے اور معمولی ملازم تک ہر کوئی رشوت کے دھندے میں مصروف نظر آتا ہے۔ معاشرے سے عدل وانصاف ناپید ہو چکا ہے، لوگوں سے ان کا جائز حق چھینا جا رہا ہے۔ ہر سُو رشوت کا بازار گرم ہے۔ رشوت دینا اور لینا بالکل عام سی بات بن کر رہ گئی ہے کیونکہ لوگوں کے خیال میں اس کے ذریعے کام جلد اور آسانی سے ہو جاتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''دیوانے لوگ'' مزدور طبقے کے استحصال اور امراء کے ذریعے غریبوں پر ہونے والے مظالم کی داستان بیان کرتا ہے۔ عابو نامی غریب مزدور گاؤں کے چوہدری اور وڈیرے کے جھوٹے مقدمے کا نشانہ بن کر جیل کی سلاخوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ یہاں جیل کی تنگ سی کوٹھری میں اس کے شب و روز بڑی مصیبت اور تنہائی کے عالم میں گزرتے ہیں، مگر یہاں اچانک عابو کی ملاقات جانو نامی ملزم سے ہوتی ہے، جسے بالکل عابو کی طرح برسوں قبل جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر جیل میں پھنکوا دیا گیا تھا۔ ایک روز جانو بہت بیمار ہوتا ہے، بخار اور دوانہ ہونے کے سبب اس کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ اسے ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے مگر جیل وارڈن قطعاً اس کی اجازت نہیں دیتا۔ عابو اپنی بات منوانے کی غرض سے ہیڈ وارڈن کو کچھ رشوت کی پیشکش کرتا ہے۔ عابو تو فقط اک مزدور تھا، مگر اس کے پاس رشوت دینے کے لیے اتنی رقم تو نہیں تھی، جو کہ وہ ہیڈ وارڈن کو دے کر مطمئن کر سکتا۔ ہاں مگر اس کے پاس پوٹلی میں تھوڑے سے سگریٹ اور ایک دس روپے کا نوٹ تھا۔ وارڈن عابو کو ہسپتال جانے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ اسے سرزنش کے طور پر مزید سزا سنانے کی دھمکی دیتا ہے، جس کے ڈر سے عابو ہیڈ وارڈن سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہے اور اسے بدلے میں کچھ رشوت دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ ہیڈ وارن جو پہلے عابو کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہو رہا تھا، پوٹلی کی لالچ میں اطمینان میں آ جاتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے کے ذریعہ سے پولیس کے مقدس پیشے میں خیانت اور اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرنے والوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ یہ بتاتا ہے کہ کس طرح پولیس کی وردی میں کالی بھیڑیں مظلوم عوام کو لوٹتی ہیں، اور ملزم کو مجرم اور مجرم کو لمحوں میں ملزم بنا دیتی ہیں۔ غریب مزدوروں کی حق حلال کی کمائی کھانے والے ان مگرمچھوں کے خلاف بھی کاروائی ہونی چاہیے تاکہ رشوت جیسی لعنت کا کاروبار بند ہو سکے۔ ہیڈ وارڈن کے لالچ کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''ہیڈ وارڈن نے ہاتھ بڑھا کر پوٹلی لے لی اور ہاتھ سے دبا کر پوٹلی کے اندر کے مال کا اندازہ کرنیکی کوشش کرنے لگا۔ عابو نے کہا ''حضور اس میں دس کا نوٹ اور پانچ سگریٹ ہیں''۔ ''ہوں'' ہیڈ وارڈن جیسے مطمئن سا ہو گیا ہو۔ یہ لو چابیاں کل تمہاری پیشی نہیں کروں گا۔ بڈھے کو کل ہسپتال لے جانا۔''(7)

ہمارے ملک پاکستان میں مہنگائی کے سبب غریبوں اور مزدوروں کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ دیہاڑی دار بیچارہ اپنے خاندان کی روزی روٹی جیسی ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف کارخانوں، بھٹوں، فیکٹریوں، یا پھر ٹھیکیداروں کے ہاں مشقت و مزدوری کر کے اپنے گھر کا نظام چلاتا ہے۔ ان لوگوں کے مالی حالات کچھ خاص اچھے نہیں ہوتے۔ کم اجرت میں زائد مزدوری کرنا ان لوگوں کی مجبوری ہوتی ہے کیونکہ ان کے پاس جلد اور کوئی دوسرا، ذریعہ آمدن نہیں ہوتا۔ حکومتی سطح پر ان غریبوں اور مزدوروں کو مراعات اور سہولیات دینے دعوے تو کیے جاتے ہیں۔ ہر بجٹ میں غریبوں کے لیے رکھی گئی اسکیموں اور پالیسیوں کی تشہیر کے لیے اربوں روپے مختلف چینلوں، اخباروں اور اشتہاروں پر توضائع کیے جاتے ہیں۔ تاہم غریبوں کے لئے جمع شدہ فنڈز کی رسائی ان تک کبھی بھی ممکن نہیں ہو پاتی، اور یوں غریب بے چارے اپنے جائز حقوق کے لیے بھی ترستے رہتے ہیں۔

مہر غلام فرید کاٹھیا کے افسانے غربت کی چکی میں پسنے والے مزدوروں کی زندگی، ان پر ہونے والے مظالم، بے روزگاری، عورت کی سماجی مشکلات، جنسی درندگی، اور پسماندہ طبقے کے مسائل کی بڑے بہترین انداز سے عکاسی کرتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں سے پتہ چلتا ہے کہ دولت مند اور سرمایہ دار کس طرح اپنے مذموم مقاصد کے تحت غریبوں کی مجبوریوں، اور ان کی معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں چند پیسوں کے لالچ میں ان غریبوں کو سنہرے خواب دکھا کر بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ یہ بیچارے غریب ان شاطر اور مکار لوگوں کے عزائم اور حربوں سے واقف

نہیں ہوتے۔سادہ لوح لوگوں کی کم فہمی اور جہالت کے بدلے ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے، ان لوگوں سے غیر آئینی کام کاج حتٰی کہ قتل تک کروائے جاتے ہیں۔انہیں تھوڑی سی آسائشیں دے کر مختلف جرائم میں پھنسایا جاتا ہے۔امیر طبقہ ہمیشہ غریبوں کی مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ سمیٹتے ہیں۔اپنے آپ کو پس پردہ رکھ کر بیچارے غریب مزدوروں کو لڑائی کے ذریعے ایک دوسرے کا دشمن بنایا جاتا ہے۔ان کی زندگیوں سے بری طرح کھیلا جاتا ہے۔اگر کوئی ملازم اپنے ہدف کو نہ پا سکے،اور پولیس یا دوسرے ذرائع سے اس کی شناخت یا پکڑے جانے کا خوف ہو،تو یہ مالک حضرات اس ڈر سے کہ کہیں یہ بندہ اپنی زبان ہی نہ کھول بیٹھے اور میرا نام آئے،اس کا صفایا ہی کر دیتے ہیں۔آج کل ہمارے معاشرے میں یہ وڈیرے، چودھری،اور امراء ان غریبوں کی مجبوریوں کے بدلے ان کے ضمیروں کا سودا کرتے ہیں۔غلام فرید کاٹھیا نے غریبوں اور مزدوروں کی مجبوریوں کو خریدے جانے کی ایک ایسی ہی کہانی اپنے افسانے میں بیان کی ہے۔اور بتایا ہے کہ کس طرح خود پس پردہ رہ کر، ٹھیکیدار دو مزدروں کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرتا ہے۔اسے غریبوں کی جان کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔عابد جب ٹھیکیدار کے حکم پر صاحب ٹائپ آدمی پر وار کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، یہ منظر دیکھ کر ڈرائیور اور اسکا ساتھی ڈر کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈرائیور بھاگ جاتا ہے تاہم اس کا ساتھی گر جاتا ہے۔واقعہ پر موجود واحد گواہ یعنی چوکیدار اس ساری صورتحال کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔بجائے اس کے کہ وہ اپنا فرض ادا کرتا اور ان لوگوں کے خلاف مقابلہ کرتا، وہ خوف کے عالم میں کہ کہیں وہ بھی نہ مارا جائے، گھبرا کر زمین پر گر پڑتا ہے۔وہ صاحب ٹائپ آدمی کی لاش دیکھ کر بہت سہم جاتا اور پھاٹک کے پاس گرا کانپنے لگتا ہے۔عابد اپنے ساتھی کو سہارا دیتے ہوئے جب پھاٹک کے قریب آتا ہے تو گرے ہوئے چوکیدار کو ہاتھ سے پھاٹک کھولنے کا حکم صادر کرتا ہے، جسے وہ چپ چاپ مان لیتا ہے،افسانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غریب آدمی کو اپنی جان اپنے فرائض سے زیادہ پیاری ہوتی ہے، وہ خوف کے مارے ظالم کے ظلم سے سہم کر جان کی امان مانگتے ہوئے پھاٹک کا دروازہ کھولنے پر مجبور ہو جاتا ہے :

> ''وہ صاحب ٹائپ آدمی کی لاش دیکھ کر بہت زیادہ خوف زدہ ہو چکا تھا وہ پھاٹک کے پاس سے اٹھ کر عابد کے قدموں میں آ گرا اور منت سماجت کرنے لگا میں ایک غریب ادمی ہوں میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مجھے معاف کردو۔ بھائی مجھے کچھ نہ کہنا میں بھی تمہاری طرح کا ایک مزدور ہوں مجھے معاف کر دو۔''(8)

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں دیہات کے پسے ہوئے اور کمزور طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ان کے اکثر افسانے گاؤں کے معاشرتی حالات،لوگوں کے رہن سہن،غریبوں کی غربت،وڈیروں،زمینداروں،نمبرداروں اور چودھریوں کے غریبوں پر مظالم، پولیس کا ظلم وستم، پنچایتوں کے نظام، زمیندار کے مسائل،دیہاتی لوگوں کی سادگی، اور مجبوروں کی مجبوریوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے ہیں۔غلام فرید کے بیشتر افسانے حقیقت نگاری کا عکس دکھائی دیتے ہیں۔

''سونے کی چوری'' محنت کش لوہار عبدالکریم کی کہانی ہے۔عبدالکریم اپنے کام کا ماہر ہوتا ہے،اس کے بنائے ہوئے اوزار،زرعی آلات،کسی،کھرپے،پھالے،درانتیاں،اور دیگر گھر کے استعمال کی چیزیں دیہات بھر میں مشہور تھی۔عبدالکریم چاک و چوبند،اور لمبے،اونچے قد کا توانا وخوبرو نوجوان تھا۔اس کی ایمانداری اور کام سے لگن دیہات بھر میں مشہور تھی۔سہاوے کے ملک محمد دین کو اپنے گھریلو استعمال کی چیزوں کے علاوہ کھیتوں کے لئے بھی آلات کی ضرورت پڑتی رہتی تھی،جنہیں وہ صرف عبدالکریم ہی سے بنواتا۔

عبدالکریم اس کا کام ہمیشہ بڑی محنت اور لگن سے کرتا۔یہی وجہ تھی کہ ملک محمد دین نے اس کی ایمانداری سے متاثر ہو کر اسے بیٹوں کی طرح چاہنا شروع کر دیا۔کبھی کبھار تو ملک محمد دین اسے اپنے گھر بھی بلوا لیتا اور گھر ہی میں کھیتوں کے لیے زرعی آلات کی تیاری بھی کرواتا۔ملک محمد دین کی صاحبزادی رحمتے اس چاک وچوبند اور توانا نوجوان عبدالکریم کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے،مگر عبدالکریم نگاہیں جھکائے، ہمیشہ دل سے اسکا اس کی عزت کرتا ہے۔عبدالکریم تھا تو ایک مزدور ہی۔ وہ اپنی حیثیت اور مرتبے سے اچھی طرح واقف تھا،اسی لئے وہ خود کو ان باتوں سے پرے رکھنا چاہتا تھا۔رحمتے کے بڑے بھائی اسماعیل کو جب اپنی بہن رحمتے کی عبدالکریم کے لیے پسندیدگی کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنے خانداں کی عزت بچانے کی غرض سے عبدالکریم پر بنا کسی گواہ اور ثبوت کے چوری کا سنگین الزام دھر دیتا ہے۔پولیس کسی تفشیشی کارروائی کے بغیر ہی چودھری سے رشوت کے پیسے وصول کر کے کر عبدالکریم کو ملزم سے مجرم بنا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیتی ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کا یہ افسانہ پولیس گردی اور اس کے نتیجے میں وڈیروں، جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ذریعے مزدوروں کے استحصال اور ان پر ہونے والے ظلم و جبر کی نشاندہی کرتا ہے۔افسانہ نگار نے بتایا ہے کہ کس طرح پولیس کی رشوت خوری اور جھوٹ کے ذریعے ملزم کو مجرم اور مجرم کو ملزم کی صورت بدل دینے جیسی کارستانیاں سرانجام دی جاتیں ہیں۔ پولیس نے

پیسوں کے بدلے عبدالکریم پر یوں جھوٹا الزام لگایا:

> ''عبدالکریم نے سہاوے کے ملک محمد دین کے گھر سے چوری کی ہے۔ ملک محمد دین کے بڑے بیٹے ملک اسماعیل نے تو اسے سامان سمیت موقع پر ہی پکڑ لیا تھا۔ طاقتور جو بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ بہت بڑی چوری ہے۔ ہزاروں روپے کا سونا ہے۔ ایک گٹھڑی میں لے کر بھاگ رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سونے کی گٹھڑی تو ملکوں کے باڑے سے برآمد ہو گئی جہاں عبدالکریم رات کے وقت سوتا تھا۔''(9)

مزدور طبقہ اپنی تھوڑی آمدن، اور معاشی مجبوریوں کے تحت پڑھنے لکھنے سے قاصر ہوتا ہے جس کی وجہ سے انہیں اپنے حقوق اور ان کے دفاع کی صحیح طریقے سے پہچان نہیں ہو پاتی۔ ان کے ان پڑھ ہونے کے سبب جاگیردار، چودھری، نمبردار اور دیہاتی وڈیرے ان کے حقوق کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ بے چارے غریب مزدور عزت اور جان یہ خوف کے مارے اپنے جائز حقوق کے لئے بھی آواز اٹھانے سے قاصر ہوتے ہیں۔

وہ نسل در نسل ظلم سہہ کر اس سب کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ اپنے بچوں کو بھی علم کی روشنی سے منور کرنے کی بجائے مشقت و مزدوری پر لگا دیتے ہیں۔ غریب کے لیے کم تنخواہ میں دو وقت کی حلال روزی کھانا ہیں بہت مشکل ہوتا ہے۔ فیس جمع کروانا، کتابیں خریدنا ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ غریبوں کے معصوم بچوں کی خواہشات ان کے کھیلنے ہی کے دنوں میں ہی مٹ جاتی ہیں۔ غریبوں کے بچوں کے ہاتھ کتابیں اور بستہ تھامنے کی عمر میں ہی مشقت و مزدوری کر کے سخت ہو جاتے ہیں۔ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے خاندان کو کئی دن تک بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے۔ زلزلہ، بارشیوں، سیلاب اور ناگہانی آفات سے بچنے کے لیے ان کے پاس رہائش یا راشن وغیرہ کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ اگر انہیں کوئی پریشانی یا آفت آن پڑے تو ان کے لئے جلد سنبھلنا بہت مشکل ہوتا ہے، کیونکہ ان کے پاس اتنا روپیہ پیسہ نہیں ہوتا کہ وہ حالات کا رخ پھر سے نارمل زندگی کی جانب موڑ سکیں۔

بیماریاں اور صحت کے مسائل بھی غریبوں کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ ہیں۔ اگر پسماندہ طبقے کا مزدور یا اس کے خاندان کا کوئی فرد بیمار پڑ جائے ان کے پاس علاج معالجے کے لیے رقم نہیں ہوتی، پرائیویٹ ہسپتال تو دور سرکاری ہسپتال کی فیس بھرنا اور خطرناک بیماریوں کے خلاف لڑنا ان کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے۔ جس کے بدلے میں وہ چھوٹے موٹے معمولی کلینک سے دوا لینے پر

مجبور ہوتے ہیں۔ جو انہیں وقتی طور پر تو راحت بخشتی ہے لیکن وہ بیماری اندر ہی اندر جڑ پکڑ لیتی ہے اور بالآخر موت یا کسی بہت بڑے مسئلے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

خوراک اور صحت کی سہولیات ہر شہری تک پہنچانا حکومت کی اولین ذمہ داری ہونی چاہیے لیکن صد افسوس کہ آج ہمارے حکمران خواب خرگوش میں مست، غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ انہیں بے چارے، کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے والے ان مظلوموں کی آہ و پکار اور بے بسی نظر نہیں آتی۔ ان کے پاس ملازمتوں کی کمی ہے۔ علاج معالجے کی سہولیات کا فقدان ہے۔ ان کی اجرت اور کام کا معاوضہ ان کی محنت کے بدلے آدھے سے بھی کم ملتا ہے۔ جاگیردار، ٹھیکیدار اور چوہدری ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں ان کی بے بسی اور معصومیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں کام سے نکالنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ ان کے خاندان، اور ان کی ماں، بیٹیوں کی عزتیں اور عصمتیں محفوظ نہیں رہتی۔ کوئی بھی گاؤں کا وڈیرہ روپے پیسے، اور طاقت کے نشے میں مست ان کی بہو، بہنوں کو دن دھاڑے اٹھا کر بلا نکاح اپنی حویلیوں میں رکھ لیتا ہے۔ ان مزدوروں کی عورتیں بچہ جننے کے دنوں کے قریب بھی تیز گرمی میں کھیتوں میں کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مزدوروں کی غیرت اور ان کی محنت کو ان کا جرم سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بولنے سے قبل ہی ان کی زبانوں کو تالے لگانے کا بندوبست کر لیا جاتا ہے۔

کام کے اڈوں پر انہیں بُرے القابات سے پکارا جاتا ہے۔ چھوٹی سی غلطی پر گالیوں اور تلخ باتوں کے نشتروں سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ ان مزدوروں کو چند روپوں کی لالچ دے کر ان کے ضمیروں کا سودا کیا جاتا ہے۔ ان سے ناجائز مقاصد کی تکمیل کروائی جاتی ہے۔ دیہاتوں کے بڑی جاگیروں کے چھوٹے دل والے مالکوں سے، ان مزدوروں کی ترقی ہضم نہیں ہوتی۔ یوں وہ ان کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔ ان بیچارے مزدوروں میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مالکوں کی کسی بات کو رد کر سکیں۔ یا ان سے اپنے کسی جائز حق کا مطالبہ کریں۔

یوں دو وقت کی روٹی کے لیے مجبور، یہ غربت کی چکی میں پسنے والا مزدور، نسل در نسل اسی مزدوری اور غلامی والی زندگی کو گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سالوں گزرنے کے باوجود ان کے معاشی حالات کبھی بہتر نہیں ہوتے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں مزدور طبقے کے تمام مسائل کی بڑے ہی عمدہ انداز سے عکاسی کی ہے۔ آپ کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری کو حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ افسانوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ بلاشبہ غلام فرید کاٹھیا مزدور کے بہترین ترجمان ہیں۔

پسماندہ طبقے کی ترجمانی

پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری ہے۔ پسے ہوئے طبقے کا اس غربت اور مہنگائی کے دور میں بغیر روپے پیسے، لوگوں اور معاشرتی اقدار کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ حکومتی سطح پر دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، مہنگائی اور حقداروں کو ان کے حقوق نہ ملنے کے باعث پسماندہ طبقہ کی زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔ بے روزگاری کی وجہ سے غریبوں کو فاقے کرنے پڑتے ہیں۔ بے شمار لوگ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ملازمت کے لئے دھکے کھانے پر مجبور ہیں، کیونکہ معمولی سی نوکری کے حصول کے لیے بھی اثر ورسوخ یا پھر کوئی تگڑی سفارش درکار ہوتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے افراد دولت اور سفارشوں کی وجہ سے کم اہلیت کے باوجود بھی بہترین عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ مگر بیچارہ غریب ڈگری اور پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بھی بہتر ملازمت کیلئے دھکے کھاتا رہتا ہے۔ یہ سب رویے سماجی ناانصافیوں اور مایوسی کو پروان چڑھاتے ہیں۔

آج کل سرمایہ داروں، جاگیرداروں، فیکٹریوں، کارخانوں کے مالکان، زمینداروں اور اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے لوگ غریبوں کا استحصال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نا صرف امراء بلکہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بڑے دوکاندار، تاجر، مزدور، اور ملازم جو خود تو بہت زیادہ سہولتوں میں زندگی گزار رہے ہوتے، ہاں البتہ ان کے گھریلو حالات نچلے طبقے کے بے روزگاروں، چپڑاسیوں، کمہاروں، مزارعوں، عام دکانداروں اور چھوٹے موٹے معمولی کام جاننے والے مزدوروں، وغیرہ کی نسبت خاصے بہتر ہوتے ہیں۔ درمیانہ طبقے کے یہ لوگ پسے ہوئے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں۔ یوں نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے غریب اور پسماندہ لوگ اپنے سے اعلیٰ لوگوں کے رعب ودبدبے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

غریبوں کو ان کا حق دلوانے کے لیے مختلف ادارے اور کچھ فلاحی تنظیمیں بھی کام کر رہی ہیں، لیکن وہ نچلے طبقے کے مسائل کو کم کرنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو پاتیں، کیونکہ وہ تمام فنڈز جو کہ ان غریبوں کی امداد کے لیے مختص کیے جاتے ہیں، وہ افسران بالا کی کرپشن اور لالچ کی نظر ہو جاتے ہیں۔ یوں غریبوں تک ان کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کی وجہ سے مزید غربت جنم لیتی ہے۔

آج کل ہمارے ملک میں فرقہ واریت بہت عروج پر ہے۔ معاشرہ شیعہ، دیوبندی سنی، اہل حدیث اور بریلوی جیسے مسالک میں بٹ چکا ہے۔ ذات پات، مسلک وبرادری اور مذہبی شدت پسندی کی آڑ لے کر پسماندہ طبقے کے معصوموں اور غریبوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھاتے ہیں۔ جبکہ

مذہب تو بھائی چارے، امن و محبت اور اخوت کا درس دیتا ہے، ایک دوسرے کے حقوق ضبط کرنے اور لوگوں کے حصوں پر ڈاکہ ڈالنے سے منع کرتا ہے۔ مگر ہمارے یہ سب بہت عام ہو چکا ہے۔ فرقہ پرستی کی وجہ سے اب ملازمت ملنا کافی دشوار بن گیا ہے۔ کوئی بھی بڑے عہدے والا کسی ایسے شخص کو ملازمت پر نہیں رکھتا جو اس کے مسلک یا فرقے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ بالکل اسی طرح غیر مذہب، اقلیتوں، خانہ بدوشوں، اور چھوٹی ذات، برادری کے لوگوں سے بھی زندگی کے ہر شعبے میں نامناسب رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ غریبوں کو ترقی کرنے اور زندگی میں آگے بڑھنے سے روکا جاتا ہے، یوں غریب نسلوں تک غریب، اور اپنے آبائی پیشے ہی سے منسلک رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کے بعد بھی اسے اچھی ملازمت نہیں مل سکے گی۔ اس سب کی وجہ سے مایوسی، چڑچڑاپن، نفرت، حالات سے بغاوت اور طبقاتی کشمکش جیسے عوامل جنم لیتے ہیں۔

آج ہمارے کچھ ادیبوں اور مصنفوں نے اپنی تخلیقات اور افسانوں وغیرہ میں غریبوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم، معاشرتی ناانصافیوں، اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے، تا کہ اس ظلم کے راج کے خلاف لوگوں میں شعور پیدا ہو سکے۔

غلام فرید کاٹھیا اردو ادب کے ان جدید افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کے افسانے مذہبی شدت پرستی، معاشرتی ظلم، عدم مساوات، اور پسماندہ طبقے کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانے ہمارے معاشرے کیلئے ایک بہترین اثاثہ ہیں۔ پسے ہوئے طبقے کے مسائل کو اجاگر کرتا غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''ہیلو-ہائی'' یونیورسٹی کے طالب علم عمار کی جذباتی کہانی ہے۔ عمار کا باپ معمولی سی پنشن لینے والا ایک ریٹائرڈ ملازم ہے جو اپنی اور اپنے خاندان کی بہت سی خواہشات کا گلا گھونٹ کر اپنے بیٹے کو انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم دلوانے میں کامیاب ہو پاتا ہے۔ وہ اپنی پنشن کی پائی پائی جوڑ کر بیٹے کا گریجوایشن کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ کروا تا چاہتا کہ اس کا بیٹا تعلیم حاصل کر کے کسی اچھی سرکاری نوکری کا اہل ہو سکے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے اس کی طرح سسک سسک کر زندگی گزارے۔ عمار یونیورسٹی میں داخلہ تو لے لیتا ہے مگر یہاں اس سے عنبرین نامی ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے، مگر اس کا اظہار اس کے لیے ایک بڑا چیلنج بن جاتا ہے۔ کیونکہ عنبرین ایک اپر کلاس گھرانے، جبکہ عمار پسے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ عمار عنبرین سے اپنے دل کی بات کرنا چاہتا ہے، مگر اس کے سامنے اس کی غربت مجبوری بن کر ناچنے لگ جاتی ہے۔ اسکی دل و دماغ میں بوڑھی بیمار ماں کے علاج اور چھوٹے بہن

بھائیوں کی تعلیم اور مستقبل کے خواب دوڑنے لگتے ہیں۔ وہ اچھے مستقبل کے لیے شارٹ کٹ راستہ ڈھونڈنے کی بجائے اپنی محنت اور قابلیت پر بھروسہ کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال کر ماں باپ کے ارمانوں کو فوقیت دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے باپ نے اپنی تمام عمر کی جمع پونجی اس کی فیسوں اور تعلیمی اخراجات پر صرف کر دی ہے، اور اب اسے ہی پڑھ لکھ کر اپنے خاندان کا سہارا بننا ہے، اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم اور مستقبل سنوارنا ہے، بوڑھی بیمار ماں کا علاج کروانا ہے۔ اس کا عنبرین سے جذباتی تعلق اظہار کے بغیر ہی ادھورا رہ جاتا ہے۔ وہ ایک نچلے طبقے کا فرد ہے یہ خیال ہی اسے سب کچھ بھولنے پر مجبور کر دیتا ہے کیونکہ اس کی فکروں نے اس کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ کیوں کہ وہ اپنی خاندانی ذمہ داریوں کی انجام دہی ترک نہیں کر سکتا تھا۔ ان سب حالات اور ذمہ داریوں نے اسے اس کی محبت بھلانے پر مجبور کر دیا تھا، جو بعد میں اس کے لئے پچھتاوے کا سبب بن گیا تھا۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے میں طبقاتی کشمکش کی عمدہ انداز میں تصویر کشی کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ہمارا معاشرہ اپنے سے کمتر طبقے کے افراد کو ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ کوئی ان سے رشتہ ناتا جوڑنے اور اپنی بیٹی بیاہنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اپنی غربت کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ خود نہیں لے سکتے, کیونکہ حالات اور ذمہ داروں نے ان کے ہاتھ پاؤں پوری طرح سے جکڑے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال عمار کی بھی تھی:

> ''میرا باپ ایک ریٹائرڈ ملازم تھا۔ ماں ضعیف اور بہن بھائیوں میں سب سے بڑا، اس لیے گھر کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو کیسے وقت دیتا گویا کہ میرے پاس ذہنی فرصت کا ایک لمحہ نہ تھا۔'' (10)

اس غربت اور بے روزگاری کے دور میں غریبوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا بہت ہی دشوار ہو گیا ہے۔ کم آمدن میں والدین بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے اپنی ساری کمائی ان پر لوٹا دیتے ہیں، تا کہ وہ پڑھ لکھ کر مستقبل میں کسی اچھی جگہ نوکری کر کے خاندان کا سہارا بن سکیں۔ ایسے والدین جو اپنی اولاد کی تعلیم کے حصول کے لئے اپنی خواہشات کی قربانی دیتے ہیں، تا کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر کنبے کا بوجھ اٹھا سکیں۔ انہیں اولاد سے بہت سی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اکثر اوقات ان غریب اور محنتی ماں باپ کے بچوں کو بھی اس چیز کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والدین نے انہیں یہاں تک پہنچانے کے لیے کتنی بڑی بڑی مشکلات برداشت کی ہیں، اسی وجہ سے ان کی اولاد بھی خاصی محنتی ہوتی ہے۔ وہ اپنے والدین کی طرح محنت پر یقین رکھتی ہے۔ تا کہ وہ پڑھ لکھ کر

اپنے حالات کو بہتر کر سکے۔

محنت کو اپنا وطیرہ بنانے والے ایک ایسے ہی نوجوان سروش کی کہانی افسانہ نگار نے اپنے افسانے ''ڈائریکٹر جنرل'' میں بیان کی ہے، اور بتایا ہے کہ کس طرح خیالات کی مضبوط گہرائی رکھنے والا ہونہار اور محنتی طالب علم سروش، اپنی دن رات کی جدوجہد سے اپنے گھریلو حالات بدلنا چاہتا ہے۔ ہمارے ہاں غریبوں کے بچے عموماً زیادہ محنت پسند ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے معاشی حالات کو سدھارنا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں پڑھنے لکھنے کے مواقع نصیب ہو جائیں تو وہ کبھی بھی انہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مگر افسوس کہ اتنی بڑی بڑی ڈگریاں اور اتنے شاندار گریڈز ہونے کے باوجود بھی انہیں کہیں بھی اچھی جگہ نوکری نہیں ملتی۔ یوں وہ برسوں پڑھنے، اور پیسوں کی بوریاں لٹانے کے بعد حاصل کی گئی ڈگریاں تھامے فقط در در کی ٹھوکریں ہی کھاتے رہتے ہیں۔ ان کے اچھے مستقبل کے سہانے خواب ادھورے ہی رہ جاتے ہیں۔ کیوں کہ کرپشن جیسی اس لعنت کے دور میں ہر شعبے میں کالی بھیڑیں مسلط نظر آتی ہیں۔ وہ کسی بھی نوکری کا اشتہار آنے سے قبل ہی اندر کھاتے اپنے عزیز رشتہ داروں، دوستوں یا جانے والوں کو رشوت کے بدلے ملازمت پر رکھوانے کی بات طے کر لیتے ہیں۔ یوں بیچارے حقداران کو فہرستیوں میں اولین ہونے کے باوجود ذلیل اور رسوا ہونا پڑتا ہے۔

آج کل پڑھنے لکھنے کے باوجود میریٹ پر اچھی ملازمت ملنا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ نوکری کے سلسلے میں درپیش مسائل کو جانتے ہوئے اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنے سے روک دیتے ہیں اور انہیں مزدوری پر لگا دیتے ہیں۔ باقی تعلیم حاصل کرنے والوں کو یہی فکر کھاتی رہتی ہے کہ کیا انہیں کبھی کسی اچھی جگہ کوئی عہدہ بھی مل پائے گا؟ یا ان کے حالات اس ڈگری کے سبب کبھی سدھر پائیں گے یا نہیں؟ کیوں کہ آج کل رشوت کا بازار گرم ہے اور عام آدمی اس سب کو ادا کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''ڈائریکٹر جنرل'' آجکل متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ہر ڈگری ہولڈر کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔:

> ''کیا میری ڈگری میرے کنبے کی زندگیوں کا بوجھ اٹھالے گی۔ کیا کاغذ کا یہ ٹکڑا میرے لیے باعزت روزگار کا ضامن ہو سکے گا۔ بہر حال مری الجھنیں جیسی بھی ہوں امتحانات کو تو ہونا تھا۔ طلباء کو گھروں کو بھی جانا تھا۔ پاس بھی ہونا تھا اور کچھ کو فیل بھی ہونا تھا۔ روزگار کسی کو ملے نہ ملے اس سے امتحانات کے ہونے کو کوئی سروکار نہ تھا۔''(11)

کرپشن اور رشوت خوری ہمارے ملک میں ناسور کی طرح پھیل چکی ہے۔ چھوٹے سے

لے کر بڑے عہدیدار تک ہر کوئی اس کی لپیٹ میں نظر آتا ہے۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ کم کمائی ہونے کے باعث رشوت خوروں کی جیبیں بھرنے سے قاصر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں زندگی کے معاملات میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں غریب طبقے کے مسائل کی بڑے ہی بہترین انداز میں عکاسی کی ہے۔ آپ کا افسانہ ''دست شفا'' پس ماندہ طبقے کی مشکلات کی وضاحت کرتا ہے۔ عیش افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ جس کا والد اس کے بچپن ہی میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ یتیمی کی زندگی گزارنے والے عیش کی والدہ نے اکیلے عیش اور اس کی بڑی بہن کی پرورش کی۔ جس کے دوران اسے بہت سے مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خود تپدق کی بیماری میں مبتلا تھی۔ وہ اپنی اولاد کے لئے جینا چاہتی تھی، اسی لئے اس نے اپنی تمام تھوڑی بہت جمع پونجی اپنے علاج پر صرف کر دی، تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ مگر اس کی جان بچ نہ سکی اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ننھے عیش کی نگاہوں میں علاج کے لیے سسکتی ہوئی ماں کی تصویر ساری عمر کے لئے مقید ہو گئی۔

نو سالہ معصوم عیش پر آفتیں ٹوٹ پڑیں۔ اب اس بھری دنیا میں اس کے پاس صرف اپنے سے پانچ سال بڑی فقط ایک بہن روبینہ ہی بچی تھی۔ جو کے بچپن ہی سے دبلی پتلی یہ وہ بھی دق سل کی بیماری سے انتقال کر گی۔ اب عیش ماں باپ کی محبت اور اپنوں کی شفقت سے مکمل طور پر محروم ہو گیا تھا۔ اس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہ رہا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو گاؤں کے بڑے بزرگ اس سے ملنے اور افسوس کرنے آتے رہے تاہم جلد ہی سب لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہوتے گئے۔ اب عیش کا اس کل کائنات میں کوئی نہ بچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کا یہاں کوئی بھی نہیں۔ اسے خود ہی اپنے لیے تمام جنگیں لڑنی ہیں۔ آپ اپنا سہارا اور ڈاکٹر بننے کے خواب کی خود ہی تکمیل کرنی ہے۔ ان سب باتوں نے اسے جینے کا حوصلہ دیا۔ وہ زندگی کی بے شمار مشکلات کے باوجود ڈٹا رہا اور محنت و مشقت کو ترک نہ کیا۔ اس نے میٹرک اور ایف ایس سی میں بہت ہی شاندار نمبر حاصل کیے۔ تاہم عیش کا میڈیکل کالج کا داخلہ ٹیسٹ پاس نہ ہو سکا۔ جس پر وہ سخت رنجیدہ تھا۔ اس نے بچپن ہی سے ہے ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھا تھا، وہ اکثر سوچتا کے کاش وہ کوئی ڈاکٹر ہوتا اور اپنی ماں اور بہن کو علاج کے ذریعے مرنے سے بچا لیتا۔ بوڑھا بابا خیر دین جس نے اسے بچپن ہی سے بیٹے کی طرح پالا، اور تعلیم کے حصول میں اس کی ہر طرح سے مدد کی تھی، اس کے میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے بہت پریشان تھا۔ اسے عیش سے بہت سی توقعات وابستہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عیش نے محنت میں کوئی کسر

نہیں چھوڑی۔تاہم عیش کے ڈاکٹر بننے کے خواب اور مستقبل کا سوچ کر اس کی فکر مندی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔غلام فرید کاٹھیا نے اپنے اس افسانے میں زندگی کے تلخ حقائق،خواتین کے سماجی مسائل، خاندانی مجبوریوں،غریب بچوں کی زندگی، یتیموں کے جذبات و بے بسی اور زندگی کے لیے جدوجہد پر خوبصورتی سے قلم اٹھایا ہے۔آپ نے متوسط طبقے کو درپیش مشکلات کی بڑی عمدگی سے عکاسی کی ہے۔افسانہ نگار نے عیش کے دن رات محنت کرنے ،اور داخلہ ٹیسٹ پاس نہ ہونے کے نتیجے میں بابا خیر دین کی پریشانی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''عیش عالم کی مرضی کے مطابق خیر دین نے اسے میڈیکل کالج میں داخل کروانے کی سر توڑ کوشش کی۔عیش کے نمبر بہت اعلیٰ تھے مگر سوئی قسمت کہ عیش داخلہ ٹیسٹ پاس نہ کر سکا۔بابا خیر دین نے ہمت نہ ہاری وہ عیش عالم کو راولپنڈی لے گیا اور اسلام آباد مرکز سے بھی سفارش کروانے کی کوشش کی۔وہ خود تو بہت غریب اور کمزور تھا وہ کس کی سفارش کرواتا مگر عیش عالم کے والد کے کچھ سر کردہ لوگ واقف کار تھے مگر جب وہ بھی کام نہ آئے تو بابا خیر دین بہت مایوس ہوا۔''(12)

آج ہمارے ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی غربت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔غربت کی وجہ سے پسماندہ طبقے کو معاشرے میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔انہیں اپنے بچوں کے لئے تعلیم و تربیت کے مواقع میسر نہیں ہوتے۔بیماری کی صورت میں علاج معالجہ نصیب نہیں ہوتا۔یوں یہ غریب سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔بالآخر اسی غربت ہی میں اپنی جان کی بازی ہار بیٹھتا ہے۔غربت انسان کو جلد بوڑھا کر دیتی ہے۔غریب بندے کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔پسماندہ طبقے کے افراد کو اپنی زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے اپنے بہت سیار مانوں کا گلا گھونٹا پڑتا ہے، کیونکہ اس کے گھریلو حالات بہت ابتر ہوتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''سوچوں کی آگ'' اسی تناظر میں لکھی گئی جیل کے ایک وارڈن فضلو کی کہانی ہے۔جو بیچارا غربت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔معمولی سی تنخواہ پر اس کے گھر کا گزر بسر بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ایک شام جب وہ دن بھر کی محنت کے بعد گھر کو لوٹتا ہے، تو اسے اپنی بیٹی کی شدید علالت کی خبر ملتی ہے۔جسے سن کر وہ بہت بے چین ہو جاتا ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں جس سے وہ ہسپتالوں کے مہنگے علاج اور بھاری بر کم فیسوں کے اخراجات برداشت کر سکے۔آج کل ہمارے ہاں علاج معالجے کا مسئلہ تقریبا پس ماندہ طبقے کے تمام ہی افراد کا مسئلہ بن

چکا ہے۔اگر غریب طبقے کا کوئی فرد بیمار پڑ جائے تو اسے علاج معالجے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔کیونکہ اس مہنگائی کے دور میں کم تنخواہ میں غریبوں کے تو فقط گھر کا راشن ہی پورا ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے تھوڑے بہت بچے کھچے پیسوں سے بچوں کی فیسیں ادا ہو پاتی ہیں۔ ان معصوموں کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی کہ سرکاری ہسپتال چھوڑ کر پرائیویٹ بینکوں اور ہسپتالوں کے اخراجات برداشت کرسکیں۔جس کے باعث انہیں مجبورا چھوٹے موٹے مقامی بنکوں ہی سے دوائی لینی پڑتی ہے۔جو تھوڑے وقت کے لیے تو افاقہ دیتی ہیں تاہم بیماری اندر ہی اندر جڑ پکڑتی رہتی ہے اور بالآخر ایک بڑے ناسور کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

سرکاری ہسپتالوں میں اب علاج بہت مہنگا ہو چکا ہے۔غریبوں کو یہاں بھی مہنگے مہنگے ٹیسٹوں اور لیبارٹریوں کے اخراجات بھگتنا پڑتے ہیں۔ جوان بیچاروں کی استعداد سے باہر ہوتے ہیں اس لیے انہیں علاج معالجے کے سلسلے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں غریبوں کی صحت اور علاج معالجے کے مسائل کو بہت کھل کر بیان کیا ہے۔آپکا افسانہ ’’سوچوں کی آگ‘‘ وارڈن فضلو کی بے بسی کی داستان بیان کرتا ہے۔تھوڑی سی تنخواہ پر کام کرنے والے بابا فضل نے اپنی عمر کا بیشتر وقت معمولی سی ملازمت میں صرف کر دیا۔اتنے برس کام کرنے کے باوجود بھی چاچا فضلو کے پاس اتنے پیسے جمع نہ ہو سکے کہ وہ مصیبت و پریشانی میں انہیں کسی کام لاسکتا۔ایک روز فضل چاچا کی بیٹی بہت بیمار ہوتی ہے۔فضل صبح سے شام تھانے میں کام کے بعد جب گھر لوٹتا ہے تو بیمار بیٹی کو دیکھ کر پریشانی میں خود بھی بیمار ہو جاتا ہے۔اس بیماری اور بے بسی کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑا دکھائی دینے لگتا ہے۔جیل کے قیدی بھی اس کی اس حالت سے باخبر ہوتے ہیں۔سلیم جو کہ جیل میں قید ایک امیر آدمی تھا، وہ جب فضل چاچا سے اس کی پریشانی کی وجہ دریافت کرتا ہے تو چاچا فضلو بے بسی وخستہ حالی کی تصویر بنے سلیم کے سامنے بڑے ہی ادب بھرے انداز سے اس اپنی بیمار بیٹی کی داستان کھول کر رکھ دیتا ہے۔سلیم، فضلو چاچا کی بے بسی کو اس کی نگاہوں اور اس کے بدن پر موجود لباس سے دیکھ بلکہ محسوس بھی کر رہا تھا۔فضل چاچا بیٹی کی بیماری کے غم میں پریشان، اپنے حلیے سے یوں نظر آ رہا تھا:

’’میلی کچیلی ٹوپی کے کھدے ہوئے کناروں سے باہر جھانکتے ہوئے
سفیدی مائل بھورے خشک بال۔ ماتھے پر پھیلی ہوئی تفکرات کی لکیریں،
عمر خوردہ بھوری بھنوؤں کے نیچے جینے کی ضرورت سے محروم مایوسیوں کی
ماری بے نور آنکھیں، زندگی کے تلخ سمندر میں اٹھتی ہوئی تند لہروں کا

شکار مرجھایا ہوا چہرا، جیون کے بوجھ سے نڈھال جھکے ہوئے شانے،
بدن میں پچڑے ہوئے پسینے میں شرابور ملیشیاء کی پھٹی ہوئی خستہ قمیض،
بے رنگ سی پٹی میں کسا ہوا بھوک کا مارا پلپلا پیٹ، زندگی کی پتھریلی
راہوں پر چلتے چلتے خمیدہ ٹانگیں، ان پر پہنی ہوئی ٹخنوں سے اونچی گھٹنوں
سے گھس کر ابھری ہوئی خستہ حال پتلون اور پیروں میں پیوند لگے سالوں
پرانے جوتے۔''(13)

والدین خدائے پاک کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ یہ ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو کہ اپنی اولاد کو اچھا برا سکھاتے، تربیت کرتے اور معاشرے کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں، مصیبتوں اور مصائب سے اپنی اولاد کو بچانے کے لیے ڈھال کا سا کام سرانجام دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اولاد اپنے والدین کے سائے میں پل کر فخر محسوس کرتی ہے۔ مگر اس کے برعکس جو بچے اپنے والدین کے سایہ شفقت سے محروم ہوتے ہیں انہیں زندگی میں بہت ساری مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے ''انو'' کے ذریعے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم بچیا نو کی دکھ بھری کہانی بیان کی ہے، اور بتایا ہے کہ بغیر ماں باپ اولاد کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ''انو'' افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کی ولادت کے بعد، جلد ہی اس کا والد اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ یوں انو یتیمی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ گھر کی دال روٹی چلانے کے لئے وہ اپنی ماں کے ساتھ مل کر اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی معمولی سی منیاری کی دکان پر بیٹھنے لگتا ہے۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد انو کی والدہ نمونیا کے باعث جان کی بازی ہار جاتی ہے۔ یوں انو کا واحد سہارا بھی اس سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ باپ کی شفقت سے تو پہلے ہی محروم تھا، اب اس کم عمری میں اسے ماں کی ممتا کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہے۔ انو تیسری جماعت کا طالب علم تھا جب اس معصوم کے ننھے ہاتھوں نے بستہ اور کتابیں تھامنے کی عمر میں ہی محنت و مشقت کرنا شروع کر دی تھی۔

ادھوری تعلیم اور چھوٹے چھوٹے خوابوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے بیچارہ انو تن ڈھانپنے اور پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر خود ہی دکانداری کرنے لگا۔ اس کی دکان کیا تھی فقط معمولی سا منیاری کا سامان تھا۔ آج ہمارے معاشرے میں ایسے ہی بے شمار بچے ہیں جو معاشرتی مسائل کے ہاتھوں مجبور کم عمری ہی میں گھر کی تمام ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ مشقت و محنت کرتے یہ بچے ہمیں اکثر ورکشاپوں اور مختلف دکانوں پر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض بچے ہوٹلوں میں برتن دھونے کچھ پٹرول پمپوں پر گاڑیوں کے شیشے صاف کرنے اور اسی طرح بعض سڑکوں یا

چوراہوں پر کھڑے منیاری وغیرہ کا سامان بیچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ صبح سویرے کام پر جانے والے یہ بچے اپنے گھر ہی سے دوپہر کے کھانے کا تھوڑا بہت سامان ہمراہ لے جاتے ہیں، کیوں کہ ان کے پاس باہر کے چٹ پٹے کھانے کھانے کے لیے پیسے موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح بعض ایسے بچے جن کے گھر کھانا پکانے والا کوئی نہیں ہوتا، وہ معصوم سارا دن ایسے ہی دن کام کاج میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ بچے جب اپنی عمر کے بچوں کو ہنستے کھیلتے اور کندھوں پر بستے لٹکائے سکول جاتے دیکھتے ہیں، تو ان کا بھی دل کرتا ہے کہ وہ بھی تعلیم حاصل کریں۔ وہ بھی اپنے ہم عمر دوسرے بچوں کی طرح ہنسیں، کھیلیں کودیں، موج مستی کریں، بے فکری کی زندگی گزاریں۔ مگر افسوس کہ انھیں گھر یو ذمہ داریوں کا بوجھ یہ سب نہیں کرنے دیتا۔ ان معصوم بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور خواب، کم عمری میں ہی ادھورے رہ جاتے ہیں۔ حکومتی سطح پر تو چائلڈ لیبر کی روک تھام کے لیے بہت سی این جی اوز اور کئی قوانین بھی بنائے گئے ہیں۔ تاہم یہ فقط دعووں ہی کی حد تک ہوتے ہیں۔ حقیقت میں ان پر کوئی عمل نہیں کیا جاتا۔

کم عمری ہی میں مختلف جگہوں پر کام کرنے والے بچوں کا کوئی بہتر مستقبل نہیں ہوتا۔ انھیں اپنے ان پڑھ استادوں کی طرف سے مختلف طریقوں سے زدوکوب کیا جاتا ہے، کام سے نکالنے اور تنخواہ کاٹنے جیسی مختلف دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بڑی بڑی سزائیں، اور والدین تک کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ ان بیچاروں کو ڈرایا، دھمکایا اور ان سے بدتمیزی سے پیش آیا جاتا ہے۔ مگر یہ معصوم معاشی حالات کے باعث ان تمام مظالم کو چپ چاپ صبر سے برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے گھریلو حالات سے باخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

افسانہ نگار نے اپنے افسانے ''انو'' کے ذریعے یتیم بچے انو کو درپیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے یہ چھوٹے معصوم بچے کی عمر میں، معاشی مسائل کے تحت گھروں سے نکل کر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بیچارہ انو بھی اپنے انہی معاشی حالات کے باعث شدید گرمی میں روزی روٹی کے لیے، منیاری کا کچھ سامان کندھے پر اٹھائے دوسرے گاؤں کا رخ کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تاکہ وہاں اس کا زیادہ سے زیادہ سامان بکے اور اسے بھی فائدہ حاصل ہو سکے۔ انو کے دوسرے گاؤں میں جانے اور سامان بیچنے کے منظر کو غلام فرید کاٹھیا نے بڑی ہی دردمندی سے اپنے افسانے میں اس طرح بیان کیا ہے:

''پسینے میں شرابور وہ گاؤں میں واقع چند دکانوں پر مشتمل بازار میں گیا تو

اسے دو دکانوں کے درمیان خالی جگہ ملی جو لسوڑے کے سرسبز اور گھنے پتوں والے درخت نے گھیر رکھی تھی۔اس نے لسوڑے کے درخت سے چند شاخیں توڑیں جن سے اس نے جھاڑو کا کام لیتے ہوئے، جگہ صاف کرتے ہوئے اپنی گٹھڑی کھولتے ہوئے چادر بچھائی اور اپنی دکان سجا دی۔۔۔کچھ بچے اس کے گرد جمع ہوگئے اور چادر پر سجی چیزوں کو غور سے دیکھنے لگے۔لیکن جلد واپس جا کر اپنے کھیل میں مصروف ہوگئے کیونکہ ان کو اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔انو انہیں دیکھتا رہا اس کا بھی ان کے ساتھ کھیلنے کو دل کر رہا تھا لیکن وہ نہیں کھیل سکا۔''(14)

پسماندہ طبقے کے افراد کو امراء کی طرف سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیہات کے وڈیروں، زمینداروں اور چوہدریوں وغیرہ کی طرف سے غریبوں اور پسے ہوئے طبقے کے لوگوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔دوران ملازمت غریب ہاریوں پر جبر وستم ڈھایا جاتا ہے ہے۔معمولی سی غلطی پر بھی انہیں سخت تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ بری طرح زدوکوب کیا جاتا ہے۔ان کی عورتوں اور اہل خانہ کو جان سے مارنے جیسی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بچارے غریب غربت کے باعث خاموشی سے یہ سب برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ان کی اسی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرمایہ داران سے جائز و ناجائز کام نکلواتے ہیں۔ان معصوم لوگوں کو کبھی پیسوں کا لالچ دے کر،کبھی قرضے کے نام پر بلیک میل کر کے،کبھی نوکری سے فارغ کرنے کا کہہ کر تو کبھی جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر مسائل میں الجھایا جاتا ہے۔

دیہاتی لوگ کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں، جس کے باعث وہ اپنے حقوق کی فراہمی کے حوالے بے خبر ہوتے ہیں۔غریبوں کی اسی کم علمی کو امیر طبقہ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے ''لمحوں کی قید'' کے ذریعے پسماندہ طبقے کے ایک غریب دیہاتی شمو کی کہانی کو اجاگر کیا ہے۔افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح سرمایہ دار غریبوں کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔شمو ایک محنت کش ہاری تھا، جو کہ اپنی محنت کی بدولت اپنے گھر کے حالات بدلنا چاہتا تھا۔اپنے بوڑھے ماں باپ کو بہتر زندگی دینے اور اپنی بہن رانو کو اچھی جگہ بیاہنے کے خواب دیکھنے والے شمو نے سائیں کے کھیتوں میں دن رات مشقت کی، اور اپنی مزدوری کے بدلے کافی زیادہ گندم جمع کر لی۔سائیں کو یہ بات برداشت نہ ہوئی کہ شمو کے پاس اتنی زیادہ گندم ہو۔اس میں شمو کو سبق سکھانے کا منصوبہ بنایا اور شمو کی بہن رانو کو اغوا کروالیا۔شمو

بیچارہ سیدھا سادہ انسان تھا۔ وہ گاؤں کے سائیں کے ہاں مدد کے لیے جاتا ہے، اور اس سے فریاد کرتا ہے کہ میری بہن کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرو۔ مکار سائیں اسے تسلی دے کر واپس لوٹنے کا کہتا ہے۔ کیوں کہ سائیں کے دماغ میں خودغرضی اور لالچ کا فتور بھرا ہوتا ہے۔ وہ شمو کو اپنی ذاتی دشمنی کیلئے استعمال کرنے کا منصوبہ بناتا ہے، اور شمو کے دماغ میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ چھوٹے ڈیرے کا سائیں رانو کو پسند کرتا ہے، اور اسی نیا سے اغواء کروایا ہے۔ شمو یہ سب سننے کے بعد غصے اور غیرت میں آ کر سائیں کو جان سے مارنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسی اثنا میں سائیں اپنے ہی کارندوں کے ذریعے چھوٹے سائیں کو قتل کروا دیتا ہے، اور سارا مدعا شمو کے سر ڈال دیتا ہے۔ شمو جو اس سب سے بے خبر تھا۔ پولیس اسے گرفتار کرنے اس کے گھر پہنچ جاتی ہے، شمو اس ساری صورتحال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھا کہ آخر سائیں کا قتل کس نے کیا، اور اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے کے ذریعے بڑی دردمندی سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح امیر لوگ غریبوں کے سامنے جھوٹی شان و شوکت کے لبادے اوڑھے ہوتے ہیں۔ وہ غریبوں کے مسئلے مسائل تو سن لیتے ہیں مگر بعد میں انہیں اپنے ہی فائدے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بیچارہ شمو بھی جب سائیں کے پاس اپنی بہن کے اغواء کی فریاد لے کر آتا ہے تو سائیں خود اپنے دشمنوں کو قتل کروا کر سارا الزام شمو کے سر ڈال دیتا ہے۔ یوں شمو جیل کی سلاخیں کے پیچھے ہوتا ہے اور رانو سائیں کی بانہوں میں۔ سائیں ساری گندم کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ شمو بیچارہ بغیر کسی گناہ کے اپنی جوانی کے خوبصورت دن جیل کی کوٹھری کی نذر کر دیتا ہے۔ وہ رہائی کا پروانہ ملنے کی امید کھو دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ تو ایک غریب آدمی ہیں اس کی رہائی بلا کون کروائے گا۔

قتل ہونے والا سائیں تو ایک بڑا آدمی تھا، اس کے وفادار مجھے ساری زندگی جیل سے نہ نکلنے دیں گے، شاید میری ساری ہی زندگی انہی سلاخوں کے پیچھے گزر جائے گی۔ اک روز شمو جیل میں بیٹھا انہی سوچوں میں غرق تھا کہ اسے وارڈن کے ذریعے اپنی رہائی کی اطلاع ملتی ہے۔ جسے سن کر وہ حیران ہو جاتا ہے کہ اس کی رہائی کیسے ہوئی؟ اس کو جیل سے نکالنے کے پیچھے کون ہے اور اس کا آخر کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ وہ یہ سب جاننے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا، وہ اپنے آپ کو بہت بے بس اور اضطرابی کی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔ اول تو اسے منشی کے الفاظ پر ہی اعتبار نہ آ رہا تھا، مگر جب اس نے منشی سے رہائی کا کاغذ لے کر دیکھا تو اسے یقین آیا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے دل کی تسلی کے لئے منشی سے سوالیہ انداز میں پوچھتا ہے کہ اس کی رہائی کیسے ہوئی؟ غلام فرید کاٹھیا نے شمو اور منشی کے مکالمے کی ابتدا اور

فکرمندی میں شمو کے منشی سے کیے گے سوالات کو یوں پیش کیا ہے:

"یہ کیسے ہوا؟ ابھی تو چالان بھی عدالت میں نہ پہنچا ہوگا۔۔۔یہ رہائی کیسے ہوئی۔۔۔کیا۔۔کیا ایسا تو نہیں کہ سردار ڈوڈے خان اور کریم بخش نے تگڑی سفارشوں سے رہائی کروائی ہو۔۔۔تاکہ وہ۔۔۔شما۔۔۔ان کے دشمنوں کا دلیر قاتل۔۔۔اپنے وڈیروں کے احسانات کے بوجھ تلے اتنا دب جائے کہ عمر بھر ان کی خدمت ہی کرتا رہے۔وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہی کا ہو کے رہے۔ان کے پالتو کتوں میں شامل ہو جائے۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔"(15)

ہمارے ملک میں دو تہائی سے زائد افراد غربت و پسماندگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔سرمایہ دارانہ، جاگیر دارنہ سسٹم اور روز بروز بڑھتی مہنگائی کے سبب غریب بیچارے کو تو دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔

امراء غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔غریبوں کا بری طرح استحصال کیا جاتا ہے،ان کے حقوق پر قبضہ جمایا جاتا ہے۔خوشحال اپنے سے کمتر لوگوں پر رعب ودبدبہ جماتے ہیں۔ غریبوں پر ہر طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔پسماندہ طبقے کے لیے کام کرنے والی مختلف این جی اوز اور فلاحی تنظیمیں بھی غریبوں کو انکے حقوق دلوانے سے قاصر ہیں، کیوں کہ غریبوں پر خرچ ہونے والا سارا پیسہ سرمایہ داروں اور حکمرانوں کی کرپشن کی نظر ہو جاتا ہے۔

غریبوں کو صحت، تعلیم، رہائش اور خوراک کی فراہمی نہ ہونے جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں پسماندہ طبقے کو درپیش مشکلات کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے۔آپ نے معاشرے میں عدم مساوات،غریبوں پر ہونے والے مظالم اور طبقاتی کشمکش جیسے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع خاص بنایا ہے۔آپ نے دیہاتوں کے وڈیروں، جاگیرداروں، نوابوں، چوہدریوں اور استحصالی اذہان کے مالک سرمایہ داروں کے غریبوں سے بدسلوکی کے رویوں کے خلاف اپنے افسانوں میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا ہے۔

کسانوں کی ترجمانی

پاکستان کے جنوبی پنجاب اور سندھ کے دیہی علاقوں میں وڈیروں، نوابوں، جاگیرداروں کا راج ہے۔زمین کے مالک یہ نواب اور سردار ہی ہوتے ہیں۔وہ خود تو بڑے بڑے شہروں میں عالیشان

بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں جب کہ ان کی زمینوں کا کام ان کے منشی اور خاص ملازم کرتے ہیں۔ جاگیرداروں کا جب جی چاہے اپنے گاؤں اور زمین پر چلے جاتے ہیں، وہاں ٹھہرتے ہیں، اپنی جاگیر اور زمینواں کا جائزہ لیتے ہیں، اپنی فصلوں کی پیداوار اور آمدن اپنے خاص ملازموں اور منشی کے ذریعے اکٹھی کرتے ہیں۔ ان منشیوں اور ملازموں نے تھوڑے تھوڑے اجرت کے ہاریوں اور کسانوں کو دے رکھی ہوتی ہے۔ جو کہ اپنی بساط کے مطابق ان زمینوں پر محنت ومشقت کرتے ہیں۔ فصل کی پیداوار کا بڑا حصہ سرداری نواب کے کارندے اکٹھا کر لیتے ہیں اور ہاریوں اور کسانوں کے پاس بمشکل ان کے گزر بسر کے لیے اناج رہ جاتا ہے۔ اگر کبھی فصل اچھی ہو جائے اور کسان اور ہاری کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ اناج آ جائے تو یہ وڈیرے انہیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے پیداوار سے محروم کر دیتے ہیں۔ کبھی اناج کی پیداوار کا چواری کا الزام لگا کر اور کبھی گائے اور بھینس کی چوری میں انہیں اندر کروا کر انہیں چھڑانے کے عوض ان کا فالتو اناج بھی ہتھیا لیتے ہیں۔

اگر کسی وڈیرے یا جاگیردار کو کسی کسان اور ہاری کی کوئی گائے، بھینس اچھی لگے تو وہ اسے کہتے ہیں کہ اسے ہمارے ڈیرے پر بھیج دو اور پھر جو جی چاہے سے تھوڑی بہت رقم دے دیتے۔ اسی طرح اگر کسی ہاری یا کسان کے گھر والوں میں سے کوئی بیمار پڑ جائے اور اسکا علاج شہر میں کسی ہسپتال میں کروانا پڑ جائے تو علاج معالجے پر اٹھنے والے اخراجات پر وہ چھوٹا کسان کئی سالوں تک قرض میں جکڑا رہتا ہے اور وڈیرے اور جاگیردار کو چھوڑ کر کہیں جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کر سکتا ہے۔ ان ہاریوں اور کسانوں کی زندگی ان نوابوں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے رحم وکرپ پر ہوتی ہے۔ بعض کسانوں کے معاملات میں یہ جاگیردار اور وڈیرے اتنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں کہ ان کی بہنوں اور بیٹیوں کے رشتے اپنے ملازموں یا اپنے من پسند افراد سے طے کر دیتے ہیں اور وہ چھوٹے کسان اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ ان کی عورتیں تو درکنار ان کے مرد بھی اپن رائے کا اظہار نہیں کر سکتے اور وڈیرے کی بات تک انہیں بلا چون وچرا ماننی پڑتی ہے۔

چھوٹے ملازموں کی بہنوں، بیٹیوں پر اگر کسی وڈیرے، اسکے بیٹے یا اسکے رشتے دار کی نظر آ جائے تو اسے گھر سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اگر انہیں حد سے زیادہ پسند ہو تو اس کے ساتھ

نکاح بھی کر لیتے ہیں۔ یوں ان کو مظلوم کسانوں اور ہاریوں کی کہیں بھی سنوائی نہیں ہوتی۔ ان وڈیروں نمبرداروں اور چودھریوں کی جانب سے پولیس بھی کسی کی پروانہیں کرتے۔انھیں کسی کی بھی ذرابرابر پروانہیں ہوتی اور نہ ہی خوف ہوتا ہے۔ یہ اپنے سے کم تر یا چھوٹے ملازموں اور غریب مخالفین سے اپنے کسی پرانے حسد، ذاتی انا کا بدلہ لے لیتے ہیں۔آج کل ہمارے معاشرے میں چھوٹے اور غریب کسانوں کا بہت بری طرح استحصال کیا جا رہا ہے۔ان کی عزت، جان مال، آبرو سب کچھ برباد کر دیا جاتا ہے۔ایک افسانے میں محنت پسند ''شمو'' کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کہ نسل در نسل چھوٹے کسانوں کے گھرانے سے تعلق رکھنے والوں کی کہانی ہے۔ وہ محنت ومشقت میں رچے بسے گھرانے میں پلی بڑھی ہے۔اس کے ماں باپ ''رانو'' کوعزت سے رخصت کرنا چاہتے ہیں اور اسے ایک نئی زندگی دینا چاہتے ہیں۔مگر اچانک پتا چلتا ہے کہ وہ گھر سے غائب ہوگئی ہے۔

''سائیں! رانو گھر سے غائب ہے اسے اٹھوا لیا گیا ہے۔، وہ ایوی سی بالکل نہیں ہے۔ یہ سردار ڈوڈے خان کے بھتیجے رحیم داد کی حرکت ہے اور سائیں اللہ ڈوائے نے دانت پیستے ہوئے کہا: رحیمو کے بچے مرتی گوٹھوں میں یہ جرات! میں ان کے سب ہاریوں کی بیٹیاں اٹھوالوں گا۔ میں دیکھتا ہوں وہ باز وواپس کیس نہیں کرتے۔"(16)

ظلم و جبر عدل کی ضد ہے۔عدل وانصاف ہی کے سبب انسان زندہ جاوید ہے۔جس معاشرے میں انصاف نہ ہو وہاں ظلم راج کرنے لگتا ہے۔ درندگی و دہشت پھیل جاتی ہے۔ملزم کو چند منٹوں میں مجرم اور سزا یافتہ مجرموں کو معزز بنا دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہمیں بار بار انصاف کا حکم ملتا ہے۔ کہا گیا ٹھیک ہے ''کسی قوم (یا فرد) کی عداوت تمہیں ناانصافی پر نہ ابھارے، تم عدل کرتے رہو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

افسانہ ''لمحوں کی قید'' ایسی ہی درد بھری کہانی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مصنف غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے کے ذریعے منافقت کا لبادہ اوڑھے، ہوس، حسد اور بدلے کی آگ میں جلتے ''وڈیروں، سائیں اللہ ڈوائے'' اور سردار ڈوڈیخان کے ہاتھوں مظلوم شمو کا استحصال ہوتے

ہوئے دکھایا گیا ہے۔

شمو اپنی سوچوں میں گم تھا کہ وارڈن کوٹھری میں آیا اور اسے رہائی کی خبر دی جس پر وہ حیرت زدہ ہو گیا۔ اس سب افسانے میں غلام فرید کاٹھیا نے معاشرے کے دوہرے کرداروں پر روشنی ڈالی ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح معصوم شمو کو قتل کے الزام میں پھنسا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینکا گیا جب کہ اصل ملزم کوئی اور تھے۔ اس بات کو غلام فرید کاٹھیا نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''شمس شمس ایک ہیڈ وارڈن کی آواز نے شمے کی سوچوں کی زنجیر توڑ ڈالی، وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور ہیڈ اوارڈن کے پاس چلا گیا۔
> ''قتل کے اصل ملزم گرفتار ہو چکے ہیں۔ تم بالکل بے گناہ تھے۔ پولیس نے عدالت سے ڈسچارج کروایا ہے۔۔ رجسٹر پر یہاں دستخط کرو اور رہائی کا یہ پرچہ لو"(17)

غلام فرید کاٹھیا نے کسانوں، چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعوں پر صدیوں سے ہونے والے مظالم اور ان کے استحصال کے حوالے سے بڑی دردمندی سے کھل کر قلم اٹھایا ہے۔ ظلم کا نظام صدیوں پرانا ہے، پاکستان کے کئی علاقوں میں ابھی بھی دیہاتوں کے وڈیرے چھوٹے کسانوں پر ظلم ڈھاتے نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے غریب کسان اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتے، سرمایہ دار غریبوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ابھی معاشرتی ناہمواری اپنے عروج پر ہیں۔ وٹہ سٹہ، کاروکاری، ونی کرنا جیسی بے شمار غلط رسوم کی وجہ سے بڑے بڑے مگر مچھ نما سرمایہ دار اپنے حریفوں پر جھوٹے الزامات کے ذریعے انہیں سزائیں دلواتے ہیں۔ غریب کسانوں کو اپنی اولاد کی پسند کی شادی یا کسی اونچے خاندان غریب سے تعلق جوڑنے پر جاگیرداروں کی جانب سے ممانعت ہوتی ہے۔

ان مزارعوں اور چھوٹے کسانوں کو اپنے فیصلوں کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ ان کی گھروں کی عورتیں اکثر گاؤں کے وڈیروں اور چودھریوں کی ہوس بھری نگاہوں سے محفوظ نہیں رہ پاتیں۔ ان جاگیرداروں کا جب جی چاہے کسی بھی مزارعے یا چھوٹے کسان کی بہو، بہن یا بیٹی کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور جتنا عرصہ مرضی چاہے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بناتا رہتا ہے۔ اگر جی چاہے تو اسے اپنی منکوحہ

بنا کر حویلی میں رکھے یا اگر دل کرے تو داشتہ کے روپ میں۔ عورتوں پر ہونے والے ان مظالم کے خلاف اگر کوئی بھی مزارع یا کسان آواز اٹھائے تو اسے جاگیردار سے بغاوت تصور کیا جاتا ہے۔ جس کی بنا پر ظلم کے خلاف احتجاج کرنے والوں ہی کا قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس سارے ستم کی وجہ سے کسی غریب میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ان فرعون نما وڈیروں کا مقابلہ کر سکے۔

ان ظالموں کے خلاف کوئی ایف۔ آئی۔ آر نہیں کاٹی جاتی۔ پولیس ان کے گھر کی باندی ہوتی ہے۔ کوئی انہیں پوچھنے یا سمجھانے والا نہیں ہوتا۔ ان کے معاملے میں کوئی قانون حرکت میں نہیں آتا۔ ظالم کے واسطے الگ ہی انصاف ہوتا ہے۔ روپے پیسے اور طاقت کے زور پر یہ جاگیردار ہر کام اپنی مرضی سے کرواتے ہیں۔

وڈیروں، چودھریوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے اپنے ہی الگ قوانین ہوتے ہیں۔ اگر ان کی کوئی چیز چوری بھی نہ ہو تو وہ اپنے سے کمتر طبقے کے افراد کو پھنسانے کے لیے اسے چوری یا ڈاکے کا نام دے دیتے ہیں۔ جبکہ کسی عام بندے کی گائے، بھینس یا کوئی اور چیز کسی وڈیرے کو پسند آ جائے اور اس کے کارندے اسے اٹھا کر لے جائیں تو اسے ڈاکے اور چوری کی بجائے اپنا حق سمجھ کر ہڑپ لیا جاتا ہے۔ یہ ناانصافی نہ صرف جانوروں اور چیزوں تک محدود ہے بلکہ ان معصوم لوگوں کی بیٹیوں اور عورتوں کی عزتیں بھی انہی جھوٹی شان وشوکت رکھنے والے وڈیروں اور چوہدری کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ اگر ان کی نظر کسی کسان، ہاری یا چھوٹے مزارعے کی بہو، بیٹی پر جم جائے تو اسے بغیر کسی خوف و ہراس کے اپنی حویلیوں میں لا ڈالتے ہیں۔ اگر منشا ہو تو ان سے نکاح کریں اور اگر نہ ہو تو یوں ہی بغیر نکاح زندگی بھر یا جتنا عرصہ چاہیں انہیں ٹیشو پیپر کی طرح استعمال کریں۔ اس سب کے دوران انہیں کسی قانون، ادارے حتٰی کہ اپنی معاشرتی ساکھ اور وقار کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ غریب عورتوں کا جنسی حوالے سے بری طرح استحصال کرتے ہیں۔ جس کے سبب پیدا ہونے والے بچوں کو معاشرہ حقارت اور بری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ زندگی پر ایسی اولاد کو معاشرے کی طرف سے بہت سی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کا وجود ناجائز ذرائع یا زبردستی کے نکاح کی صورت پروان چڑھا ہوتا ہے۔ ایسے بچوں کی ساری زندگی دوسروں

کے طعنے اور باتیں ہی سننے میں گزر جاتی ہے۔وڈیرے، سائیں اور چوہدری عورتوں پر اس طرح کے بے شمار مظالم ڈھاتے رہتے ہیں۔جن کے خلاف غریبوں کو آواز تک بلند کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

غلام فرید نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورتوں پر ہونے والے ان مظالم کا بار بار ذکر کیا ہے۔ آپ کا افسانہ ''لمحوں کی قید'' اسی ظلم و جبر کے نظام کو بے نقاب کرتا ہے۔افسانے میں موجود ہوس کا پجاری سائیں اللہ ڈوایا، جھوٹی شان و شوکت، اپنائے غریب عورتوں کا جنسی استحصال کرتا دکھائی دیتا ہے۔

جیل کی سلاخوں کے پیچھے شمو کو ایک ایسا بوڑھا انسان ملتا ہے، کہ جس کی بیٹی کو کئی سالوں پہلے سائیں اللہ ڈوایا نے زبردستی نکاح کے بندھن میں باندھ کر اپنی حویلی میں رکھا تھا، جب اس لڑکی کے باپ نے سائیں اللہ ڈوایا کے خلاف بغاوت کی، اور اپنی بیٹی کی واپسی کا مطالبہ کیا تو سائیں اللہ ڈوایا نے اسے قتل کے جھوٹے مقدمے پھنسا کر جیل بھجوا دیا تا کہ نا بوڑھا کبھی جیل سے باہر آسکے اور نہ ہی اپنی بیٹی کی واپسی کے لیے گاؤں والوں کے سامنے کوئی واویلا کرے۔سائیں اللہ ڈوایا نے جیسے اس بوڑھے آدمی اور اس کی بہن کے ساتھ کیا وہ بالکل اسی طرح شمو اور اس کی بہن رانو کے ساتھ بھی کرنا چاہتا تھا۔اسی غرض سے اس نے شمو کو جیل بھجوا دیا تھا۔

افسانہ نگار نے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے امرا، سرمایہ دار، وڈیرے اور جاگیردار غریب عورتوں کی عزتوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں۔انہیں نکاح کے حوالے سے اپنی شرعی رضامندی تک کے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ان ظالموں کا جب دل کرے، جس مرضی کو اٹھا کر اپنی حویلی کی اونچی چار دیواری میں جسمانی تسکین کے لیے قید کر لیتے ہیں۔جب جس سے جی چاہے ہم بستری کرتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کو ساری زندگی ذلیل ہونے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ایسا ہی سب شمو کے ساتھ جیل میں موجود اس بوڑھے اور اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ہوا، جب سائیں اللہ ڈوایے نے بوڑھے کی بیٹی کو زبردستی نکاح میں باندھ کر حویلی رکھا تو، اس سے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔جسے نمی کا نام دیا گیا۔سائیں نے بوڑھے کی بیٹی کا قتل کروا کے، ننھی نمی کو اپنی پہلی بیوی کو سونپ دیا اور سب کو یہی بتایا کہ نمی میری پہلی بیوی سے ہونے والی اولاد ہے، اور کریم بخش نمی کا سگا بھائی ہے۔جبکہ حقیقت میں نمی شمو کے ساتھ جیل میں مقید

بوڑھے غریب ہاری کی نواسی تھی۔

اس بات کا علم فقط سائیں کے نوکر حاکو ہی کو معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حاکو نے ہی نمی کی ماں کو سائیں اللہ ڈوایا کے لیے اغوا کیا تھا۔ حاکو سائیں اللہ ڈوایا کی موت کے بعد یہ بات کریم بخش کو سناتا ہے۔ کریم بخش جو اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے کہ نمی اس کی سگی بہن نہیں بلکہ کسی غریب ہاری کی نواسی ہے، تو وہ طیش میں آجاتا ہے اور نمی کو اپنی بہن ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ یوں نمی اتنی بڑی جائیداد کی حق دار ہونے کے باوجود در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوتی ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے اس افسانے کے ذریعے غریب عورتوں کی عزت اور جھوٹے مرتبے کا لبادہ اوڑھے فرعون نما وڈیرے کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی وڈیرا کسی غریب ہاری کی بیٹی سے نکاح کر لے تو پھر انہیں حویلی میں عزت و قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ انہیں بیوی ہونے کے باوجود ہمیشہ کم تر، نیچ اور گھٹیا ہی تصور کیا جاتا ہے۔ انہیں حویلی میں وہ عزت نہیں ملتی جو انکا حق ہوتا ہے۔ کریم بخش کو حاکو کے ذریعے جب نمی کی ماں کی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے تو وہ نمی ہی کو اپنی بہن ماننے سے انکار کر دیتا ہے. غصے کے عالم میں کریم بخش حاکو سے کہتا ہے کہ:

> ''نمی میری بہن نہیں ہو سکتی۔۔۔ ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ میری ماں
> وڈیرے خاندان کی معزز خاتون۔۔۔اور نمی کی ماں ۔۔۔نیچ ہاری
> خاندان کی نیچ عورت۔۔۔نمی کو میں بہن کیسے مان لوں'' (18)

چاہے کوئی غریب ہو یا امیر، اپنے ذاتی گھر کا خواب ہر کسی ہی کا ہوتا ہے۔ اپنے وطن اور پیاروں سے محبت ہر ایک کے لہو میں شامل ہوتی ہے۔ جہاں انسان کا بچپن اور جوانی گزری ہو اس جگہ سے انسان کی انسیت فطری ہوتی ہے۔ اپنے گاؤں شہر یا علاقے کو چھوڑ کر کسی اور جگہ نقل مکانی کرنا بہت ہی مشکل کام ہے، چاہے پھر کوئی زمین کا مالک ہو یا اس پر کام کرنے والا کوئی ہاری۔۔۔

غریب ہاریوں کو ان زمین کے ٹکڑوں سے بہت محبت ہوتی ہے، جہاں ان کی تمام جوانی، بچپن یہاں تک کہ بڑھاپا گزرا ہوتا ہے۔ زمین کا وہ حصہ چاہے چوہدریوں ہی کی جاگیر کیوں نہ

ہو۔مگر ان زمینوں پر کی جانے والی مشقت میں ان ہاریوں کا خون پسینہ اور محنت شامل ہوتی ہے۔ جس کی بدولت ان چوہدریوں کی پتھریلی زمینیں ذرخیز ہو کر اناج اگانے کے قابل ہوتی ہیں۔ چوہدریوں کی زمینوں پر کاشتکاری ہاریوں کا جدی پشتی کام ہوتا ہے۔انہیں اسی زمین سے سال بھر کا اناج حاصل ہوتا ہے۔مگر گاؤں کے ان چوہدریوں کے نزدیک ان ہاریوں کی محنت، جذبات اور زمین سے وابستگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔انہیں فقط اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔اگر وہ پورا پورا نہ ہو تو یہ غریبوں کی زندگیاں اجیرن کر دیتے ہیں۔''اندھیروں کا رقص''ایک محنت کش بابا کرموں کی ایسی ہی کہانی ہے۔ بابا کرموں نے اپنی تمام جوانی چوہدری جمیل کے کھیتوں کی زرخیزی کی نظر کر دی ہوتی ہے۔ وہ اپنی دن رات کی مشقت سے اگائی فصلوں سے چوہدری جمیل کے گوداموں کے منہ بھر دیتا ہے۔ بابا کرموں سال ہا سال سے مشقت کرتے آخر بڑھاپے کی آخری سیڑھی میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ موت کے قریب ہوتا ہے۔اسے اپنی جوان بیٹی کی بہت فکر ہوتی ہے کیوں کہ گاؤں کا چودھری جمیل بوڑھے کرموں کی جوان بیٹی پر نظریں جمائے ہوتا ہے۔ وہ اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ یا اپنی بیٹی کو میری حویلی بھیج دو یا اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اوران زمینوں سے نکل جاؤ۔

بوڑھا بابا کرموا پنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہوتا ہے،مگر گاؤں کا مکار چودھری جمیل اپنی ہوس میں مست ہو کر بابا کرمو کو اپنی زمین خالی کرنے کا کہتا ہے یا بدلے میں اس سے اس کی اکلوتی بیٹی کا مطالبہ کرتا ہے۔ بوڑھا ایک طرف اپنی آخری آرام گاہ اپنے باپ دادا کے قریب بننے کی فکر میں غرق ہو رہا ہوتا ہے،تو دوسری طرف اسے بیٹی کی محبت تڑپا رہی ہوتی ہے۔وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر مجبوراً وہ اپنی بیٹی سے کہتا ہے کہ بیٹی تو اپنے مالک کی حویلی میں چلی جا۔وہ جانتا ہے کہ اس کی بیٹی وہاں سکون سے نہیں رہ سکے گی،اس کی وہاں کوئی عزت نہیں ہوگی۔ مگر وہ بے بس اور مجبور ہوتا ہے کیونکہ اس کی آخری خواہش ہوتی ہے کہ وہ انہیں زمینوں میں اپنے باپ دادا اور بیٹوں کے پاس دفن ہو۔وہ حالت نزع میں اپنے پیاروں سے دور نہیں جانا چاہتا۔اسے گاؤں سے بہت محبت ہوتی ہے۔اسی خواہش کے زیر نظر بابا کرموں کو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اس افسانے میں مفاد پرست، لالچی اور ہوس کے پجاری وڈیروں کی اصل حقیقت

سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ شاطر اور چالاک لوگ معصوم لوگوں سے فائدے حاصل کرتے ہیں۔بابا کرمو بے بسی کے عالم میں اپنی جوان بیٹی سے زمین کا قرض چکانے کے لئے کہتا ہے:

"سنو بیٹا!۔۔۔ہاں۔۔۔ہاں بیٹا۔۔۔۔میں تجھے اجازت دیتا ہوں۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔۔۔وہ یہی چاہتا ہے ناں۔۔۔کہ تم اس کی حویلی میں بیٹھو۔۔۔جھونپڑی خالی کر دو۔۔۔ایک نسل کے بعد ہماری دوسری نسل اس مٹی میں مل گئی۔میں بھی اپنے وجود کی مٹی کو ان کھیتوں میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔میں اپنی ہڈیوں کی کھاد کہیں اور دوسرے کھیتوں میں ڈالوں یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ہاں بیٹا میں اجازت دیتا ہوں۔۔۔اپنے مالک کی حویلی میں جا کر بیٹھ جاؤ، ویسے ہی جیسے وہ بٹھانا چاہے۔۔۔بیوی بنا کر یا۔۔۔" (19)

آج کل ہمارے معاشرے میں پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے غریبوں ہاریوں اور کسانوں کو چودھریوں، زمینداروں، نوابوں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کی طرف سے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ غریبوں کو کسی جانور سے بھی کمتر سمجھتے ہیں۔ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں مہنگائی اور بیروزگاری کے باعث غریب بچوں کو تعلیم وصحت کی سہولیات میسر نہیں ہوتیں۔ یہ پسے ہوئے لوگ مجبوراً اپنی زندگی ان جاگیرداروں کی غلامی میں گزار دیتے ہیں۔ جو کے ان غریبوں پر مظالم ڈھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔غلام فرید کاٹھیا نے پسے ہوئے طبقے کے دیہاتیوں، ہاریوں، کسانوں اور مزارعوں کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔آپ نے اپنے افسانوں میں زندگی کی حقیقتوں کا بہت خوبی سے ادراک کیا ہے۔آپ نے اپنے افسانوں میں جیل کی کوٹھریوں میں مقید لوگوں کی درد بھری داستانوں، اور جھوٹے مقدموں کے ذریعے تمام تر عمر جیل میں گزارنے والے غریبوں کی کہانیاں بیان کی ہیں۔آپ نے جاگیرداروں، سرمایہ داروں، وڈیروں، اور چوہدریوں کے لالچ، ان کے مفاد پرست رویوں اور مکاریوں کا ذکر اپنے

افسانوں میں بہت شاندار انداز سے کیا ہے۔

''چالیس من گندم'' میں بکو کی محنت اور حالات بدلنے کی لگن اس کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ وہ اپنی محنت سے چالیس من گندم تو جمع کر لیتا ہے تاہم اسے جھوٹے مقدمے میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑتا ہے۔ اسی طرح غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''لمحوں کی قید'' ہاریوں کی مشکلات کی عکاسی کرتا ہے افسانے کے مرکزی کردار شمو کو سائیں جیل بھجوا دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے حالات بدلنا چاہتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں آج کل چوہدریوں، نوابوں، سرمایہ داروں اور وڈیروں کے ہاتھوں غریبوں کا بری طرح استحصال ہوتا ہے۔ غریبوں کی عورتوں کی عزتیں محفوظ نہیں، انہیں روزگار کے مواقعے حاصل نہیں، مہنگائی کے سبب ان کے گھروں کا نظام بری طرح متاثر نظر آتا ہے۔ اگر کسی غریب کی بیٹی کی شادی ہو، اس کی برادری میں کوئی وفات پا جائے، اچانک کوئی ہنگامی آفت اس کے خاندان پر ٹوٹ پڑے یا قرضے کا بوجھ اسے جکڑ لے تو بیچارے دیہاڑی دار کے لیے معاشرے میں جینا مشکل ہو جاتا ہے۔

غریب اپنی صحت اور علاج معالجے کے حوالے سے بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ وہ پرائیویٹ ہسپتالوں میں بڑی بیماریوں کا علاج کروا سکے، جس کی وجہ سے اسے معمولی کلینکوں سے ادویات خریدنا پڑتی ہیں جو کہ تھوڑے عرصے کے لیے تو افاقہ دیتی ہیں تاہم اندر ہی اندر ناسور کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور بلا آخر موت کا سبب بنتی ہیں۔

غریب کے بچے تعلیم سے محروم رہتے ہیں، کیونکہ مشکل سے دو وقت کی روٹی کھانے والے دیہاڑی دار کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کا مہنگے سکولوں میں داخلہ کروا سکے۔ اگر کوئی بچہ مشکلوں سے پڑھ لکھ بھی جائے تو اسے نوکری نہیں ملتی۔ کیونکہ ہمارے ہاں کرپشن کا بازار گرم ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں جاگیرداروں، وڈیروں، چوہدریوں اور نوابوں کے ہاتھوں مزارعوں اور ہاریوں کے مسائل، کسانوں کے استحصال اور کمزوروں پر ظلم کو موضوع بنایا ہے۔ آپ کے افسانے حقیقت سے قریب اور زندگی کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔مصاحبہ مہر غلام فرید کاٹھیا، 4 مئی 2022ء بمقام رہائش، مہر غلام فرید کاٹھیا، واقع جامع فریدیہ روڈ ساہیوال

2۔مصاحبہ مہر غلام فرید کاٹھیا، 4 مئی 2022ء بمقام رہائش، مہر غلام فرید کاٹھیا، واقع جامع فریدیہ روڈ ساہیوال

3۔مصاحبہ مہر غلام فرید کاٹھیا، 4 مئی 2022ء بمقام رہائش، مہر غلام فرید کاٹھیا، واقع جامع فریدیہ روڈ ساہیوال

4۔مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، گنجی بار پبلشرز، ساہیوال، 2008ء، ص:104

5۔مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:99

6۔مہر غلام فرید کاٹھیا، سفید تتلیوں کا ہار، بک ہوم، لاہور، 2022، ص:93

7۔مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:116

8۔ایضاً ص:110

9۔ایضاً ص:130

10۔مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کیقید، گنجی بار پبلشرز، ساہیوال، 2008ء، ص:22

11۔مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کیقید، ص:27

12۔مہر غلامفرید کاٹھیا، سفید تتلیوں کا ہار، بک ہوم، لاہور، 2022ء، ص:70

13۔مہر غلامفرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:118

14۔مہر غلامفرید کاٹھیا، سفید تتلیوں کا ہار، ص:30

15۔غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:76

16۔غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، گنجی بار پبلشرز، ساہیوال، 2008ء ،ص:53

17۔غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:53

18۔غلام فرید کاٹھیا، سرسوں کے پھول، بک ہوم لاہور، 2016ء ،ص:57

19۔غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:135

☆☆☆☆☆☆☆

شاہد رضوان کے افسانے

(موضوعاتی مطالعہ)

شاہد رضوان افسانے کی روایت سے جڑا ایک ایسا افسانہ نگار ہے جس کے ہاں استعاراتی اور نیم علاقائی کیفیات بھی ٹھوس ماحول میں سیال کی صورت بہتی نظر آتی ہیں۔ان کے افسانوی موضوعات ہمارے معاشرے ہی سے جنم لیتے ہیں اور جس تنہائی اور بے کسی کے دور سے ہم گزر رہے ہیں اس کی جھلکیاں ان کی کہانیوں میں جا بجا ملتی ہیں۔ان کے اسلوب میں روانی اور افسانہ لکھنے کا سلیقہ موجود ہے۔ان کے افسانوں کے انتساب ہی سے ان کی راہوں کی شد بد ہو جاتی ہے۔

منٹو جیسے عظیم افسانہ نگار کا پیرو افسانے کے اندرونی نظم وضبط سے کیسے بے خبر ہو سکتا ہے؟ شاعر ہونے کے ناطے وہ الفاظ کے استعمال اور ان کی موسیقانہ لہروں سے کیونکر کام نہیں لے سکتا۔ یہ تمام تر خوبیاں ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔شاہد رضوان ملک کے ابھرتے ہوئے ان افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کے افسانوں کے موضوعات میں خاصا تنوع ہے۔ان کے افسانوں میں حب الوطنی کے جذبات ،اپنوں کے کھونے کا غم ،خوشیوں کا احساس ،زندگی کا کرب ،عورت کی معاشرتی مجبوریاں ،محبت کی پسپائی ،ستم ظریفی ،جنسی رویہ ،تہذیبی رکھ رکھاؤ ،حتیٰ کہ زندگی کا ہر رخ اور ہر پہلو ملتا ہے۔ان کے افسانوں میں جدید معاشرت بولتی دکھائی دیتی ہے۔

شاہد رضوان کے شعور میں اچھائی اور برائی کے خانے بڑے واضح رنگ میں منقسم دکھائی دیتے ہیں مگر وہ اپنے قارئین کو کسی تلقین کے ذریعے قائل نہیں کرتا بلکہ انہیں باتوں میں لگا لیتا ہے۔ یوں وہ ان کی معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو اپنی مطلوبہ وادیوں میں لے جاتا ہے۔وہ کہانی کا اختتام نہیں کرتا بلکہ اسے قاری ہی پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود سوچے اور نتیجہ اخذ کرے۔

شاہد رضوان تفصیلات ،محاکمات اور جزئیات نگاری کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔اس کا بیانیہ ابہام و علامت کی پیچیدگیوں سے پاک مگر سادہ اور مؤثر ہے۔شاہد رضوان نے اپنے گردوپیش کو ایک معمر شخص کی نگاہ سے دیکھا ہے۔وہ زندگی کا گہرا مشاہدہ رکھتا ہے۔اور جب وہ اپنے افسانوں کی مجموعی فضا کو اردگرد کی حقیقی ،سماجی ،سیاسی اور ثقافتی صورتحال کے گرد تشکیل دیتا ہے تو قاری کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی تخلیقی افسانہ پڑھ رہا ہے یا سماج کی بے رحمی کے سچے آئینے اس کے روبرو ہیں۔

شاہد رضوان طبقاتی کشمکش پر بے طرح کڑھتا ہے اور یوں بے اعدالیوں اور نا انصافیوں کی داستانیں اس کی تمام کہانیوں میں جگہ پاتی ہیں۔ان کے افسانوں میں غلام عباس کے افسانوں کا سا پھیلاؤ اور منٹو جیسی جنسی سفا کی کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

شاہد رضوان جدید عہد کا ایک پر اعتماد قلم کار ہے۔وہ حالات حاضرہ اور آج کے انسان کی گنجلک نفسیات کا بخوبی ادراک رکھتا ہے۔اسی باعث ان کی کہانیوں میں دلچسپی کا ایسا عنصر پایا جاتا ہے کہ قاری کہانی شروع کر کے اسے ادھورا نہیں چھوڑ پاتا۔

شاہد رضوان کے افسانوں کے کردار نچلے اور متوسط طبقے کے ہیں۔جو اپنے طبقے اور ماحول کی زبان کی خوب عکاسی کرتے ہیں۔ان کے بعض افسانوں میں نیم علاقائی انداز بھی موجود ہے جو کہانی میں روانی کا تاثر پیدا کرتا ہے۔شاہد رضوان کی اکثر کہانیاں خاص ثقافتی مزاج کی آئینہ دار بھی ہیں۔

شاہد رضوان کے افسانوں کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نظریے سے متاثر نہیں ممکن ہے وہ اپنا کوئی سیاسی یا ادبی نظریہ رکھتا ہو لیکن اپنے افسانوں میں وہ اس کا اظہار نہیں کرتا۔ہاں مگر وہ زندگی کے حقائق کی خوب ترجمانی کرتا ہے اور افسانے کو غیر جانبداری سے زندگی کا ترجمان بنا کر پیش کرتا ہے۔زندگی کی حرارت لیے شاہد رضوان کیا فسانوں کے کردار، قاری سے گفت شنید کرتے ،اپنے دکھ سکھ بانٹتے ،جیتے جاگتے کردار دکھائی دیتے ہیں۔ایک اچھے افسانے میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے ان سب خصائص کا شاہد رضوان کے ہاں پایا جانا ان کی افسانے سے محبت کا ثبوت ہے۔

شاہد رضوان کے اب تک چار افسانوی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں جو ان کی ثابت قدمی اور فکری وفنی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔چودہ افسانوں پر مشتمل شاہد رضوان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پتھر کی عورت'' 2010ء میں چھپا۔چیچہ وطنی سے چھپنے والے اس افسانوی مجموعے میں متوسط طبقے کی عورت کے مختلف روپ بڑی خوبصورتی سے سموئے گئے ہیں۔شاہد رضوان کے دوسرے افسانوی مجموعے میں بھی چودہ افسانے شامل ہیں جو کہ 2013ء میں دانیال پبلشرز چیچہ وطنی سے ''پہلا آدمی'' کے نام چھپا۔شاہد رضوان نے اپنے اس افسانوی مجموعے کو روحانی مرشد اور عظیم افسانہ نگار سعادت حسین منٹو کے نام کیا۔اس افسانے میں شادی شدہ خواتین کی آرزوؤں، مرد کے ہاتھوں بکتی لٹتی عورتوں، ناانصافی کا بازار گرم کرنے والے اعلیٰ عہدوں پر قابض مگرمچھوں اور دہشت گردی وغیرہ جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

شاہد رضوان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''آوازیں'' 2015ء میں سانجھ پبلشرز سے شائع ہوا جو قاری کے لیے اپنے دامن میں کئی رنگ برنگی دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اندر اور باہر کا تضاد کشمکش کی جو صورت پیدا کرتا ہے شاہد رضوان نے اسے بڑی خوبصورتی اور فنی مہارت سے بیان کیا ہے۔ 16 افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کا ہر اک افسانہ ایک سے بڑھ کر ایک کہانی رکھتا ہے۔ ''ادھوری کہانی کی تصویر'' 23 افسانوں پر مشتمل شاہد رضوان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جو 2020ء میں قارئین کے ہاتھوں کی زینت بنا۔

عورت خدا کی خوبصورت ترین مخلوق ہے۔ ''صنف نازک'' پکاری جانے والی یہ عورت صدیوں ہی سے ظلم کی چکی میں پستی چلی آ رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے قبل عرب معاشرے میں ننھی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ عورت وراثت سے محروم کر دی جاتی، باپ کی وفات کے بعد، ماں بیٹے کی جاگیر میں دے دی جاتی، عورتیں بازار میں سرعام کنیزیں اور باندیاں بنا کر بیچی جاتی تھیں۔ زنا اور ظلم و زیادتی کا نشانہ بنتی یہ عورتیں پاؤں کے جوتے کے برابر بھی عزت نہ پاتیں۔ غرض عورت ہر لحاظ سے تکالیف کا سامنا کرتی۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد یہی عورت عزت تکریم کی حق دار قرار پائی۔ دین اسلام نے عورت کو وہ مقدس مقام عطا کیا جو اسے دنیا کے کسی اور مذہب یا مسلک نے نہیں دیا۔

عورت کے ماں ہونے پر جنت کو اس کے قدموں تلے قرار دیا گیا۔ اگر یہ بیٹی یا بہن کے روپ میں ہے تو بھائیوں کو اس کا محافظ قرار دیا گیا۔ بالغ ہونے پر اچھی اور مناسب جگہ رشتہ کرنے، بہتر تعلیم اور دین سکھانے پر رسول اللہ ﷺ کے پڑوس میں جنت کے گھر کی ضمانت دی گئی۔ غرض اسلام نے عورت کو اس کا اصل مقام دلوایا۔ مگر جب ہم اپنے دین، مذہب اسلام، اپنی روایات اور انسانیت سے دور ہوئے تو شیطانیت، جہالت، ہوس اور لالچ نے ہمارے ہاں ڈیرے جما لیے تو عورت کبھی بازار کی زینت بنی تو کبھی آزادی کے نام پر خود ہی اپنے ہاتھوں سولی پر چڑھی۔ کہیں سجنا، سنورنا، بچے پیدا کرنا اور گھر کے کام کاج میں مصروف رہنا، زندگی کے سنجیدہ، سماجی، معاشی اور معاشرتی معاملات سے دور رکھنا اس کا مقدر بنا۔ کہیں عورت کو سسرالی رشتوں اور بندھنوں کی زنجیروں میں جکڑا گیا تو کہیں بے اولادی کا طعنہ دے کر گھر سے بے دخل کر دیا گیا۔

پاکستان جیسے ملک میں گھریلو حالات، تنگ دستی، غربت، مہنگائی اور محرومیوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر عورت اگر کہیں باہر ملازمت کے لیے نکلتی ہے تو اول تو اسے بدکردار کہا جاتا ہے۔ عورت

کے لیے آج کل ملازمت حاصل کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ بدقسمتی سے ''مردوں کا معاشرہ'' بن کر مرد کی حاکمیت اور جنسی تفریق کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندوؤں کے رسوم کی پیروی، کم علمی، دین سے دوری اور جہالت کے باعث آج خودکشیوں، طلاقوں، جنسی و اجتمائی ظلم و زیادتیوں اور تشدد وغیرہ جیسے مسائل عورت کے لیے بہت بڑھ گئے ہیں۔ کہنے کو تو ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں مگر اکیسویں صدی میں بھی پاکستان میں اب تک کاروکاری، وٹہ سٹہ، اور ونی جیسی جاہلانہ رسوم عروج پر ہیں۔ راہ چلتی عورتوں پر آوازیں کسنا، ان کا مذاق اڑانا، تضحیک آمیز گفتگو، برے القابات سے پکارنا، سوشل میڈیا پر ان کی تذلیل، بلیک میلنگ اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ مطلب آج بھی اسی دور جہالت کے پیروکار موجود ہیں۔ آج کسی بہن کے ساتھ اگر ظلم و جبر یا زیادتی ہو رہی ہو تو بھائی بجائے مجرم کو سزا دینے کے بہن کو غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عورت کا اغواء، گھر اور گھر کے باہر عدم تحفظ، آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ، زنا بالجبر، جبری مشقت، زبردستی قرآن سے نکاح، وٹہ سٹہ، بڑی عمر کے مرد سے کم عمری کی شادی، تعلیم اور علم سے محرومی جیسے مسائل بھی ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ آج عورت خود طلاق نہیں لے سکتی، پسند کی شادی کا مطالبہ اس کی بے باکی اور بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ عورت پر اگر خاوند ظلم کرتا ہے تو وہ اس کے ظلم کی شکایت نہیں کر سکتی، اگر وہ وراثت میں حصہ مانگے تو بھائی اس سے رشتہ ناطہ توڑ کر اس پر لالچی، بدلحاظ تو کبھی فاکشہ جیسے الزامات لگا دیتے ہیں۔

عورت کا جنسی و ذہنی استحصال، بے وفائی کے طعنے، محبت میں ناکامی، مرد کا دوسری شادی یا روزگار کے سلسلے میں بیرون ملک چلے جانا اور مندرجہ بالا تمام مسائل پر آواز بلند کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ظلم و بربریت کا خاتمہ کر کے عورت کو اس کے بنیادی حقوق فراہم کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ یہ تمام وہ مسائل ہیں جو آج ہمارے معاشرے میں بہت عام ہو چکے ہیں۔ عورت کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ایسے میں انصاف کے ادارے بھی خاموش ہیں۔ اس صورتحال میں عورت کے مسائل چاہے پھر وہ جنسی ہوں یا معاشی، معاشرتی ہوں یا سیاسی، عورت امیر گھرانے سے ہو یا متوسط طبقے سے یا پھر دو وقت کی روٹی تک کو ترستی غربت کا شکار، آواز حق بلند کرنا یا خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنا بڑے ہی جی جان اور جگرے کا کام ہے۔

شاہد رضوان ایک ایسا افسانہ نگار ہے کہ جس نے ہمارے معاشرے کے مسائل کو بڑی درد مندی سے اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ شاہد رضوان کی اکثر کہانیاں متوسط طبقے کی عورت کے روپ

دکھاتی ہیں۔ ’’پتھر کی عورت‘‘ کی رضیہ ہو یا چندا کی آنکھوں میں سجے خوشحالی کے سپنے، ’’کتیا‘‘ افسانے میں شگفتہ ’’آوازیں‘‘ میں ’’بانجھ عورت‘‘ کی کنول ہو یا مائی مستانی، آخری سیڑھی کی نیلوفر یہ تمام زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاس ہیں۔ ’’پہلا آدمی‘‘ میں جوگی چوک، یا سفید بال، یا پھر ’’ادھوری کہانی کی تصویر‘‘ میں شاہد رضوان کے افسانے ’’غارت گر لمحہ‘‘ ’’دجال‘‘ ’’ٹھیکے دار‘‘ ’’ٹرمینل‘‘ اور ’’تارکول کی سڑک ‘‘ ایسے افسانے (ایسی شاندار کہانیاں) ہیں جو کہ تانیثی حوالے سے بڑے ہی اعلیٰ پائے کے ہیں۔

غرض شاہد رضوان نے تعلیمی ادارے کی طالبات سے لے کر گھریلو ظلم کا شکار عورتوں، نو بیاہی دلہنوں، باہر محنت مزدوری کرتی خواتین، کنواری لڑکیوں کو درپیش مسائل اور پدرسری معاشرے کی سماجی گھٹن سے تنگ خواتین، غرض عورت کسی بھی عمر اور شعبے سے تعلق رکھنے والی ہو، غلام فرید کاٹھیا نے ہر اک کے مسائل کو بڑی خوبی سے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کی مرد اور عورت انسانی زندگی کے دو پہیے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن ہی نہیں۔ دونوں میں سے اگر ایک کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو تو زندگی اور کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔

اچھی اور خوشگوار زندگی کے لیے جیون ساتھی سے ذہنی ہم آہنگی ہونے کیساتھ ساتھ اسکا ہم عمر ہونا یا دو چار سال بڑا ہونا ہمارے معاشرے میں اہم تصور کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کسی کم عمر لڑکی کی شادی اپنی عمر سے بڑے مرد سے ہو جائے تو لوگوں کی رائے میں اسکا نباہ مشکل اور کم عرصے تک چلنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ نہ صرف عورت بلکہ مرد کو بھی اس حوالے سے بہت سے معاشرتی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مرد اگر پہلی بیوی کی وفات، نباہ نہ ہو سکنے پر طلاق یا دیگر حالات کے باعث کسی جوان لڑکی یا اپنے سے کم عمر عورت سے نکاح کر لیتا ہے تو اسے کم عقل، ہوس پرست یا عورت کا پجاری جیسے القابات سننا پڑتے ہیں۔ معاشرے میں لوگ انہیں طرح طرح کی باتیں سنا کر انکا سکون سے جینا محال کر دیتے ہیں۔

شاہد رضوان نے بڑی عمر کی شادی اور معاشرے میں اس کے حوالے سے پائے جانے والے شکوک و شبہات اور بدگمانیوں پر بڑی خوبی سے قلم اٹھایا ہے۔ ’’پتھر کی عورت‘‘ مجموعے میں بڑے میاں (اسلم) اور فائزہ کی ایسی ہی کہانی بیان کی گئی ہے کہ جب فائزہ اپنے باپ کی عمر کے مرد میاں جی اسلم سے شادی کر لیتی ہے تو اس کی اپنی ہی دوست ’’الفت‘‘ اسے اس حولے سے چھیڑتی ہے۔

’’وہ فائزہ کو بڑے میاں کی دلہن کہہ کر چھیڑ رہی تھی، وہ مجھے بہت چاہتے
ہیں، نظر نہ لگا دینا، فائزہ نے باہنوں کے کلاوے سے نکلتے ہوئے کہا۔ تم

مجھے بہت یاد آتی ہو۔تم کو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔بس وقت ہی نہیں ملتا، وہ دو پل بھی تو مجھے اپنی آنکھوں سے دور نہیں ہونے دیتے۔اس کی انکھوں میں چمک اور لہجے میں شوخی تھی۔پھر تو ضرور تم پر شک کرتے ہوں گے۔''(1)

عورت خدا کی خوبصورت ترین مخلوق ہے۔حسن وخوبصورتی کے ساتھ ساتھ اگر حیا اور معصومیت بھی اس میں موجود ہوں تو وہ بہت جلد ہر ایک کی آنکھ کا تارہ بن جاتی ہے۔سراہا جانا اور عورت کی تعریف ودلجوئی اسے مزید نکھار دیتی ہے۔عورت کی اسی کمزوری سے مرد ذات ہمیشہ اس کا فائدہ اٹھاتی ہے۔مرد،عورت کو کبھی پیار، محبت اور کبھی حیلے بہانے سے غلط کام کی طرف اکساتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مرد نے عورت کو ہمیشہ ہی سے اپنی ہوس اور جنسی مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔مرد اسے سبز باغ، اچھی زندگی کا راستہ دکھاتا ہے اور پھر اسے جسمانی طور پر استعمال کرتا ہے اور اگر ایسے میں کسی عورت کا حمل ٹھہر جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ مرد اپنی غلطی تسلیم کرے یا اپنے اس جرم کا اقرار کر کے عورت کو معاشرتی عزت ومقام دلوانے کی خاطر اس عورت سے شادی کرے اور اسے اپنا لے لیکن اس وقت مرد ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ کہتے ہیں ہمارے تو ماں باپ نہیں مانتے ،لوگ کیا کہیں گے؟ معاشرہ کیا کہے گا؟ حالات اجازت نہیں دیتے، میں تو پہلے سے شادی شدہ ہوں، میری تو پہلے سے منگنی ہو چکی ہے۔میں تو اب تم سے نکاح یا شادی نہیں کر سکتا، تم شادی کی بات کر کے غلط کر رہی ہو، اب عزت بچانے، گھر والوں، معاشرے کے ساتھ رہنے کا ایک ہی حل ہے۔آپ یہ طریقہ اپناؤ کہ آپ اس حمل کو ضائع کر دو۔مگر کیا ایسا کرنے والے کسی مرد نے کبھی یہ سوچا کہ جس حمل کو وہ ضائع کرنے کا مشورہ دے رہا ہے، کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے؟ مگر نہیں، مرد یہ سارے غلط کام اپنے مفاد کے لیے کرتا ہے اور فائدے کے لیے یک دم اپنی سوچ اور زاویہ بدل لیتا ہے۔یعنی جب کہیں عیاشی کا ذکر آتا ہے تو تب مرد سارا کچھ بھول جاتا ہے اور آخر پر قربانی ہمیشہ عورت کو ہی دینا پڑتی ہے۔

اس لیے عورت کو یہ چاہیے کہ وہ مرد کی چالاکیوں میں نہ آئے، اپنی عزت کو عصمت کو بچا کر رکھے، کیونکہ ہمارے ملک پاکستان اور اس مشرقی معاشرے میں اگر کوئی لڑکا زنا کرتا پکڑا جاتا ہے تو اس کو کچھ بھی نہیں کہا جاتا اور یہ کہہ کر کہ ''یہ مرد ہے تو چلو چھوڑو''، ''عمر ہی ایسی ہے نادانی میں ہو گیا''، سب بھلا دیا جاتا ہے۔جبکہ اس کے برعکس اگر کوئی عورت لڑکی اس قسم کا کوئی جرم کرتی پکڑی جاتی ہے تو ساری عمر اپنے ماں باپ کے در پر بیٹھی رہتی ہے اور کوئی اس سے شادی تک کرنے کرنے کے لیے

تیارنہیں ہوتا۔ جہاں ہم ایسے دوہرے معیاروں والے معاشرے میں رہتے ہیں، وہیں افسانہ نگار نے یہ ایک اہم موضوع اٹھایاہے،سماج کی ہر برائی آشکار کر کے شاہد رضوان نے یہ سبق سکھایاہے کہ عورتوں کوان سب باتوں کا علم ہونا چاہیے کہ مردوں کی ان چکنی چپڑی اور میٹھی باتوں میں نہیں آنا چاہیے کیونکہ عورت کا دامن کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے جوایک بارمیلا ہو جائے تو پھر دوبارہ ویسانہیں رہتا۔فائزہ اورعدنان کے مکالمے کے ذریعے معاشرے کی اسی سنگ دلی اوردلخراش حقیقت کو بتایا گیا ہے۔

> ’’تم مرد بھی بڑے مطلبی ہوتے ہو!اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے،ایک عورت کوجہنم کا ایندھن تو بنا سکتے ہولیکن معاشرے میں ناک کٹنے کے ڈر سے اپنے گناہ کوقبول نہیں کرتے ہو،تم اپنی ناک تو بچا لیتے ہو،مگرعورت۔۔۔جب تم گناہ کرتے ہو۔تو تمھیں ڈرنہیں لگتا۔۔شرم نہیں آتی،سوسائٹی کا خیال نہیں رہتا۔۔۔لیکن جب اس گناہ کا اقرار کرنا پڑجائے توراستہ بدل لیتے ہو۔تم عورت سے قربانی تو لے سکتے ہومگرعورت کی خاطر سماج سے لڑنہیں سکتے ہو۔تمہاری ناک کٹتی ہے۔۔۔جان جاتی ہے۔تم نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ۔۔۔گرادو۔‘‘(2)

مرد نے اکثرمحبت کے نام پرعورت کا جنسی استحصال کیا ہے۔عورت کی قربت پانے کے لیے مردحیلوں،بہانوں سے توکبھی شاندار مستقبل کے خواب دکھا کرعورت کواپنے جال میں پھنساتا ہے۔عورت کی محبت سے فائدہ اٹھانے کے بعد،وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا ہے اورعورت بیچاری حیرت سے آنسو بہاتی رہتی ہے۔ پہلے پہل تو وہ یقین ہی نہیں کر پاتی مگر بعد میں وہ اپنی اس محبت کی ناکامی کا بدلہ زندگی بھر کے لیے مردوں پراعتبار نہ کر کے چکاتی ہے۔بعض بے چاری عورتیں ذہنی مریض اورشدید ڈپریشن کی کیفیت میں چلی جاتی ہیں۔مرد چونکہ پہلے ہی سے اپنے تمام حالات سے واقف ہوتا ہے۔وہ شادی شدہ یااس کی منگنی پہلے سے ہی کہیں طے پا چکی ہوتی ہے،ان سب باتوں اور حالات کی نزاکتوں کواچھی طرح جاننے کے باوجودوہ عورت کومتواتر بیوقوف بناتا رہتا ہے۔مردوں کوچاہیے کہ وہ باہرمنہ نہ ماریں بلکہ دینی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق شرافت سے زندگی گزاریں اوراگرکبھی وہ بھول چوک یاجذبات کی رومیں بہہ کرکسی کے ساتھ زیادتی کر بیٹھتے ہیں یا عورت کوسبز باغ دکھا چکے ہیں توانہیں چاہیے کہ وہ چاہے ماں باپ کوچھوڑ دیں مگراپنی خطا کو مانتے ہوئے اس عورت کواپنائیں۔بعض اوقات بچپن کی منگنیاں بھی ہمارے ہاں بڑے مسائل پیدا کرتیں ہیں۔لڑکی لڑکاکسی اورکوپسند کرتے ہیں،مگران کی بچپن کی منگنی یاان کے ماں باپ کی خواہش اس سب

کے آڑے آ جاتی ہے اور وہ پہلے سے طے کردہ نسبت کی وجہ سے مجبور ہو جاتے ہیں اور پسند کی بجائے انہیں کہیں اور شادی کرنا پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنی ہم آہنگی نہیں بن پاتی بلکہ وہ صرف ایک سمجھوتے کے تحت زندگی گزارتے ہیں اور ساری عمر ان میں میاں بیوی والا (Commitment) مثالی ماحول نہیں بن پاتا۔ یوں طلاق و علیحدگی کی شرح میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ فائزہ اور عدنان کی ایسی ہی گفتگو کو شاہد رضوان نے یوں بیان کیا ہے:

> ''اس سے پہلے تو تم نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ فائزہ نے معصومیت سے ہمدردی جگاتے ہوئے کہا۔ کبھی موقع ہی نہیں ملا، مختصر سا جواب دے کر اس نے چپ سادھ لی تھی۔ بات سیدھی سی ہے تم مجھ سے نکاح کر لو یا میں کسی اور سے۔۔۔'' (3)

نکاح ایک بڑا ہی مقدس رشتہ ہے۔ میاں بیوی نکاح کے اقرار کے ساتھ ہی اپنے اپنے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور الفت رکھنے لگتے ہیں۔ شادی رشتہ ہی ایسا ہے کہ جس کے ذریعے عورت معاشرے میں فخر سے سر اٹھا کر جیتی ہے۔

اس کا مرد اس کے لیے محافظ اور کل کائنات ہوتا ہے۔ یہ خوبصورت رشتہ جہاں مضبوط اور اک دوسرے کے دکھ، سکھ کا ساتھی ہوتا ہے۔ وہیں ذرا سا شک، عزت واحترام میں کمی یا چھوٹی سی بات بھی بعض اوقات برسوں کی رفاقت کے درمیان لمحوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں۔ دو پیار کرنے والے اور عمر بھر ساتھ کے وعدے کرنے والے پل بھر میں اجنبی ہو جاتے ہیں۔ جبکہ عورت اگر فرمانبرداری کرے ہر دکھ درد کی ساتھی بن کر خوش اخلاقی اور شکر سے مرد کی اطاعت کرے تو پتھر دل مرد بھی نرم پڑ جاتا ہے۔ مگر بعض کم عقل اور بد دماغ خواتین دوسروں سے حسد اور شک میں پڑ کر اپنے ہی ہنستے بستے گھر کو اجاڑ لیتی ہیں۔ شوہر اگر کسی کام کی غرض سے بھی کسی خاتون سے بات کرے تو وہ بات کا بتنگڑ بنا کر اس محترمہ کو اپنے ہی شوہر کی دوسری بیگم ثابت کرنے پر تل جاتی ہیں۔

شک اور حسد ایک ایسی آگ ہیں جو نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی اندر تک کھا جاتا ہے۔ اس کے پاس یہ ہے تو میرے پاس کیوں نہیں؟ مجھے فلاں جیسا بننا ہے یہ دولت، حسن اس کے پاس ہے میرے پاس کیوں نہیں۔ چھینا جھپٹی اور لالچ رشتوں کی خوبصورتی کو ماند کر دیتا ہے۔ بدلے کی آگ ہر ایک کی خوشیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرد عورت کا استحصال کرتا ہے یہ بات اپنی جگہ درست مگر آجکل عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ عورت ہی مرد کی دوسری شادی نہیں ہونے دیتی۔ نند اور ساس کے روپ میں عورت ہی جہیز نہ لانے پر عورت کو باتیں سناتی

ہے، اولاد نہ ہونے کا طعنہ عورت (ساس) کی طرف سے دیا جاتا ہے۔طلاق دلوانے میں بھی مرد کی ماں یا دوسری عورت ہی کی ہلاشیری اور پریشر شامل ہوتا ہے۔اس سب میں اکثر عورتیں ہی عورتوں کو بدکردار ثابت کرنے پر تلی ہوتی ہیں۔غرض یہ کہ اپنے لالچ، بدلے کی آگ اور حسد دل میں لے کر عورت ہی عورت کو برباد کرتی ہے۔یہ ہمارے معاشرے کا ایک اہم پہلو ہے اور شاہد رضوان نے بڑی خوبصورتی سے اس پر قلم اٹھایا ہے:

"تم میرے شوہر کی رکھیل ہو!۔۔۔علینا نے اسے للکارا۔۔۔تم میرے بھائی کی رکھیل۔۔۔مہک نے جوابی حملہ کیا۔۔۔تم بے شرم ہو۔۔۔ میں نہیں تم بے شرم ہو،تم بے حیا ہو۔۔۔میں نہیں تم بے حیا ہو۔۔۔ خوب بازار گرم ہوا،تم نے میرا گھر برباد کیا۔۔۔تم کیسی عورت ہو؟علینا غرائی۔۔۔اگر تم میں ذرا بھی عورت پن ہو۔۔۔تو تیرا شوہر میرے پاس کیوں آئے۔۔۔؟"(4)

جب اولاد جوان ہو جائے تو والدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ جلد سے جلد ان کے جوڑ کا رشتہ ڈھونڈ کر ان کا نکاح کر دیں۔کیونکہ یہ ان کی شرعی ذمہ داری ہے۔اولاد کے شادی کی عمر میں پہنچ جانے کے بعد اگر والدین بغیر کسی خاص عذر یا رسم و رواج کی وجہ سے ان کی شادی میں تاخیر کریں اور اس وجہ سے وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں تو والدین پر بھی اس کا وبال آئے گا۔حدیث کے مفہوم کے مطابق ”جس کے ہاں بچہ پیدا ہو اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے بالغ ہونے پر اس کی شادی کرے۔اگر شادی نہیں کی اور اگر اولاد نے کوئی گناہ کر لیا تو باپ اس جرم میں شریک ہوگا اور گناہ گار ہوگا۔“ ہمارے مشرقی معاشرے میں تو بیٹیوں کی شادی میں اکثر اوقات اس لیے تاخیر کی جاتی ہے کہ بھئی لڑکا ابھی کماتا کچھ نہیں اس لیے اس کی شادی نہیں کرنی مگر اکثر بچاری بیٹیوں کو جہیز نہ ہونے، لڑکے کا غریب، کم پڑھے لکھے ہونے، لڑکی کا قد کاٹھ چھوٹا ہے، آپکی بیٹی کچھ سانولی سی ہے جیسی وجوہات کی بنا پر عمر بھر کنوارا ہی رہنا پڑتا ہے۔مناسب وقت رشتہ نہ دیکھنے کے باعث لڑکی کی عمر بڑھ جاتی ہے اور پھر اس سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ان سب میں وہ اپنی ہم عمر دوستوں سے انکی شادی خوشگوار نجی زندگی کے رومانوی قصے، لوگوں کے طعنے سن کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔بعض اوقات ماں کے اس دنیا سے چلے جانے، بڑی بہنوں کے بیاہے جانے یا گھر میں صرف مردوں ہی کے رہ جانے کے باعث بھی بیٹی کی شادی کی طرف دھیان نہیں جاتا۔اس سب کی وجہ سے اکثر لڑکیاں ڈیپریشن اور بیماریوں وغیرہ کا شکار ہو جاتیں ہیں۔ان سب میں اڑوس پڑوس، جاننے

ملنے والوں کے سوالات اسے بے چین کیے رکھتے ہیں، جو اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔

ماں اور بیٹی کا رشتہ اک ایسا انمول بندھن ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ بیٹی کے چہرے سے اسکی اندرونی کیفیت کا اندازہ کر لینا، اسکی ہنسی، اسکی آنکھوں کے پیچھے چھپے درد کو پڑھ لینا، بیٹی کا ہر درد ہر تکلیف اپنے دامن میں سمیٹ لینا، ہر قدم پر اسکے لیے پناہ بن جانا۔ بیٹی کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا اپنی استطاعت سے بڑھ کر خیال رکھنا ماں کے سوا بھلا کون کر سکتا ہے۔ ماں ہی ہوتی ہے جو سہیلی بن کر اولاد خصوصاً بیٹی کو اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ بیٹی کے جوان ہونے پر ماں کو ہی سب سے زیادہ اسے عزت سے رخصت کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ باپ اور بھائی تو روزگار و معاش میں مصروف ہو جاتے ہیں مگر ماں ہی ہوتی ہے کہ جیسے بیٹی کا سب سے زیادہ خیال ہوتا ہے۔ ممتا کا پیار رکھنے والی ماں اگر اس دنیا سے چلی جائے تو بیٹیاں بہت تنہا رہ جاتیں ہیں، ان کی دلجوئی کرنے، خیال کرنے والا کوئی نہیں رہتا۔ وہ ساری زندگی کنواری پڑی رہتی ہیں۔ مناسب عمر پر اچھی جگہ رشتہ آجکل ہمارے مشرقی معاشرے کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ شاہد رضوان جیسے افسانہ نگار نے اس موضوع پر بڑی خوبی سے قلم اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ والدین کو چاہیے کہ وہ بالغ ہونے کے بعد جلد ہی مناسب عمر میں اولاد کی شادی کر دیں۔

''وہ اپنی سہیلی کی نسبت بہت خوبصورت تھی، لیکن گھر میں کبھی اس کی شادی کا تذکرہ نہ ہوا تھا۔ پھر وہ اپنی ماں کی تصویر کو دیکھنے لگی، جو بہت جلد اسے بیاہ دینے کے حق میں تھی، اگر اس کی ماں زندہ ہوتی، تو کم از کم اس کی منگنی ضرور ہو گئی ہوتی، وہ اپنی ماں کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ رات گئے تک جاگنا، دوپہر کو اٹھنا، دفتر چلے جانا، بھائی کو اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ باپ کو چوبیس گھنٹے پیسے کمانے کی فکر ہلکان کیے رکھتی تھی۔ باپ سے صرف ناشتے اور ڈنر پر ملاقات ہوتی، دوپہر کا کھانا وہ باہر، اور وہ گھر میں کھاتی، وہ اتنے بڑے گھر میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔''(5)

اولاد ماں باپ کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ جنہیں یہ حاصل ہو جائے ان کے لیے ان کی زندگی ایک نیا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ خوشیاں ان کے دروازے پر دستک دینے لگتی ہیں۔ بچوں کی ننھی شرارتیں، مسکراہٹیں اور چمکتی آنکھیں دیکھ کر اپنے سبھی دکھ درد چند لمحوں میں ہی بھول جاتے ہیں۔ اولاد ہمیشہ سے ہی انسان کی کمزوری رہی ہے۔ جس کی اولاد نہ ہو اس انسان کی زندگی اجیرن ہو

جاتی ہے۔جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی وہ اپنے آپ کو بڑھاپے میں سہارے کے بغیر اور بدقسمت سمجھتے ہیں۔اولاد کی خواہش اور گھر کے آنگن میں بچوں کی توتلی زبان میں باتیں سننا والدین کی بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔بے اولاد جوڑے اولاد کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ہمارے مشرقی معاشرے میں اولاد کے حوالے سے بڑا طعنہ تو عورت ہی کو سننا پڑتا ہے۔تُو بانجھ ہے، دیکھو تمھاری بیوی تمھیں ایک بچہ تک نہ دے سکی،ساس کی باتیں الگ کہ بہو مجھے بس اب اپنے وارث کا وارث اپنا پوتا چاہیے۔نندوں، معاشرے کی باتوں اور سوالوں سے تنگ عورت ذہنی اذیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ زمانے بھر کی چبھتی نشتر جیسی تلخ باتیں اور پھر شوہر کا عجیب رویہ عورت کو اندر تک توڑ کر رکھ دیتا ہے۔یہ معاشرہ اسے کسی صورت جینے نہیں دیتا۔اپنے وجود کو ادھورا سمجھ لینے والی عورت ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر بچہ گود لینے کا سوچنے لگتی ہے۔مگر یہاں بھی اسے بہت سے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کہ بچہ کس کا ہے؟ یہ کسی کے گناہوں کی سزا تو نہیں؟ کل کو بچے کو پتہ چل گیا کہ تم اس کی حقیقی ماں نہیں ہو تو وہ تمھیں چھوڑ کر اپنی حقیقی ماں کو ڈھونڈنے نکل جائے گا،اس طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔اک طرف تو بے اولاد جوڑے خصوصاً عورت کے لیے معاشرتی حوالےسے اتنے مسائل اور مشکلات ہیں تو دوسری طرف کچھ ماڈرن خواتین اپنی خوبصورتی اور حسن نہ کھودیں،اس ڈر سے اولاد تک پیدا نہیں کرنا چاہتیں۔ یوں وہ ساری عمر جوان رہنے کے چکروں میں زندگی بھر بے اولادی کے ساتھ گزاردیتی ہیں۔

آج کل کے مہنگائی کے دور میں شادی ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔ہمارے ہاں شادی دو لوگوں کو ملانے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لیے کی جاتی ہیں۔شادیوں کے لیے مہمانوں کی تواضع میں مختلف ڈشز اور طرح طرح کے میٹھے پکوان درکار ہوتے ہیں۔بہت سارا پیسہ ہو تو شادی ممکن ہوتی ہے۔بیٹی کے لیے بہت سارا جہیز،ٹرک بھر کر سامان،لڑکے والوں کی طرف سے گاڑی،سونا اور لمبی فرمائشوں کی فہرست لڑکی کے ماں باپ کے لیے بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔اسی طرح لڑکے کا اچھا روزگار اور بینک بیلنس دیکھ کر مالی حیثیت کے تعین کے بعد شادی کی جاتی ہے۔

مختصر الفاظ میں آج کل ہم نے شادی بیاہ کو بہت مشکل بنا دیا ہے جس کی بنا پر زنا اور بدکاری بہت آسان اور عام ہوگئی ہے کیونکہ نکاح، بیاہ کے لیے معاشرہ روپیہ، پیسہ،رنگ نسل، ذات پات۔سٹیٹس اور جگہ مانگتا ہے۔فضول رسوم میں پانی کی طرح پیسہ بہایا جاتا ہے جبکہ غلط کاموں کے لیے معاشرہ صرف جگہ اور چند پیسوں کا تقاضہ کرتا ہے۔ہم لوگ بے ضمیر ہو چکے ہیں۔دین سے دوری نے ہمیں گناہوں کے دلدل میں پھنسا کر رکھ دیا ہے۔جس کی وجہ سے بن بیاہی لڑکیاں ہزاروں

ناجائز بچوں کو جنم دے رہی ہیں مرد عورت کا جنسی جسمانی استحصال کرتا ہے۔

چکنی چپڑی اور میٹھی باتوں سے عورت کو مستقبل کے سہانے خواب دکھاتا ہے۔ جھوٹی محبت جتا کر عورت کی عزت لوٹ کر اس کے دامن کو داغدار کر دیتا ہے۔ عورت بیچاری جب اس چند روزہ محبت کے طلسم سے باہر نکلتی ہے تو سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے۔ گناہوں کی نشانی کوکھ میں لیے پھر اس کے پاس سوائے پچھتاوے اور حسرت کے اور کچھ نہیں بچتا۔ معاشرہ، گھر بار اسے اس حال میں بغیر بیاہی ماں کے روپ میں قبول نہیں کرے گا۔ کل کو اس بچے کی وجہ سے وہ بدکار و اور فحاشہ کہلائے گی۔ اس طرح کے بہت سارے سوالوں کی وجہ سے اکثر عورتیں ابارشن یعنی دنیا میں آنے سے پہلے ہی بچے کے قتل جیسے غیر شرعی و غیر معاشرتی کاموں میں ملوث ہو جاتیں ہیں۔ اگر اس عمل میں تاخیر ہو جائے اور عورت کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے تو ایسی عورتیں بچے کو جنم دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

بچے کی پیدائش کے بعد اپنی گناہوں پر پردہ ڈالنے، معاشرے کے لوگوں کے سوالوں سے بچنے کی غرض سے ننھی اور معصوم جانوں کو گندے پانی کے نالوں، گٹروں، کچرا کنڈیوں، ویرانے اور کوڑے کے ڈھیروں میں آوارہ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں اور چیلوں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہی عورت جو 9 ماہ تک بچے کو اپنے پیٹ میں رکھتی، اپنا خون دیتی ہے۔ آخر میں وہی سنگ دل، بے رحم اور سفاک ماں ثابت ہوتی ہے۔ آج کل بڑی تعداد میں بچوں کا کوڑے کے ڈھیروں، بند بوریوں اور ندی نالوں میں پایا جانا ہماری اسلام سے دوری اور گری ہوئی انسانیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہمارے معاشرے میں آج کل اس طرح کے موضوعات کو زیر بحث لانا تو دور کی بات بلکہ کئی اس کے متعلق گفتگو تک نہیں کرتا کیونکہ اگر گناہ کا پول کھلے تو بہت سے نام نہاد شرفاء کو سب کے سامنے ننگا ہونا پڑے گا اور بہت سوں کی جھوٹی عزت کی پگڑیاں پاؤں تلے روندی جائیں گی۔ اس لیے ننھی کلیوں کو رات کے گھپ اندھیروں میں جانوروں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شاہد رضوان ایک ایسا قلم کار ہے جس نے معاشرے میں پائے جانے والے ان ناسوروں پر بڑی ہنرمندی سے قلم اٹھایا ہے۔

> ''پرانے چیتھڑوں میں لپٹے نومولود کو دیکھ کر وہ حیرت سے پسینے میں نہا گیا تھا جیسے اسے کسی نے برف کی پہاڑی میں گاڑ دیا ہو۔ اس نے نومولود کو اٹھانے سے پہلے (جو ابھی تک بلک رہا تھا) تاریکی میں دور تک نظر دوڑائی تو اسے کوئی بشر تو دکھائی نہ دیا البتہ کچھ فاصلے پر دو تین کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو ڈھیر پر سونگھ کر کچھ ٹٹول رہے تھے۔ اس

نے جھٹ سے چیتھڑوں سمیت نومولود بچے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔اگر وہ وقت پر نہ پہنچتا تو کتے اس معصوم کو بھاڑ کھاتے۔وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھا تھا کہ وہ کسی کے باپ کی نشانی ہے۔"(6)

ماں وہ واحد ہستی ہے کہ جس کے قدموں تلے جنت اور جس کی آغوش سکون کا واحد ٹھکانہ ہے۔ایثار و محبت اور صبر و وفا کی بہترین مثال ماں اپنی اولاد کے لیے ہر مشکل سہہ جاتی ہے۔بچوں کو اگر کوئی پریشانی ہو تو اس کا دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔یہی معتبر، شفیق اور بے لوث محبت کرنے والی عظیم ہستی اولاد کو اپنی ممتا کے سائے تلے رکھتی ہے۔یہ ماں ہی ہوتی ہے کہ جو معاشرے کی اصلاح یا بگاڑ کی محرک ہوتی ہے۔اولاد کی پہلی معلّمہ اور بچے کے لیے پہلی درسگاہ ماں کی گود ہی ہوتی ہے۔اگر اپنی ماں اپنی اولاد کی صحیح شرعی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق پرورش کرے گی تو اچھی اولاد پروان چڑھے گی۔نپولین کے مطابق اچھی مائیں اچھی قوم کی ضامن ہیں۔اسی طرح علامہ محمد اقبال کے خیال کے مطابق قوموں کی تاریخ اور ان کے ماضی و حال ان کی ماؤں کا فیض ہوتا ہے۔مائیں اگر اپنے حقیقی کردار کو نبھائیں اور اولاد کو صحیح اور غلط کی تمیز سکھائیں، انہیں ان کی حدود کا احساس دلائیں تو دنیا واقعی ایک جنت بن جائے گی لیکن اگر ماں اولاد کی تربیت ٹھیک سے نہ کر پائے تو معاشرے میں بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں۔

بیٹی ماں کا عکس ہوا کرتی ہے۔ماں جو کرے گی بیٹی خود بخود اس کے نقش قدم پر چلے گی۔کسی ماں نے اگر اپنی جوانی میں اپنے ماں باپ کو دکھ دیئے ہوں تو کہا یہ جاتا ہے کہ مکافاتِ عمل ہے۔ہر اک کا کِیا اسے بھگتنا پڑتا ہے۔اگر اچھی سیرت اور اخلاق حسنہ رکھتی ہے تو وہ اپنی اولاد کے بھی اخلاق سنوار دیتی ہے۔اگر ایسا نہ ہو اور ماں لالچی، حریص، مال و دولت کی پجاری، حلال و حرام کی تمیز نہ کرنے والی، اپنی حدود اور پردے کا احترام نہ کرنیوالی ہو تو یقیناً پھر اس کی بیٹیاں بھی ہاتھ سے نکل کر شُترِ بے مہار کی طرح گلی بازاروں میں کھل عام گھومتی رہتی ہیں جس کے باعث گھر سے باہر رہنا یا گھر سے بھاگ جانے والی برائیاں وجود میں آتی ہیں۔

بیٹیاں بہت نازک اور نا سمجھ ہوتی ہیں۔انہیں اگر ماں کی تربیت اور باپ کی شفقت نہ ملے تو وہ بدلے میں باہر کے لوگوں خاص کر مخالف جنس سے دوستی کر کے جھوٹے مکر و فریب اور جھوٹے پیار کے جھانسے میں آ کر اپنی پاک دامنی و عزت سب گنوا بیٹھتی ہیں۔جو مرد ماں باپ، بہن، بھائی اور معاشرے سے چھپ کر عورت سے تعلق یا رشتہ رکھتا ہے اور عورت کو اس کی عزت کے ساتھ (جس کی

وہ حق دار ہے) سب کے سامنے قبول نہیں کرتا، عورت کی تذلیل کرتا ہے۔ جو لڑکی چھپ کر یا گھر والوں کے منہ پر کالک مل کے گھر سے بھاگ کر شادی کر لیتی ہے پھر وہ ساری زندگی معاشرے کے لوگوں بلکہ خود اپنی ذات سے پچھتاوے کے ساتھ بھاگتی اور پل پل جیتی اور مرتی رہتی ہے۔ ماں، باپ اور بھائیوں کی عزت کا جنازہ نکالنے والیوں کو پھر آنے والی نسلوں تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

گھر سے بھاگ کر کی جانے والی شادی ہمارے مشرقی معاشرے میں تیزی سے عام ہو رہی ہے جو اپنے ساتھ قتل، ناجائز اولاد، ڈپریشن اور شرح طلاق میں اضافے جیسی بہت سی پریشانیوں کے باب کھول رہی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی شادیاں ایک بہت بڑا معاشرتی موضوع بن چکی ہیں۔ ان کی روک تھام کے لیے لوگوں میں اس کے نقصانات سے متعلق شعور بیدار کرنا نہایت ضروری ہے۔ شاہد رضوان نے لڑکیوں کے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے اور بعد میں ان کے والدین پر کیا گزرتی ہے، معاشرے میں وہ کیسے روز جیتے، روز مرتے ہیں جیسے موضوعات پر بڑی ہنر مندی سے بات کی ہے۔

> ’’اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی، چندا کی ماں گڈو کو گود سے دودھ پلاتی سوچ رہی تھی۔ جب اس نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی اس کے والدین کو کتنا دکھ ہوا ہو گا۔ اس کے بھائی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے ہوں گے۔ وہ اپنے ماضی کے دریچوں میں پہنچی تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ فضل پھر اس کی سہیلی حنا کے گھر پہنچا، انکل میرے پاس تو وہ کئی دنوں سے نہیں آئی۔ آج کل اس کا افیئر ایک لڑکے سے چل رہا ہے، شاید اس کے پاس گئی ہو، پتہ کر لیں۔‘‘ (7)

بچے مستقبل میں قوم کے معماروں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر انہیں بچپن ہی سے صحیح تربیت دے دی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک مضبوط اور اچھے معاشرے کے لیے ایک درست بنیاد ڈال دی گئی ہے۔ بچوں کی اچھی اور بہترین تربیت مثالی معاشرے اور شاندار قوم کی ضمانت ہے کیونکہ ایک اچھا پودا ہی مستقبل میں ایک تناور درخت بن سکتا ہے۔ بچے صاف تختی کی طرح ہوتے ہیں۔ آپ اس میں جو لکھیں گے صرف وہی نظر آئے گا۔ بچپن ہی میں اگر بچے کی دینی و اخلاقی قدروں پر مشتمل تربیت و اصلاح ہو تو وہ بالغ ہونے کے بعد بھی اس پر عمل پیرا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر صحیح طریقے کے مطابق بچے کی تعلیم و تربیت نہ ہو سکے تو بلوغت کے بعد زمانے کے لیے بچے سے بھلائی کی کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر بچہ بالغ ہونے کے بعد کسی غلط عمل یا برے اخلاق کا ارتکاب

کرتا پایا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری صرف اور صرف اس کے والدین پر ہی عائد ہوگی کیونکہ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے بچے کی صحیح سے تربیت ورہنمائی نہیں کی۔اولاد کی بہتر اور دینی تربیت والدین کے لیے دنیا کی نیک نامی اور آخرت میں بھی کامرانی کا سبب ہے جبکہ نافرمان اور بدبخت اولاد اپنے والدین کے بے جالاڈ پیار یا ڈانٹ ڈپٹ کی بدولت دنیا میں بھی وبال جان اور آخرت میں بھی رسوائی کا ذریعہ ہوں گے۔والدین خصوصاً جب کسی ایک فرد یا بچے کی تربیت کرتے ہیں تو وہ ایک خاندان، ایک معاشرے اور ایک سوسائٹی کی بھی تربیت کررہے ہوتے ہیں۔اچھی تربیت کے باعث ایک پاکیزہ، بااخلاق، عمدہ وباکردار معاشرے کا قیام عمل میں آتا ہے۔

ماں باپ جب بچے کی ظاہری تربیت کے ساتھ باطنی تربیت بھی کرتے ہیں تو بچے کے دوست احباب، مشاغل وتعلقات، اس کے عقائد اخلاق غرض سب کی درستگی واصلاح رہتی ہے۔ بچے کی ظاہری اور باطنی تربیت والدین کے ہی ذمے ہے۔والدین کے دل میں فطری طور پر بچوں کے لیے نرم گوشہ محبت اور الفت کے جذبات ہوتے ہیں۔انہی احساسات کے باعث ہی ماں باپ بچے کی دیکھ بھال، پرورش وتربیت اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔والدین کے دل میں اولاد کے لیے یہ جذبات ہونے کے ساتھ اگر انہیں اپنی ذہنی واخلاقی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہوتو وہ اپنے فرائض کو اچھی تربیت کے پہلوؤں کے احسن طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

قرآنی آیت کے مفہوم کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جہنم کی آگ سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔والدین کو چاہیے کہ وہ اولاد کو حلال وحرام کی تمیز سکھائیں اور احکام شریعت سکھائیں کیونکہ والدین کی طرف سے اولاد کے لیے اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں کہ وہ اولاد کو اخلاق حسنہ اور بہترین آداب سکھائیں۔بچوں کی تربیت میں کوتاہی کرنا والدین کو قیامت کے روز باز پرس سے نہیں بچاسکے گی۔

والدین کو بچے سے پیار ومحبت اور ڈانٹ ڈپٹ کے معاملے میں اعتدال وتوازن سے کام لینا چاہیے۔اچھائی پر جہاں بچے کی تعریف وشاباش اور تحفے دیئے جاتے ہیں تاکہ اس میں اچھائی کا جذبہ پروان چڑھے، وہیں کسی غلطی پر اچھے انداز سے ٹوکنا اور سمجھانا بھی بہت ضروری ہے تاکہ بچے کو بچپن ہی سے صحیح اور غلط کی تمیز ہوسکے۔اگر بچپن میں غفلت برتی جائے تو بچے کے دل ودماغ میں وہ بات راسخ ہو جاتی ہے۔اس لیے تربیت میں میانہ روی اور اعتدال برتتے ہوئے جہاں نرمی کی ضرورت ہو وہاں نرمی اور جہاں سختی درکار ہو وہاں سختی سے کام لیا جائے۔بچہ اگر کوئی غلط کام کرے، کسی

کے باغ سے پھل یا پھول توڑے تو اسے وہیں پیار سے سمجھایا جائے کہ پوچھے بغیر یا بلا اجازت چیز لینا چوری کے زمرے میں آتا ہے بچے کو شروع ہی سے اگر اچھی تربیت ملے، اچھے برے کی تمیز سکھائی جائے تو نہ صرف معاشرے بلکہ ملک وقوم کے لیے بھی فخر اور راحت کا باعث ہوتا ہے اس کے برعکس اگر والدین بچپن میں اسے اس کی غلطیوں پر ڈانٹنے کی بجائے لاڈ پیار میں اس کی بے جا حمایت کریں، کسی کی گیند اٹھانے، غبارہ پھاڑنے یا کسی کی کھڑکی کا شیشہ توڑنے پر اگر شروع ہی سے بچے کو غلطی کا احساس دلایا جائے، سختی سے تنبیہ کی جائے تو بچہ بڑا ہو کر چور ڈاکو بننے سے رک جاتا ہے۔

ماں اولاد کی تربیت میں سب سے زیادہ کردار ادا کرتی ہے۔ اگر وہی بچے کی برائیوں پر اسے نہ روکے، اسے موقع دے، اس کے لیے جھوٹ بولے تا کہ بچہ مار سے بچ جائے تو وہ اس کو مستقبل میں معاشرے کے لیے ناسور بننے کے لیے تیار کر رہی ہوتی ہے۔

> ''میں معاشرے کے لیے ناسور ہوں۔ میں وہ پھوڑا ہوں جس کا زہر معاشرے کی رگوں میں پھیل رہا ہے۔ میں نقص امن کی علامت ہوں۔ میں خوف و بربریت کا پتلا ہوں س۔ میرے سر کی قیمت تیس لاکھ روپے ہے۔ میں جان چھپاتا پھرتا ہوں۔ پولیس میرے پیچھے باؤلی ہوئی پھرتی ہے۔ آگے سے خاموشی، اس کی آنکھوں نے ایسی برسات لگائی کہ اس کے رخسار بھیگ گئے۔ ماں! وہ پل بھر کو سانس لے کر پھر گویا ہوا، ماں میرے ساتھ بیٹھ کر ٹاٹ کے سکول میں پڑھنے والوں میں سے آج کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی انجینئر، کوئی اکاؤنٹنٹ ہے تو کوئی فوجی افسر، جو سب سے گئے گزرے تھے وہ بھی سکول ٹیچر ہیں۔ ماں! وہ مجھ سے زیادہ ذہین نہ تھے۔ صرف ان کی ماں نے ان کی تربیت صحیح انداز سے کی۔ اچھی چیز دی اور بری سے کوسوں دور رکھا۔ خدانخواستہ اگر ان کی والدین بھی آپ کی طرح۔۔۔ تو وہ سب بھی میری طرح۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔'' (8)

کسی بھی ملک میں امن و امان کا قیام پولیس کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ انصاف کے ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھتے ہوئے قانون و آئین کے تحت شہریوں کو بنیادی حقوق کی فراہمی پولیس کی ذمہ داری ہے۔ اگر پولیس اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے انجام نہیں دیتی تو سمجھ لیجیے کہ وہ پولیس گردی کر رہی ہے۔ جس طرح دہشت گردی ایک برا فعل ہے اسی طرح

پولیس گردی بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔آج کل عوامی خدمت گاری کے نام پر دہشت گردی اورلوٹ مار عام ہے۔معاشرہ پولیس کا نام سنتے ہی خوف وگھبراہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔وردی میں ملبوس افراد میں آج کل بعض کالی بھیڑیں ایسی بھی ہیں جوکہ سارے ادارے کوبدنام کرنے پر تلی ہیں۔

سیاسی مداخلت کے باعث برسراقتدار جماعت کے کہنے پرغلط کی پرواہ کیے بغیرظلم کا بازار گرم ہے۔پولیس فورس میں اصلاحات کے نام پرقوانین تو پاس کیے جاتے ہیں لیکن من وعن عمل ابھی تک نہیں ہوسکا۔کسی غریب کے ساتھ ظلم ہوجائے تو طاقت ور کے خلاف ایف آئی آرتک درج نہیں کی جاتی۔یہ مطلق العنان،امراء کے فرمانبردار،ڈاکوؤں کے نگہبان بن کر اغواکاروں اور منشیات فروشوں کے دست راست کا سا کردار ادا کرتے ہیں۔بھتہ خوروں کے ساتھ مل کرکمزورونا تواں اور غرباءکوڈرادھمکا کراپنے حصے کا کمیشن وصول کیا جاتا ہے۔

بیچارے معصوم لوگ جھوٹے مقدموں میں الجھائے جاتے ہیں۔کسی امیر باپ کی اولاد کوئی قتل یابڑا جرم کربیٹھے تواثرورسوخ استعمال کرکے اسے بچالیا جاتا ہے طاقت کے نشے میں پولیس اپنے فرائض تک بھول جاتی ہے۔محافظ کے لفظ کواستعمال کرکےعوام کے ساتھ درندوں اور وحشیوں والاسلوک کیا جاتا ہے جس کے باعث محافظ لفظ راہزن کے مترادف بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔غریب قتل ہوجائے اورکسی کھاتے پیتے گھرانے کا بیٹا اس کا قاتل ہوتو بجائے اس کے کہ پولیس مجرم کو پکڑے،الٹا مرنے والے غریب کے دوستوں،رشتہ داروں ہی پراس کا مقدمہ ڈال دیا جاتا ہے۔بنا کسی ثبوت کے ملزم کو مارپیٹ کر،الزامات لگا کراور غلطی کا اقرار کرلو ورنہ تمہارے خاندان والوں کوبھی اٹھوالیں گےجیسی دھمکیاں دے کراچھے بھلے شریف بندے کوملزم سے مجرم بنادیا جاتا ہے۔اس کے بوڑھے ماں باپ،،بہن،بھائی دلبرداشتہ ہوجاتے ہیں اور بے گناہ اولاد سلاخوں کے پیچھے ہے کا سوچ کرچلتی پھرتی لاشیں بن کررہ جاتے ہیں۔

پولیس گردی ہمارے معاشرے کا ایک بڑھتا ہوا مسئلہ ہے۔حکمرانوں اور انصاف کے اداروں کواس پرقابو پانا چاہیے۔غریب کی عزت وآبرو بھی اتنی ہی اہم ہونی چاہیے جتنی کہ امیر آدمی کی۔قانون کے سامنے چھوٹا،بڑا،امیر،غریب،حکومتی وسرکاری اہلکاراور عام آدمی سب برابر ہوں تو ملک وقوم اصل میں کامرانی کی راہوں پر چلے گی۔شاہد رضوان ایک ایسا منجھا ہوا افسانہ نگار ہے کہ جس نے دو وقت کی روٹی کمانے اور بچوں پیٹ کی آگ بجھانے والے غریب مزدور کی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ایک عام آدمی پرالزام و پولیس مقدمہ بننے کے

بعد اس کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

> ''یہ سب جھوٹ ہے، یہ من گھڑت کہانی ہے، دلبر اپنے خلاف لگنے والے الزام پر چلایا، تیری ماں۔۔۔تیری بہن۔۔۔ایس ایچ او نے ماں بہن کی گالیاں دیتے ہوئے گھونسوں سے اس کے منہ پر حملہ کر دیا۔ وہ بے چارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بیٹے کی یاد میں رو رو کر نوراں کی آنکھوں کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ کرن کی کچی آنکھیں رو رو کر سوجھ گئیں، ان میں سرخی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ ناصر اور اختر بھائی کی تصویروں سے لپٹ لپٹ کر اپنی اداسیوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ امام دین تو پتھر کی مورتی کی طرح چارپائی پر پڑا رہتا۔ کون آیا؟ کیا ہوا؟ اس نے ایسی باتوں سے چھٹکارا پا لیا تھا۔''(9)

اللہ نے سب انسانوں کو پیدا کیا۔ دنیا کے کاموں اور معاملات کو بہتر طریقے سے چلانے اور ایک دوسرے کی پہچان کے لیے لوگوں کو مختلف قبیلوں، گروہوں، رنگ اور نسل میں تقسیم کر دیا۔ دنیاوی لحاظ سے کوئی امیر تو کوئی غریب، کوئی آقا تو کوئی غلام، کوئی غنی بنا دیا گیا تو کسی کے حصے میں فقیری آئی۔ کسی کے پاس اتنا ہے کہ سمیٹا نہ جا سکے تو کوئی ایسا جو دو وقت تک کی روٹی کو ترستا رہ جائے۔

مقام و مرتبے کی یہ تمیز حکمت خداوندی کے تحت ہی ہے۔ ان درجات کی اونچ نیچ کا مقصد کارجہاں چلانا اور بہتر طریقے سے انسانی ضروریات کی تکمیل کرنا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اعلیٰ مرتبت شخصیت، کم حیثیت یا ملازمین کے ساتھ غیر انسانی رویہ روا رکھیں۔ ماتحت یا نگران ہونا ایک وقتی تعلق ہے ورنہ بحیثیت انسان سب یکساں ہیں۔ وہ لوگ جنھیں زمانے کی گردش ملازمت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، ہمارا پیارا اسلام انہیں بھائی کہہ کر برابری کے حقوق کی تلقین کرتا ہے۔

عرب جیسے معاشرے میں لوگوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ لوگ غلاموں کی طرح بازاروں میں بکتے تھے۔ عورتوں کی کوئی عزت نہ تھی۔ مگر جب آپ ﷺ رحمت اللعالمین بن کر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہ غلاموں والا تصور ختم کر دیا۔ لوگوں نے اللہ کی رضا کے لیے اپنے غلاموں کو راہ خداوندی میں آزاد کر دیا۔ خدمت گاروں کے حقوق متعارف کروائے گئے۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنو ان کو بھی وہی پہناؤ جیسا حکم دیا گیا۔

مگر افسوس صد افسوس آج ہم نے اپنی سب اسلامی روایات بھلا دیں اور غربت کے ہاتھوں مجبور افراد پر جانوروں سے بھی بدتر مظالم ڈھانے لگے۔ گھریلو ملازمین کے ساتھ نازیبا، توہین

اور حقارت آمیز رویہ، جھڑکنا، برا بھلا کہنا اور سخت لہجے میں گفتگو کے ساتھ تشدد بھی آج کل عام ہے۔

ملازمین کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی بہت ضروری ہے لیکن امراء کو اس بات کا احساس تک نہیں، وہ ٹھنڈے کمروں میں گرمیوں میں مزے سے آرام کرتے ہیں جبکہ غریب ٹوٹے پھوٹے کواٹروں میں جہاں نہ بجلی نہ پانی کا بندوبست ہے، رہنے پر مجبور ہیں۔

دو وقت کی روٹی تو دور کی بات انہیں ضروریات زندگی تک میسر نہیں، اگر کوئی بیماری آ جائے تو تو دوا کے لیے پیسہ جیب میں نہ ہونے کے باعث بیچارہ مزدور علاج معالجے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ نومولود بچے کی پیدائش کے بعد بیوی کے لیے خون کی کمی، علاج معالجے تک دستیاب نہیں۔ امیروں کے تو کسی جانور تک کو کچھ بیماری آن پڑے تو مالکان کی جان پر بن جاتی ہے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا جاتا ہے۔ اگر ملک میں علاج ممکن نہ ہو تو باہر سے ڈاکٹروں کو بلوا لیا جاتا ہے۔ امیر پیسے کے نشے میں انسانیت تک سے گر جاتا ہے۔ مختصراً امیروں کو چھینک بھی آ جائے تو ان کا حل کیا جاتا ہے جبکہ غریب کے بچے تو بھوک کے مر جاتے ہیں۔ غریب آدمی کو بات بات پر ذلیل کیا جاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وقت سے قبل تنخواہ نہیں دی جاتی، غرض غریب لوگ غلاموں سے بھی بدتر زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ شاہد رضوان نے غریبوں اور ملازمین کی ان پریشانیوں کی بڑی خوبی سے تصویر کشی کی ہے۔

> ''نومولود بھوک سے بلک بلک کر ہلکان ہوئی جاتی تھی۔ دو وقت سوکھی روٹی ملتی وہ بھی نہ کھاتی، کبھی دودھ پیا نہ گھی کھایا، پھل اسے کہاں ملتا، بچوں کے لیے شجرِ ممنوع تھا۔ دودھ کہاں سے آتا، بچی کے لیے دودھ خریدنا فلک سے تارے توڑنے کے مترادف تھا۔ دودھ پچاس روپے بکتا، کم از کم بچی کے لیے ایک کلو نہ سہی آدھا کلو تو ضروری تھا۔ ایک دن کتا بیمار پڑ گیا۔ چوہدری نے رات پریشانی سے آنکھوں میں کاٹ دی، تین ڈاکٹر بدل لیے کچھ افاقہ نہ ہوا، کتے کے تیمارداروں کا تانتا بندھ گیا، ہر کسی نے اپنے عقل و فہم کے مطابق دیسی ٹوٹکے تجویز کیے، جب کوئی بھی حربہ کارگر نہ ہوا تو چوہدری نے کتے کو گاڑی میں ڈالا اور لاہور لے گیا۔'' (10)

شادی وہ خوبصورت رشتہ ہے کہ میاں بیوی میں اگر ذہنی ہم آہنگی نہ ہو تو زندگی عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ کامیاب شادی شدہ زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے جیون ساتھی کا انتخاب خود کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح کیجیے کہ آپ کو انتخاب میں اپنا عکس واضح نظر آئے۔

ذہنی ہم آہنگی، کلاس یا طبقے کا فرق جیسی چیزیں اگر درمیان میں آجائیں تو رشتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔شادی جیسے اہم بندھن میں بندھنے کے لیے ضروری ہے کہ انتخاب کرتے وقت اپنا ہم خیال تلاش کریں۔ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔قرآنی حکم کے مطابق جہاں بالغ کا نکاح کے بندھن میں بندھ جانا ضروری ہوتا ہے وہاں جسمانی کے ساتھ ساتھ ذہنی بلوغت بھی بہت ضروری ہے۔

زندگی کے سفر میں ساتھی کے انتخاب کے دوران یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مرد یا عورت جسے بھی ہم اپنا لائف پارٹنر چننے جا رہے ہیں کل کو وہ میری اولاد کے لیے کیسے ماں باپ کا کردار ادا کرے گا۔کسی سے یہ توقع رکھنا کہ کل کو میرا مرد میرے لیے اپنے جینے کا انداز،اوڑھنا پہننا یا عادات تبدیل کر لے گا تو ایسا کم ہی ممکن ہوتا ہے کیونکہ جو عادات ایک بار پختہ ہو جائیں وہ زندگی بھر قائم رہتی ہیں۔یہ سچ ہے کہ حسن مرد کی کمزوری ہوتا ہے۔اگر کوئی عورت فیشن ایبل ہونے کے ساتھ ساتھ حسین بھی ہو تو مرد کا دل کشش کی وجہ سے بہت جلد اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور اسی کشش کے باعث مرد اور عورت ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں اور سکون پاتے ہیں۔لیکن یہ سکون اس وقت بالکل غارت ہو جاتا ہے جب دونوں کو پتہ چلتا ہے کہ دونوں کی سوچ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔روز کی لڑائیاں جھگڑے اور بدگمانیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور پھر بات اکثر طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔سکون غارت اور زندگی تکلیفوں سے بھر جاتی ہے۔

عورت خدا کی خوبصورت ترین مخلوق ہے۔دین اسلام عورت کو پردے میں اور خود کو ڈھانپ کر رکھنے کا حکم دیتا ہے۔اسلام نے بڑے ہی واضح الفاظ میں محرم اور نامحرم کے رشتے بتا کر مرد و عورت دونوں کے لیے حدود مقرر کر دی ہیں۔جہاں عورت کو اوڑھنی اوڑھنے،سر اور سینہ ڈھانپنے اور اپنی زیب و زینت فقط شوہر پر ہی ظاہر کرنے کا حکم ہے وہیں مرد کو بھی راہ چلتے نگاہیں جھکانے اور تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔مگر جب دونوں میں ایک یا صرف عورت ہی حیا اور شرم چھوڑ دے تو نا صرف معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے بلکہ بہت سی برائیاں بھی جنم لیتی ہیں۔بے پردگی اور زیادہ روشن خیالی کے باعث خاندان ٹوٹ جاتے ہیں اور طلاق کی شرح میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔اس سب کی روک تھام کے لیے مذہب،اخلاق اور اپنی اسلامی روایات پر چلنا بہت ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر معاشرہ برائیوں کی آماج گاہ بن کر رہ جاتا ہے۔

''وہ بیلٹ والی تنگ شلواریں، جو ٹخنوں سے اوپر ہی رہتی ہیں، کھلے گلے

والی ہاف سلیوز پہنتی، جو ناف کے اوپر ہی رہتی، بال کھلے چھوڑتی، دوپٹہ نامی چیز سے اس کی واقفیت نہ تھی۔ سیاہ چشمہ لگا کر آزادانہ گھومتی تھی۔ وہ روشن خیال مشرقی لڑکی تھی جبکہ وحید پڑھا لکھا، پینڈو یہ سب نہ دیکھ سکتا تو اس کے اندر چھپا مولوی باہر آ جاتا۔ وہ اسے تنگ نظر اور بنیاد پرست ہونیکا طعنہ دیتی تھی۔" (11)

شادی ایک بہت ہی خوبصورت رشتہ ہے جو اپنے دامن میں عظیم مقصد، خوشی اور سکون سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی سکون اور خوشی کے تحت شادی سے قبل ہر لڑکی اپنے مستقبل کے بارے آنے والے کل کا قیمتی سرمایہ چند خواب بن کر رکھتی ہیں کہ میری شادی ہو گی۔۔۔ یہاں ماں باپ کے گھر تو مجھے سب پرایا دھن کہتے ہیں۔ شادی ہو گی تو میرا اپنا گھر ہو گا۔ میرا بھی ایک زندگی کا ساتھی، روٹھنے منانے والا ایک ہم نوا ہو گا۔ ہر طرح کا سکھ چین اور عیش و آرام ہو گا۔ شوہر کما کر اپنی ماں کی بجائے اپنی کمائی اپنی نئی نویلی دلہن کی ہتھیلی پر دھرے گا۔ زندگی محبت و الفت کی آماج گاہ بنی ہو گی۔ میں گھر کی اکلوتی مختار کل ہوں گی۔

ہم میاں بیوی میں اعتماد ہو گا، بچے ہوں گے اور پھر ان کی پرورش و تربیت ہو گی۔ کسی چھوٹے بڑے کی مخالفت نہ ہو گی جو ایسا کرے گا اس کی بھرپور مخالفت کی جائے گی۔ مگر ان سب خواہشوں اور خوابوں پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے۔ جب زندگی کا ساتھی ہی پاس نہیں رہتا اور کسی مجبوری یا مصیبت کی وجہ سے اسے بیوی بچوں اور ماں باپ کو چھوڑ کر پردیس کاٹنا پڑتا ہے۔ روزگار کی تلاش میں غیر ملکوں کے دروں کی خاک چھانتے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے تنہائی کے ساتھ جانوروں جیسی مزدوری بھی کرنی پڑتی ہے۔ پیچھے چھوڑے ماں، باپ بہن بھائیوں کی خواہشوں کی لمبی فہرستیں، معاشی مجبوریاں اور غربت کے خاتمے کی خاطر اچھی اور خوشحال زندگی کے خواب سجائے مرد پردیس میں کمانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دیار غیر میں بسنے والے بظاہر تو بڑے خوشحال اور اچھے دکھائی دیتے ہیں مگر وہ اپنے دل اور آنکھوں میں ہزار نا قابل بیاں کرب چھپائے ہوتے ہیں۔ کسی بھی فوتگی پر یا اپنوں پیاروں کے حادثوں میں مر جانے پر ہزاروں میل کی دوری کے شب و روز تپتے صحراؤں سرد موسموں میں غریب الوطنی ہی میں گزار دیتے ہیں۔

پردیس میں کئی کئی روز فاقوں مین، عیدوں، تہواروں پر اپنوں کی جدائی ساتھ، کتنے ہی بخار اور بیماریاں کسی کی عیادت کے بغیر، اجنبیوں کی بولی سے ناواقف گونگوں بہروں کی سی زندگی گزار دیتے ہیں۔ پردیسی یہاں ملک میں مقیم اپنے پیاروں کی معاشی حالت سنوارنے کی غرض سے گدھوں کی

طرح مشین اور روبوٹ بنے لگاتار کام کرتے رہتے ہیں۔چھوٹے بہن بھائیوں کی ضرورتیں، جوان بیٹیوں بہنوں کی شادی کی فکر بوڑھے ماں باپ، کا سہارا بن جانے ی آرزو، کسی کا قرض اتارنے جیسا بوجھ یا کچھ پیسے کمالوں اپنے وطن جا کر اپنا کاروبار کھولوں گا جیسی سوچیں اور معاشی مجبوریاں انہیں اپنے پیارے ملک واپس نہیں لوٹنے دیتی۔

ایسے میں بعض لوگ تو انہیں حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو بعض تنہائی کاٹنے کے لیے وہاں ہی کسی عورت سے کاغذی بیاہ کر لیتے ہیں اور وہیں گھر بسا کر رہنے لگ جاتے ہیں۔ پیچھے گھر والوں ماں باپ یا بن بیاہی بہنوں پر کیا گزر رہی ہے، وہ کس کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

زوجین کے حقوق میں فقط نان ونفقہ ہی ضرورت نہیں ہوتا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی ضرورتیں ہوتی ہیں۔گھر صرف چیزوں یا روپے پیسے سے نہیں چلتا بلکہ اصل میں بیوی کے لیے گھر اس کے شوہر اور رشتوں سے ہوتا ہے۔مگر جب عورت کو تنہائی کا آسیب ڈستا ہو، خاوند کی غیر موجودگی میں اس کے دن رات تکلیف میں گزرتے ہوں، وہ سارا وقت گھر میں اکیلے قیدیوں جیسی زندگی، چند اچھے لمحوں کو سوچتے تکلیف میں گزارتی ہو۔ پہاڑ جیسی جوانی، خوبصورتی مگر تنہائی، سسرالی باتیں کہ تمہیں کس چیز کی کمی، دل میں دبی خواہشیں، مچلتے جذبات کے ساتھ زندگی گزرتی ہو، وقت گزرنے کا نام ہی نہ لے، لمحے دن اور دن مہینوں اور مہینے سالوں جیسے لگتے ہوں۔شوہر نہ واپس آئے اور نہ فون پر کوئی خیر خیریت پوچھے نہ بتائے تو تنہائی کی ماری بعض عورتیں جذبات میں آکر غلط راہوں اور برے راستوں کی مسافر بن جاتی ہیں وہ انتظار میں گھلنے کی بجائے کوئی نیا مرد تلاش کر کے ناجائز ذرائع سے اپنی جنسی آسودگی حاصل کرتی ہیں۔

رشتے انسانی زندگی کی بقا کے لیے آکسیجن کی طرح ہوتے ہیں۔پیسوں کی لیے پیاروں کی قربانی عقلمندی نہیں۔نیک بیوی خدا کی رحمت ہوتی ہے۔شوہر کے گھر اور عزت کی محافظ کہلاتی ہے۔ خاوند کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ورنہ مرد کی بے رخی زندگی کے بے ضبط تقاضوں کی ستائی اور اپنی فطری جبلت سے حسب توفیق لڑنے کے بعد اپنے ہونے کا اثبات کرواہی لیتی ہیں۔پھر کوئی نئی نویلی دلہن جدائی کی سلگتی آگ کو بجھانے کے لیے کسی راج مزدور کی خدمات حاصل کرنے یا گھریلو ملازم کی۔شاہد رضوان نے بیرون ملک مقیم مرد حضرات کی بیویوں اور شادی شدہ خواتین کی جنسی ضروریات اور مسائل پر بڑی ہنرمندی سے قلم اٹھایا ہے۔انہوں نے معاشرے کی سچی مگر تلخ حقیقتوں کا پردہ بڑی خوبصورتی سے چاک کیا ہے:

"ایک ماہ کا سہاگ ۔۔۔ چہ معنی دارد؟ اس سے تو بہتر ہوتا کہ وہ کنواری ہی بیٹھی رہتی۔ جب تک اس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ہر چند جذبات مچلتے، انگ انگ ٹوٹتا، برسات کا موسم تن بدن میں آگ لگاتا، جنس مخالف کی طلب اسے ستاتی لیکن اس کی خواہش کو شدید ہونے کے باوجود کچلنا آسان ہوتا۔۔۔ لیکن اب تو وہ شادی کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ اپنے جذبات پر قابو پانا خود پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔" (12)

"ظلم و زیادتی" عدل کی ضد ہے۔ عدل و انصاف ہی وہ پیمانہ ہے جس کے باعث انسانیت زندہ ہے۔ اگر معاشرے میں انصاف نہ رہے تو ایسا معاشرہ صالح معاشرہ نہیں ہو سکتا ظلم و جبر اور درندگی و دہشت کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ قرآن بھی ہمیں انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ "کسی قوم (یا فرد) کی عداوت تمہیں بے انصافی پر نہ ابھارے، تم عدل کرتے رہو کیونکہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔" نہ صرف ارشاد باری تعالیٰ سے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور حیات طیبہ کے ذریعے بھی ہمیں بار بار انصاف کا حکم ملتا ہے۔ اسلام امیر و غریب، شاہ و گدا، آقا و غلام، ادنیٰ و اعلیٰ اور حاکم و محکوم کو برابر قرار دیتا ہے۔ غرض انصاف کا جو پیمانہ اسلام نے ہمیں عطا کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

انصاف اقوام کی سر بلندی، وقار اور بقا کی علامت ہے۔ مگر جن معاشروں مین اللہ کے بندوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا وہ قومیں زوال کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ انصاف وسیع معنی رکھتا ہے۔ سیاسی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، قانونی اور آئینی ہر حوالے سے انصاف کا برقرار رہنا بہت ضروری ہے رسول پاک ﷺ کا خطبہ حج، الوداع ہمیں انصاف کا درس دیتا ہے۔ رنگ و نسل، مذہب و قوم اور قبیلے کی بنا پر کوئی بھی فرد کسی دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا بلکہ برتری کا معیار صرف اللہ کا خوف ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں معاشرے کے بنیادی مسائل میں ایک بہت بڑا مسئلہ انصاف کے حصول کا ہے۔ مگر صد افسوس کہ یہاں انصاف پانا ایک طبقاتی مسئلہ اختیار کر چکا ہے یعنی طاقت ور قانون کی حکمرانی کو اپنے تابع رکھتا ہے جبکہ کمزور کے لیے انصاف حاصل کرنا کسی دیوانے کے خواب جیسا ہے۔ حصول انصاف ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ بے گناہ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ازالہ کرنا انصاف کے اداروں، پولیس، عدالتوں اور ہمارے ججوں کا کام ہے۔ آج اگر کوئی غریب اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے تو اس کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔ مخالفین اول تو سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے ایف آئی آر تک نہیں کاٹنے دیتے اور اگر ایف آئی آر کٹ جائے، معاملہ عدالت تک پہنچ بھی جائے

تو ججوں اور وکیلوں کو پیسہ لگا کر خرید لیا جاتا ہے۔

عام عوام کو انصاف کے حصول کے لیے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔معاشی اور سماجی طور پر کمزور افراد،عورتیں اور خصوصاً کم عمر بچے جو والد یا کسی سرپرست کے قتل کے خلاف انصاف کے ادارے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو انہیں سب سے زیادہ استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہاں کی عدالتوں میں انصاف بکتا ہے جہاں فوری اور سستے انصاف کی بالا دستی نہیں ہوتی تو اس معاشرے سے اخلاقیات،امن، قانون اور استحکام کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔مقتولین کے لواحقین فقط انصاف کے متلاشی ہی رہ جاتے ہیں۔ظلم کے ذریعے حق کو کچھ دیر کے لیے دبایا تو جا سکتا ہے لیکن رشوت لینے اور دینے والے دنیا اور آخرت دونوں میں کبھی نہ کبھی ضرور ذلیل و رسوا ہو کر رہتے ہیں۔حدیث پاک کے مطابق ’’رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں‘‘۔بلکہ رشوت لینے اور دینے والے کے درمیان معاملہ کروانیوالے پر لعنت کی گئی ہے۔

آج یہ قبیح فعل بہت عام ہو گیا ہے۔قریباً ہر ادارے میں اس کا بازار گرم ہے۔پھر چاہے کوئی امیر ہو یا غریب، بڑے محکموں کے جج، وکیل ہوں یا چھوٹی پوسٹ کے ملازمین سب جگہ اس سود خوری نے ڈھیرے جما لیے ہیں۔بڑے بڑے جج اور قاضی اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے آسائشیں جمع کرنے ارو گناہ کمانے ہی میں عمر گزار دیتے ہیں۔اور دنیا و آخرت کی رسوائی کو اپنا مقدر بنا لیتے ہیں۔ایسی کمائی جو حرام کے ذریعے سے کمائی گئی ہو اس سے نسل کی بہترین پرورش کیوں کر ممکن ہے۔اولاد سکھ دینے کی بجائے دکھ دینے والی،غلط کاریوں میں مبتلا،عیاش اور آوارہ نکلتی ہے۔حرام رزق نہ صرف بہت سی جسمانی بلکہ نفسیاتی اور روحانی بیماریوں میں بھی مبتلا کر دیتا ہے۔ایسا رزق برکت سے خالی اور روح و دل کو غمگین و بے چین کر دینے والا ہوتا ہے۔انصاف کا قتل کرتے وقت رحم سے خالی جج اور وکیل حضرات ریٹائرمنٹ کے بعد عمر کے آخری حصے میں پہنچتے ہیں تو ساری عمر کیے گئے ظلم، ناحق کھائی ہوئی رقم،رشوت اور ذاتی مفاد کے بدلے ہائی خوشیاں پچھتاوے، دکھ، تنہائی،خوف اور وحشت بن کر ان کا پیچھا کرتے ہیں۔آخرت کا عذاب دنیا ہی میں انہیں ڈرانے لگتا ہے۔کسی بیوہ مظلوم کی دہائیاں،کسی کم سن معصوم بچے کے آنسو،کسی بوڑھے کے لرزتے ہاتھ اور جھکی ہوئی کمر تو کہیں انصاف کے لیے دردر پھرتے کسی غریب کی آہ و فریاد دل کا چین اور قرار، رات کی نیند اور خوشی سب چھین لیتا ہے۔عجیب بدحواسی، بے چینی،وحشت کے گہرے سائے، بھیانک موت کی جیتی جی جھلک اور ماضی کے ظلم سب ڈراؤنے خواب بن کر ڈرانے لگتے ہیں۔پھر موت کے علاوہ کوئی چلہ،کوئی دم

دار و یا دواضمیر کی آواز دبانے اور رہائی دلانے ذریعہ نہیں ہوتی۔ایسے میں ظالم روز جیتا اور روز مرتا ہے۔

> ''تم کیسے انسان ہو؟ چہرہ بندر جیسا ہے۔اب سانپ بن گئے ہو اور اب تم چوہے کی شکل اختیار کر چکے ہو اور اب تم کتا بن گئے ہو۔نورانی بشر نے ایک بار پھر بارعب آواز میں پوچھا: "میں ایک ریٹائرڈ جج ہوں۔''(13)

برصغیر میں اسلام کی اشاعت، بقا اور پھیلاؤ کے حوالے سے دینی درسگاہوں اور اللہ کے نیک بندوں کا کردار بڑا ہی اہم رہا ہے۔ان عظیم ہستیوں نے معاشرے سے بدعات کے خاتمے، دین محمدی ﷺ کی ترویج اور شرک و گناہ کی روک تھام کے لیے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔صراط مستقیم سے دور، گناہوں کی دلدل میں پھنسے، بھکے انسانوں کو رب سے جوڑنے میں مدد فراہم کی۔عوام انہیں اپنا روحانی محسن تصور کرتے تھے۔اسی باعث آج صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی لاکھوں پیروکار اور چاہنے والے ان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔مگر صد افسوس آج کی اس اکیسویں صدی میں اس پاکیزہ عمل و مقصد اور پیر و بزرگ حضرات کا کردار ایک کاروبار کی صورت اختیار کر چکا ہے۔جعلی بابے، پیر اور نقلی عالم شرع کی حدود سے نکل کر عوام کو فراڈ اور دھوکے دہی سے اپنے فریب میں پھنسا کر لوٹتے نظر آتے ہیں۔

سیدھے سادھے کم تعلیم فافتہ دیہی افراد اور خصوصاً معصوم عورتیں انہیں ولی اللہ اور نیک بزرگ سمجھ کر ان کی شعبدہ بازی میں آجاتی ہیں اور نہ صرف گھر کا مال اسباب، زیور، لباس لٹھا بلکہ اپنی عصمت اور عزت و رفعت تک گنوا بیٹھتی ہیں۔شیطانی طاقتوں کے ذریعے لوگوں کو کرشمے دکھا کر بیوقوف بنایا جاتا ہے کم پڑھے لکھے، ان پڑھ اور توہم پرست افراد کی بہت بڑی تعداد ''فلاں کو بھی شفا ہوئی۔فلاں کو بھی روٹھی محبت واپس مل گئی'' باباجی کی نظر کرم سے اس کے ہاں جڑواں لڑکے ہوئے۔پیر جی کے چلے سے دولت کی ریل پیل ہوگئی۔''فلاں کی ٹوٹی ہڈیاں اور بیماریاں ختم ہوگئیں۔''تو بزرگوں کے تعویز سے بیٹی کا رشتہ ہوگیا یا ہمارا گھر چھوڑ کر گیا بیٹا واپس لوٹ آیا جیسی جھوٹی اور من گھڑت کہانیوں پر اعتبار کرکے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتے ہیں۔کمزور اعتقاد والے افراد ان دو نمبر پیروں کی بچھائے جال میں پھنس کر اکثر غیر اخلاقی اور غیر شرعی رویوں پر راضی ہو جاتے ہیں۔

ان پڑھ جاہل لوگ ان دھوکے بازوں کی باتوں میں آکر کہیں قبروں کی مٹی لائے، کہیں چڑھاوے چڑھائے، جانوروں کی غیر اللہ کے نام پر قربانیاں دیتے، جن نکالنے کی غرض سے ڈنڈوں سے زخمی، دھونیوں سے بے ہوش ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔بے اولادی دور کرنے کے لیے

عورتیں جعلی پیروں کے پیر پکڑے تو کہیں ان کے گلے لگ رہی ہوتی ہیں۔ جادو کے توڑ اور شوہر کو قابو کرنے کے بہانے برہنہ کر کے ان سے جنسی خواہشات کی تکمیل یا ان کی وڈیوز کو بیچا جاتا ہے۔ ننھے معصوم اور کم عمر لڑکے لڑکیوں سے بدفعلی، کسی قبر سرہانے مردکی ہڈیوں، الو کے خون، انسانی بالوں اور کالے جادو کے ذریعے بہت سے بنگالی اور جعلی بابے لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ یہ افراد گروہ کی صورت میں کام کرتے ہیں اور اکثر اوقات تو ان کی باقاعدہ جماعتیں ہوتی ہیں جن میں بعض اوقات خواتین اور نوجوان خوبصورت لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں جو سیدھے سادھے مردوں اور لڑکوں کو بیوقف بنا کر لوٹتی ہیں۔

بیچارے عوام اپنی سادگی اور کم خواندگی کے باعث سادہ لوگوں کے تعویز گنڈوں اور جادو کے توڑ جیسی باتوں پر یقین کر بیٹھتے ہیں اور فراڈ کے ذریعے اپنے پیسے اور زیور گنوا بیٹھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ یہ خانہ بدوشوں کی طرح ایک علاقے سے دوسرے میں ہجرت کرتے رہتے ہیں۔ جہاں پڑاؤ ڈالتے ہیں وہاں کے لوگوں کے مال و جائیداد کا صفایا کر کے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ کسی کو ان کے اصل ٹھکانے، مقام یا رہائش کی خبر نہیں ہوتی۔ اس لیے لوگ اپنی توہم پرستی، سادگی اور دین سے دوری کے باعث بعد میں ساری عمر سر پکڑ کر پچھتاتے رہتے ہیں۔ ذہنی سکون، تناؤ، ڈپریشن کے خاتمے، بیماریوں، معذوروں سے چھٹکارے کی غرض سے آئے حضرات ان سے سوائے رسوائی کے کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔

آج کل تو یہ جعلی پیر، نقلی سائیں جی، بنگالی بابے، اور فقیر جی باقاعدہ پلاننگ کے ذریعے سے چند لوگوں کو اپنا خلیفہ یا جانشین بنا کر معاشرے میں متعارف کرواتے ہیں اور اپنی جھوٹی، نام نہاد کرامات، کا ڈھونگ رچاتے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ یہ باقاعدہ شدید زیادتی، بدفعلی، لوٹ مار، چوری چکاری اور اغواء برائے تاوان جیسے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ ہمارے انصاف کے اداروں، پولیس اور حکومتی عہدے داران کو ایسے شعدہ بازوں جعلی پیروں اور دونمبرے کام کرنے والے بابوں کے خلاف سخت کاروائی کرنی چاہیے تاکہ ان کے ہتھے چڑھ کر روپیہ پیسہ، مال واسباب، عزت وعصمت اور جان تک کی قربانی دینے والوں کو چھٹکارا مل سکے۔

> ''فقی شریف آدمی تھا۔ اس کی کسی سے ان بن نہ تھی۔ کوئی تنازعہ نہ تھا۔ بیٹیوں کا کیا ہے وہ تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ بیٹا تو آخری عمر کا سہارا۔۔۔ منیر تھا بھی اکیلا، کوئی دو چار نہ تھے۔ روپیہ پیسا تو ہاتھوں کی میل ہے۔ آدمی پھر کما لیتا ہے۔ فقیر نے اونے پونے داموں ستر ستر ہزار کی دو بھینسیں فروخت کیں۔ ایک لاکھ بیس ہزار کا زیور بیچا جو حاجرہ

نے بچیوں کے لیے بنوایا تھا۔چالیس ہزار ادھر ادھر سے ادھار پکڑے۔۔۔اس نے دن بھر تردد کر کے تین لاکھ پیدا کر لیے تھے۔رقم پہنچاتے ہو۔۔۔یا ہم منیر کی لاش بھیجیں۔'' (14)

پاکستان میں اکثر لوگوں کے پاس محدود اقتصادی وسائل ہیں اور معیار زندگی کم ہو کر رہ گیا ہے۔اس کی بنیادی وجہ غربت ہے۔لوگوں کے پاس دو وقت کی روٹی کھانے ، پہننے کو کپڑے اور سر ڈھانپنے کو لباس تک نہیں۔کم آمدنی اور وسائل میں کمی کے باعث کمتری،محرومیاں،ذہنی مسائل اور پریشانیاں جنم لے رہی ہیں۔غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر غریب پیسہ نہ ہونے کے باعث مختلف جرائم کرنے لگتا ہے۔

پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے لوگ گاڑیوں اور مختلف املاک کی چوری کرتے ہیں۔ڈاکو اور لٹیرے بن جاتے ہیں۔تو کبھی کسی امیر آدمی کا بچہ یا جوان لڑکی اغواء کر لی جاتی ہے۔روپے پیسے کے لیے دوسروں کی جانوں اور عزتوں کے ساتھ بری طرح کھیلا جاتا ہے۔بعض اوقات غربت و بے روزگاری انسان کو بہت سی غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔جو لوگ محنت نہیں کرتے اور غربت کی زندگی گزارتے ہیں۔وہ زیادہ تر منشیات، چرس، ہیروئین، زیادتی، جوا، شراب نوشی، دھوکہ دہی اور ممنوعہ سرگرمیوں میں مبتلا ہو کر مجرمانہ کاروائیاں سرانجام دینے لگ جاتے ہیں۔جہاں مرد حضرات بے روزگاری کے سبب جرائم میں مبتلا ہو کر پیسہ کمانے کے ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں۔وہیں خواتین اور نوجوان لڑکیاں بھی دولت کے حصول اور غریبی کے خاتمے کے لیے جسم فروشی جیسے مکروہ دھندے میں پڑ جاتی ہیں۔

والدین کا قرضہ اتارنے، چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے، بوڑھے ماں باپ کے علاج تو کبھی جہیز جیسی لعنت کے ہاتھوں مجبور ہر کر لڑکیاں اگر گھر سے باہر روزگار کے سلسلے میں نکلتی ہیں تو انہیں غلیظ نظروں، چیختی ہوئی باتوں اور عجیب دھمکیوں سے جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔اول تو انہیں ملازمت دی ہی نہیں جاتی، اگر انہیں ملازمت مل جائے تو انہیں انتہائی تنگ دستی کے حالات میں بہت کڑی شرائط کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔پھر نو دس گھنٹے مسلسل کام کرنے کے بعد پیسے ملتے ہیں جس سے آدھے جانے کے کرائے اور چند ضرورت کی اشیاء بڑی مشکل سے پوری ہوتی ہیں۔

منڈی جیسی اس معیشت میں جہاں تمام اخلاقی اقدار بکتی ہوں، انصاف اور منصفوں کے

ضمیروں کی بولیاں لگتی ہوں، ہر قانون بکتا ہو، وہاں انسانی گوشت اور لہو سب سے بے مول بکتا ہے۔دوسری تمام اجناس طرح عورت بھی سستی بکنے والے جنس بنائی ہوئی ہے۔

جہاں خوراک کی کمی ہو، بھوک کے ڈھیرے ہوں، وہاں عصمت فروشی کے دلدل میں پھنسانے کے لیے باقاعدہ لڑکیاں ٹرینڈ کر کے لائی جاتی ہیں۔مختلف گروہ جن میں خواتین بھی شامل ہوتی ہیں ان کے ذریعے لڑکیوں کی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے۔انہیں سستے داموں خرایداا اور فروخت کیا جاتا ہے۔نہ صرف ایک علاقے سے دوسرے علاقے بلکہ دیگر شہروں اور بیرون ممالک بھی ''فریش مال، تازہ سپلائی، نیا پیس اور ان ٹچ'' کہہ کر خواتین کی عصمت فروشی کا روبار کیا جاتا ہے۔

چند گھنٹے، رات، ہفتے اور بعض اوقات تو مہینوں کے حساب سے نہ صرف یہ گروہ بلکہ خود نوجوان لڑکیاں بھی جسم کا سودا کرنے آتی ہیں۔کم عمری اور حسن دیکھ کر دام طے کیے جاتے ہیں۔اس سب سے بہت سی جنسی برائیاں، بے راہ روی اور ہزاروں ناجائز بچے روز جنم لیتے ہیں۔جنہیں کوڑے کے ڈھیروں، یتیم خانوں اور مختلف سینٹروں میں پیدا ہوتے ہی مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے یا پھر دنیا میں آنے سے قبل ہی ان کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔اس سب کا محرک غربت ہے۔

یہ آج غربت ہی ہے جس کی وجہ سے جہیز نہ ہونے کے باعث جوان لڑکیاں شادی کی عمر بوڑھے ماں باپ ہی کے گھر بیٹھے گزار دیتی ہیں۔وقت پر ہاتھ پیلے نہ ہونے کی صورت میں ان کے چہروں پر جھریاں اور بالوں میں سفیدی آ جاتی ہے۔وقت کے حکمرانوں کو غربت اور بے روزگاری کے خاتمے کے لیے کوششیں کرنی چاہیے۔دو وقت کی روٹی، جسم ڈھانپنے کے کپڑا اور چھت جیسی بنیادی ضرورتوں کے لیے عوام کو ریلیف اور آسان شرائط پر قرض جیسی سہولیات دینی چاہیے۔

نہ صرف پڑھے لکھے نوجوانوں بلکہ غیر خواندہ افراد اور خواتین وغیرہ کے لیے بھی باعزت روزگار اور نوکریوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔تا کہ کوئی کسی بھی ماں باپ کی جوان اولاد اور خصوصاً لڑکیاں اپنی عزتوں کا سودا نہ کریں۔اس کے ساتھ ساتھ والدین کو اولاد کی وقتاً فوقتاً ذہنی و اخلاقی تربیت بھی کرتے رہنا چاہیے۔صرف بیٹوں کو ہی نہیں بلکہ بیٹیوں کو بھی حلال وحرام سے آگاہ کرنا چاہیے۔اسلام اور شرع پر سختی سے عمل پیرا ہونا چاہیے تا کہ اولاد اپنی اور والدین دونوں کی دنیا وآخرت برباد کرنے سے بچ سکیں۔

جسم فروشی ایک انتہائی مکروہ دھندہ ہے۔غربت کی وجہ سے، خاندان سے چھپ کر، سرعام اپنی مرضی سے یا کسی مجبوری کے تحت ہو، اس کی روک تھام لازمی ہے تا کہ ہم پاک رہ سکیں اور ہمارا معاشرہ بھی پاک رہ سکے۔شاہد رضوان نے عصمت فروشی جیسے سنگین مگر حساس پہلو کی طرف بڑی

خوبصورتی سے توجہ دلائی ہے:

''وہ کب سے کھیت چرنے کی عادی ہے؟''پچھلے چھ ماہ سے''یہ تمہاری مجبوری ہے یا شوق۔۔؟ مجبوری ہے۔مجھ سے بڑی دو بہنیں شرافت کی چادر اوڑھے چاردیواری کے اندر گھٹ گھٹ کر بیٹھی رہیں ،مگر گھر کے فاقوں نے کسی کو ان کی طرف دیکھنے کی توفیق نہ بخشی۔حالانکہ وہ دونوں چندے ماہتاب تھیں۔ان کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی لیکن ان کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکے۔''اس کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔''(15)

غربت اور بے روزگاری آج وطن عزیز میں ہر ایک کا ہی مسئلہ بن چکا ہے۔ہمارے ہاں آج تین قسم کے طبقے آباد ہیں۔جن میں''امیر طبقہ''،''درمیانہ طبقہ''اور''غریب طبقہ''ہیں۔امراء کا طبقہ وہ ہے کہ جن کے پاس تمام آسائش زندگی اور وافر مقدار میں روپیہ پیسہ موجود ہے۔دوسرا ''درمیانہ طبقہ''ہے جو غریب کی لکیر سے تھوڑا اوپر ہے جبکہ تیسرا طبقہ''غریب طبقہ''ہے۔جو محض دو وقت کی روٹی کھانے سے بھی محروم ہے۔

بے روزگاری آج کل ایک سماجی عیب اور برائی سمجھی جاتی ہے۔جو بہت عجیب اور خطرناک حالات پیدا کرتی اور موت کے منہ تک لے جاتی ہے۔غربت و بے روزگاری کے باعث اچھا بھلا انسان بھی قانون شکن،لٹیرا،مجرم،اور ڈاکو کا روپ دھار لیتا ہے جس سے بہت ساری برائیاں پھیلتی ہیں اور انسان کے کردار کے منفی پلو انظر آنے لگتے ہیں۔غریب آدمی جو اپنے بچوں اور بیوی کے لیے دو وقت کا کھانا اور بیماری کے وقت دوا تک نہیں لے سکتا اس سے ایمانداری،شرافت اور بہتری کے کاموں کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے۔

آج کل غربت کے ساتھ عزت دارانہ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔غربت بے سکونی،اضطراب اور بغاوت کو جنم دیتی ہے۔انسان غربت میں ہو تو وہ کام بھی کرنے لگ جاتا ہے جو اس نے کبھی سوچے بھی نہیں ہوتے۔مہنگائی کے اس دور میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔اگر غریب طبقے کو ہنر سکھا کر چھوٹے پیمانے پر مگر مناسب عزت دار روزگار دے دیا جائے،ہر کنبے کے افراد کیلئے ایک چھت(گھر)اور تعلیم جیسی مفت سہولیات دے دی جائیں تو معاشرے میں سکون لانے کے ساتھ ساتھ مسائل میں بھی کمی لائی جا سکتی ہے۔اگر گھریلو خواتین کو دستکاری،سلائی کڑھائی یا کوئی اچھے ہنر سکھا دیئے جائیں تو وہ بھی اپنے مردوں کے ساتھ مل کر شانہ بشانہ گھر چلانے میں مدد دے سکتی ہیں۔

یہ تو سچ ہے کہ غربت بہت بری بلا ہے لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ انسان بے حیا ہو جائے۔ذلت آمیز پیشہ اختیار کر لے۔محنت مزدوری ایک ایسا زینہ ہے جس پر چڑھ کر انسان تیزی سے روشنی کی طرف جا نکلتا ہے۔ہوسکتا ہے اتنی محنت سے امارت کی تلاش ناممکن ہو لیکن اس میں سکون اور عزت ضرور ہوتی ہے۔ایک دانا کے قول کے مطابق ''اس کائنات میں کوئی انسان اس وقت تک رسوا نہیں ہو سکتا۔جب تک وہ کپڑا صرف بدن ڈھانپنے کے لیے پہنے اور روٹی صرف زندہ رہنے کے لیے کھائے۔''غریب مسکین برا تو نہیں،البتہ قحط،بھوک اور افلاس جب انسان کا منہ چڑاتے ہیں تو غریب انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے نارمل حالات میں جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔چوری کرتا ہے،چند روپیوں کی خاطر بے گناہ انسانوں کو قتل کر دیتا ہے جبکہ اغواء برائے تاوان کا مرتکب ہوتا ہے۔یہاں تک کہ یہ غربت ہی ہے جو عورت کو جسم فروشی پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔

جانے کیسی کیسی مجبوریوں کے باعث،مہنگائی،بے بس حالات کی ستائی عورتیں کم عمری اور بچپن ہی میں اس ذلالت میں خو کو ڈبو لیتی ہیں اور پھر عمر بھر اسی سے منسلک رہتی ہیں یا پیشہ وارانہ کاروبار تمام زندگی کے لیے کرنے لگ جاتی ہیں۔اس دھندے میں آنے کے بعد جب تک پیشہ وارانہ عورتیں جب تک جسمانی حوالے سے بالکل ناکارہ نہیں ہو جاتیں اپنی قیمت وصول کر کے مشکل سے گزارا کرتی رہتی ہیں۔

آج کل ہمارے معاشرے کے دوہرے معیار ہیں جہاں اخلاقیات اور تربیت کی کمی ہے۔عورت کی کوئی عزت نہیں ہے۔عورت نے جب گھر،چادر،چاردیواری کو چھوڑا تو وہ صرف انجوائمنٹ کی ہی ایک چیز بن کر رہ گئی۔پھر مرد نے اس کی بولی یہ دیکھے بنا لگائی کہ وہ میری ماں کی عمر کی خاتون ہے یا پانچ بچوں کی ماں،گوری،کالی یا بدصورت ہے؟ وہ عادی دھندا کرنے والی ہے یا عام کوئی مجبور عورت؟

نوجوان نسل جو کہ کسی قوم وملت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند اور قوم کی فلاح وترقی کی ضامن ہوتی ہے۔جب بے حیائیوں اور فحاشیوں میں پڑ جائے تو بہت سی ایمان کش اور اخلاق باختہ برائیاں جنم لیتی ہیں۔عریانیت عام ہو جاتی ہے۔نسل بے راہ روی،بدکاری،اور زنا کاری کی جانب مائل ہونے لگتی ہے۔اس بے حیائی کے وائرس سے بچنے کے لیےجہاں ایک وجہ غربت ہے وہیں دین سے دوری بھی اس کی بہت بڑی وجہ ہے۔جب ہم نے اسلام کے ان اصولوں کو کہ "مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور عورتیں اپنی اوڑھنی کو اپنے سینوں پر ڈالے رکھیں" کو ترک کیا تو رسوائی ہمارا مقدر

ٹھہری۔اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمارے قلوب اور زندگیوں کو پاکیزہ بنائے۔ہمارے وطن عزیز کو غربت، بے روزگاری، جہالت، بے راہ روی، اور جسم فروشی جیسے دلدل سے محفوظ رکھے۔جسم فروشی ایک ایسا حساس معاشرتی موضوع ہے کہ جس پر بہت کم بات کی جاتی ہے۔شرمایا جاتا ہے۔مگر شاہد رضوان ایک ایسا افسانہ نگار ہے کہ جس نے بہت ایمانداری سے اس موضوع پر قلم اٹھا کر ہماری عوام کو جھنجھوڑنے اور اخلاقیات پر غور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

> ''جیسے ہی اس نے فون بند کیا۔''چلنا ہے۔۔۔؟''ایک نے ذرا قریب ہو کر دعوت دی۔''چلنا ہے۔۔۔؟''اس کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھ کر عورت نے ایک بار پھر اس کے دل و دماغ پر تازیانہ لگایا۔''کہاں۔۔۔؟'' بڑی شدومد کے ساتھ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔''ہوٹل میں۔۔۔ساتھ ہی تو ہے۔''عورت نے بڑی دیدہ دلیری سے کہا۔وہ شرم سے آب آب ہو گیا۔اسے اپنی حماقت پر بہت غصہ آیا اور وہ دانت پیس کر رہ گیا تھا۔''آپ میری ماں کی عمر کی ہو، کچھ تو شرم کرو۔۔۔''ڈرو مت کچھ نہیں ہوتا کسی کو کیا پتہ۔۔۔؟''جو دس بیس دو گے لے لوں گی۔''(16)

دہشت گردی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔آج جہاں بہت سے ممالک اس کا شکار ہیں وہاں وطن عزیز پاکستان بھی اس کی لپیٹ میں ہے۔مفادات اور اقتدار سے منسلک حکمرانوں نے عوام کو خودکش حملوں اور بم دھماکوں کی زد میں آ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔قومی سطح پر تو دور کی بات نجی اور انفرادی سطحوں پر ہمارے اداروں کو بھی اس بات کا خیال نہیں آیا کہ جن خاندانوں کے واحد کفیل اس دہشت گردی کی نظر ہو گئے ان کے بچوں کا اب کون سہارا ہوگا؟ اس کے بچے زندگی کیسے جی رہے ہوں گے۔

دہشت گردی میں مرنے والوں میں اصل ہدف اور نشانہ تو کوئی ایک آدھ شخصیت ہوتی ہے تاہم باقی جان گنوانے والوں میں زیادہ تر غرباء اور معصوم و بے گناہ لوگ ہی شامل ہوتے ہیں۔کوئی ریڑھی لگانے والا دو وقت کی روٹی کمانے کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے تو کوئی محنت،مزدوری کر کے خاندان کا پیٹ پالنے والا محنت کش،کوئی کسی بڑے یا چھوٹے کارخانے کا ملازم ہوتا ہے تو کوئی دکھوں کا ستایا دکاندار۔۔۔تو کوئی خوانچہ فروش۔اکثر یہ تمام کسی نہ کسی خاندان کا واحد سہارا یا کفیل ہوتے ہیں۔

دہشت گردی جیسے گناؤنے واقعات بے شمار خاندانوں کے چراغ گل کر دیتے ہیں، سہارے اور آسرے چھین لیتے ہیں۔ماں باپ کو کبھی جوان اولاد سے اور کبھی شیر خوار اور معصوم

کلیوں اور پھولوں کو ماؤں کی گودوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔نئی نویلی دلہنوں سے ان کے سہاگ چھین لیے جاتے ہیں۔بہنوں کو بھائیوں سے جدا کر دیا جاتا ہے۔غرض ایسی ایک دلسوز و دلخراش کہانیاں اور خبریں آئے روز سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں کہ سینہ چھلنی ہو جاتا ہے۔

درد کی لہریں جیسے پورے جسم میں سرائیت کرنے لگ جاتی ہیں۔مگر صد افسوس کہ ہم چند لمحوں کے لیے رنجیدہ تو ہوتے ہیں مگر جلد ہی اسے فقط ایک المناک واقعہ قرار دے کر زندگی میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔اہل ثروت و حکمران طبقہ تعزیت و مذمت کے دو بول، بول کر سکون سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔مگر اپنی جانوں کا نظرانہ دینے والوں کی بیویاں اور معصوم و مظلوم بچے پتھرائی ہوئی آنکھوں اور درد بھرے چہروں سمیت سراپا سوال دکھائی دیتے ہیں اور اس بے حس سماج سے دریافت کرتے ہیں کہ آخر ہمارا قصور ہی کیا تھا۔اب ہمارا سہارا کون بنے گا؟

مگر اس بے حس و بے ضمیر سماج کے پاس ان کے کسی سوال کا کوئی تسلی بخش جواب تک نہیں ہوتا۔اہل اقتدار بے شرمی کی چادر تانے اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ایک کے بعد جب دوسرا واقعہ ہوتا ہے تو لوگ پہلا سانحہ اور مدد کے لیے راہ تکتے لوگوں کو بھول چکے ہوتے ہیں۔اہل اقتدار بجائے ان بے آسرا یتیم بچوں اور بچیوں کی باعزت طریقے سے ضروریات زندگی، تعلیم وغیرہ کا خیال رکھنے،مظلوموں کے آنسو پونچھنے، ہمت، جذبہ اور حوصلہ دینے کے ایسی خبروں کو دباتے اور چھپاتے ہیں کہ ان کے دور حکومت یا خطے میں ایسا ہوا اور ان کی جگ ہسائی نہ ہو۔اہل اقتدار طبقے کو بیچارے متاثر خاندانوں کے لیے باقاعدہ فنڈز یا ٹرسٹ کے رقوم کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ مرنے والے کا باقی خاندان بنیادی ضروریات زندگی کے لیے غربت کے باعث سسک سسک کر نہ مرے۔

آج کل ہمارے ہاں متضاد معاشرتی رویے بہت بڑھ گئے ہیں۔جن کے باعث غرباء کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔مثلاً کسی دہشت گرد حملے میں اگر ایک بڑے سیاسی لیڈر اور عام سیاسی کارکن کی موت ہو جائے تو ہم عام آدمی کو بھول ہی جاتے ہیں۔بڑے لیڈر کے نام پر اس کی برسی منائی جاتی ہے۔ملک کے گلی کوچوں اور شہر شہر میں اہم شاہراہوں پر احتجاج کی کال دی جاتی ہے۔جلسے جلوسوں میں بار بار مرنے والے لیڈر کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔جبکہ اسی حملے میں اس لیڈر کے ساتھ شہید ہونے والے کارکن کو کوئی یاد ہی نہیں کرتا۔قومی و سیاسی لیڈروں کی قبروں پر مزار بنائے جاتے ہیں۔ہر سال اس کی برسی پر منوں کے حساب سے اس کی قبر پر پھول چڑھائے جاتے

ہیں۔ دیپ جلائے جاتے ہیں جبکہ اسی روز دہشت گرد حملے میں شہید ہونے والے کارکن کی قبر برسی کے روز سنسان پڑی ہوتی ہے۔

افسانہ ’’مسلی ہوئی پتیاں‘‘ پاکستان کے دو بڑے مسائل یعنی دہشت گردی اور غربت پر محیط افسانہ ہے۔ یہ چھوٹا سا افسانہ ایک بڑے موضوع کی کہانی بن جاتا ہے۔ ایک مزدور 26 دسمبر کی دہشت گردی میں گندم کے ساتھ گھن کی طرح پس جاتا ہے۔ اس کا معصوم بچہ محرم کے دنوں میں دیگر افراد کی دیکھا دیکھی اپنے باپ کی قبر کو پھولوں اور موم بتیوں سے سجانا چاہتا ہے لیکن غربت کی وجہ سے ایسا کرنے سے معذور ہے۔ آخر ایک روز وہ ایک جلوس کے ساتھ لیاقت باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں شہید قومی لیڈر کے مزار پر منوں پھول چڑھائے اور چراغ جلائے جاتے ہیں۔ وہ سب کے چلے جانے کا انتظار کرتا رہتا ہے اور بالآخر مسلی ہوئی پتیاں اور جلی ہوئی آدھی موم بتی اپنے باپ کی قبر پر لا کر اسے سجانے کا خواب پورا کرتا ہے۔ یہ بہت ہی حساس افسانہ ہے وہ جو کہ دہشت گردی کے نتیجے میں ہلاک اور اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں ان کے بال بچوں پر کیا گزرتی ہے، وہ کیسے گزر بسر کرتے ہیں۔ ہم سب یہ بھول جاتے ہیں۔ شاہد رضوان نے اس افسانے ’’مسلی ہوئی پتیاں‘‘ کے ذریعے ایک بڑے لیڈر کی موت اور عام سیاسی کارکن کی ہلاکت پر نظر آنے والے متضاد معاشرتی رویوں سے بڑی عمدگی سے پردہ اٹھایا ہے۔

> ’’موم بتیاں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ صرف ایک ادھ جلی موم بتی بچی تھی جو بجھنے کی وجہ سے راکھ نہ ہو سکی۔ پھولوں کے ہار مرجھا گئے تھے۔ پتیاں ہجوم کے پاؤں تلے آ کر مسلی جا چکی تھیں۔ دو آدمی کچھ ہی فاصلے پر کھڑے آپس میں سیاسی نوعیت کی گفتگو میں مشغول تھے۔ جیسے ہی وہ ادھر ادھر ہوئے، کاشف کے ہاتھ موقع لگا۔ اس نے جلدی جلدی مسلی ہوئی پتیاں اکٹھی کر کے شاپر بھر لیا اور ادھ جلی موم بتی اٹھالی۔ وہ قبرستان کی طرف خوشی سے اچھلتا ہوا ایسے چل رہا تھا جیسے کائنات سمیٹے ہوئے جا رہا ہو۔‘‘ (17)

اسلام کے آنے سے عورت ظلم و بربریت، ذلت و رسوائی، غلامی و حق تلفی جیسے بندھنوں سے آزاد ہو گئی۔ اسلام نے عورت کو عزت و وقار بخشا اور زمانے کو اس کی تکریم کا حکم دیا۔ عورت کو زندہ زمین میں گاڑھے جانے سے خلاصی ملی۔ اسلام نے عورت کو تربیت اور نان و نفقہ کا حق، حق عصمت و عفت، ملکیت و جائیداد کا حق، حرمت نکاح کا حق اور بہت سے وہ حقوق بھی اسے دیے جو عرب

معاشرے میں اسے حاصل نہ تھے۔

عورت اگر ماں ہے تو فرمان نبوی ﷺ کے مطابق وہ حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے جنت اس کے قدموں تلے اور اس کی خدمت جہاد سے زیادہ افضل قرار پائی۔ یہی عورت اگر بیٹی کی حیثیت سے ہے تو سماجی و معاشرتی حوالے سے اسلام ہی نے اسے احترام و عزت دی۔ دو بچیوں کی اچھی پرورش پر دو انگلیوں کو جوڑ کر جنت میں اپنی قربت اور ہمسائیگی کی بشارت دی۔ بطور بہن عورت کو اعلیٰ درجہ دیا گیا۔ بیوی کے حوالے سے پاکیزگی والا رشتہ، لباس اور نعمت کہا گیا۔ شادی، مہر، زوجیت، حسن سلوک اور خلع وغیرہ کے تمام حقوق دے کر عورت کو تکریم بخشی۔

باپ کی وراثت سے بیٹی کو بیٹے کی نسبت آدھا حصہ دینے کا حکم ہے۔ ماں باپ اور بھائیوں کا فرض ہے کہ چاہے بیٹی شرعی حق کا مطالبہ کرے یا نہ کرے وہ اسے شریعت کے اصولوں کے تحت اس کا حصہ دیں۔ اگر والدین ایسا نہ کریں تو ان کے لیے سخت وعید ہے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ ''جو شخص (کسی کی) بالشت برابر بھی زمین بطور ظلم لے گا قیامت کے دن اتنی ہی زمین اس کے گلے میں طوق کے طور پر ڈالی جائے گی۔'' جو لوگ غفلت کی چادر اوڑھے لالچ و حرص کو اپنا سب کچھ سمجھ کر بہنوں بیٹیوں کا حق مار لیتے ہیں وہ حرام کا ارتکاب کر کے نہ صرف آخرت بلکہ دنیا میں بھی سزا پاتے ہیں۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں پہنچ کر بھی ہمارے یہاں بہت سے لوگوں کی سوچ آج سے چودہ سو سال قبل والی ہے۔ آج بھی بہت سے خاندانوں میں بیٹی کی ولادت پر چہرے لٹک جاتے ہیں۔ غم و اندوہ کرتے ہوئے بیٹی کو رحمت کی بجائے زحمت قرار دیا جاتا ہے۔ بعض حضرات تو عورت کو بیٹی پیدا ہونے پر طلاق تک کی دھمکی دینے لگ جاتے ہیں اور پھر ایک ظلم یہ کہ بچی اور بچے میں بچپن سے لے کر جوانی تک تفریق کی جاتی ہے۔

بالغ ہونے پر زبردستی بغیر پسند ناپسند جاننے کے شادی کر دی جاتی ہے جہیز جیسی فضول فرمائشیں کر کے بیٹی کے والدین کو ستایا جاتا ہے۔ بیٹی کا شرعی حق مہر ادا کرنے میں کوتاہی کی جاتی ہے۔ میراث سے محرومی کے لیے زبردستی حق وراثت معاف کر دو پر زور دیا جاتا ہے۔ عورت کو سماجی حوالے سے اتنا ڈرایا دھمکایا جاتا ہے کہ وہ میکہ نہ چھوٹ جائے، بھائی ناراض نہ ہو جائیں، بدنامی ہو گی جیسی باتیں سوچ کر اپنا حق معاف کرنے پر راضی ہو جاتی ہیں۔

مگر جو خواتین شوہر اور اولاد یا غربت کے باعث اپنا حق مانگتی ہیں۔ معاشرہ ان کے لیے سکون سے جینا حرام کر دیتا ہے۔ اگر میکے والے حصہ نہ دیتے ہوں اور شوہر حصہ نہ لانے پر طلاق کی

دھمکیاں دیتا ہو تو اس صورت میں عورت کی زندگی جہنم بن کر رہ جاتی ہے۔

افسانہ ''حج اکبر'' پنجاب میں جائیدادوں کے لین دین کے معاملات میں رشتوں کی کشمکش میں پھنسی عورت کو اس کی نفسیاتی کیفیات کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف میکہ حصہ مانگنے پر اپنی بیٹی سے نالاں اور ادھر شوہر جائیداد میں حصہ نہ لانے پر طلاق کی دھمکیاں دیتا ہے اور مارتا پیٹتا ہے۔ اس دوہرے جنگل میں پھنسی عورت نہیں جانتی کہ وہ آگے بڑھے یا پیچھے لوٹ جائے۔ افسانہ نگار شاہد رضوان عورت کی خود کلامی میں پوشیدہ بے بسی کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عورت تمام عمر مشروط رشتوں ہی کو بکھرنے سے بچانے میں گزار دیتی ہے۔ والدین بیٹی کی زندگی کو بیٹے کی محبت میں ہمکنار کرتے ہوئے اپنے تمام جائیداد اپنے بیٹے کے نام کر کے حج پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے سے واضح ہوتا ہے کہ مرد کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ بیٹی کے حق کا استحصال کرنے میں ماں کا کردار بھی بہت نمایاں ہے۔

ماں عورت ہو کر بیٹی اور بیٹے میں تفریق کرتی اور پدرسری نظام کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ بیٹی کا شرعی حق دبا کر تمام جائیداد بیٹے کے نام کر کے والدین کا حج پر چلے جانا بہت غیر اخلاقی اور غیر شرعی فعل ہے۔ جس کے باعث اسی مناسبت سے مصنف نے طنزاً اس افسانے کو ''حج اکبر'' کا نام دیا ہے۔

شکیلہ جب اپنے لالچی خاوند کے کہنے پر اپنے والدین سے وراثت میں حصہ مانگتی ہے تو اس کی ماں اسے جائیداد میں حصے کے مطالبے سے باز رہنے کو کہتی ہے کہ وہی عورت کامیاب ہوتی ہے جس کے پیچھے اس کا میکہ کھڑا ہو۔ جس عورت کا میکہ نہ ہو اسے سسرال والے جوتیوں کی نوک پر رکھتے ہیں۔ تمہارا بھائی یہ نہ سوچے کہ تم نے اس کے بہنوئی کو اس کا شریک بنا دیا ہے۔ باپ یہ نہ کہے کہ میری جائیداد پر پرائے پوت بٹھا دیئے ہیں۔ اس طرح کی سوچیں لیے بیچاری بیوی جب شوہر کے گھر پہنچتی ہے تو وہ اسے طلاق کی دھمکیاں دے کر گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ یہ ساری کہانی عورت کی بے بسی، مظلومیت اور دنیا میں کوئی اس کا حقیقی گھر نہیں، ظاہر کرتی ہے۔ زمین پر وہ حق جو وراثت میں خدا کی طرف سے عورت کو دیا گیا ہے۔ آج اسے لینا بہت ہی معیوب تصور کیا جانے لگا ہے۔ انسان اپنے لالچی اور حریص ہونے کے سبب خدا اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات فراموش کر بیٹھا ہے۔ اسی باعث میراث میں عورت حق سے محروم پائی جاتی ہے۔

اگر کبھی طلاق کے خوف اور بھوک افلاس کی وجہ سے ذہنی اذیت کا شکار ہو کر عورت اپنا حصہ مانگنے کا سوچے بھی تو اسے برا، بے شرم، اور بد چلن جیسے القابات کا سوچ کر منہ کو سینا پڑتا ہے۔ شاہد

رضوان نے عورت کے مسائل کو بڑی ہنرمندی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وراثت جیسے حساس موضوع پر یوں کھل کر لکھنا انہیں افسانوی میدان میں ممتاز کرتا ہے۔ دوہرے چنگل میں پھنسی عورت کی رب تعالیٰ سے فریاد اور گفتگو یوں بیان کی گئی ہے:

> ''میرے مالک! تیری شان بڑی ہے۔ تو نے دیکھا کہ ماں باپ اپنے
> جگر کا ٹکڑا تو کسی کو دے سکتے ہیں، سر کے بال کسی کے پاؤں کے نیچے دے
> دیتے ہیں مگر زمین کا ٹکڑا نہیں دے سکتے۔ انسان ایسی چیز کی طمع رکھتا ہے
> جو آج تک کسی کے ساتھ نہ گئی۔۔۔ نواز کی بات سچ نکلی، اگر میں نے بھی
> اس کی تصدیق کر دی تو وہ میرا جینا حرام کر دے گا۔'' (18)

عورت خدا کی ایک خوبصورت اور نازک ترین مخلوق ہے۔ جسے قدرت نے بڑی ہی خوبصورتی سے بنایا ہے۔ صبر و شکر اور ہمت و حوصلے کی پیکر عورت، شوہر کی رازدار اور بہترین دوست ہوتی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔ جس طرح لباس کا کام ننگ چھپانا اور زینت و زیبائش ہے بالکل اسی طرح میاں بیوی (مرد و عورت) بھی ایک دوسرے کے عیبوں کو چھپاتے ہیں۔ عصمت و عزت کے رکھوالے ہوتے ہیں۔

اچھے میاں بیوی نہ صرف ایک دوسرے کی خامیوں، کوتاہیوں پر پردہ ڈالتے ہیں بلکہ دین داری، سماج، خاندان، صحت، تعلیم، معاش غرض ہر شعبہ زندگی میں ایک دوسرے کی ترقی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں شروع عمر ہی سے بیٹیوں کو فرمانبرداری کی تربیت دی جاتی ہے۔ ماں باپ کے گھر ہی سے انہیں باپ، بھائی اور اپنے بڑوں کے آگے اونچی آواز میں بولنے، زیادہ کھلکھلا کر ہنسنے، اکیلے باہر جانے، اگلا فرد غلط ہے یہ جانتے ہوئے بھی مصلحت ہے کہہ کر چپ کروا دیا جاتا ہے۔ بات بات پر شادی سے قبل ہی ہونے والے شوہر کی فرمانبرداری کے لیکچر دیئے جاتے ہیں۔

بیٹی کی رخصتی کے وقت ماں باپ اسے یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ بیٹا اب ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تمہیں بیاہ دیا ہے اب تمہارا جینا مرنا اپنے شوہر ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ اس کی خدمت کرو، وہ جو کہے مانو، اگر میاں کچھ غلط بھی کہہ دے یا غصے میں آ کر چلائے، ہاتھ بھی اٹھا دے تو وہ مرد ذات ہے خدا رسول ﷺ نے اسے ایک درجہ، اولیت دی ہے، تم اسے برداشت کر لینا۔ شوہر کا کوئی راز عیب زمانے کو مت بتانا، ورنہ تمہاری اپنی ہی جگ ہنسائی ہوگی۔ لڑکی کا چال چلن ماں کی تربیت ہوتی ہے۔ تم کبھی اپنے شوہر کی نافرمانی نہ کرنا۔ سگھڑ مائیں ایسی پند و نصیحت کی باتیں بیٹیوں کو اپنے اپنے انداز میں سمجھاتی ہیں تا کہ ان کا گھر بس جائے اور زندگی بھی جنت بن جائے۔ کنول جو کہ اس افسانے

کی مرکزی کردار ہے۔اس کی ماں نے شہریار سے شادی کے وقت اپنی بیٹی کو سمجھایا تھا کہ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔اس کی ناراضگی خدا کی ناراضگی کے مترادف ہے۔شوہر کے ماں باپ کا احترام کرنا بھی تمہارا فرض ہے۔ازدواجی زندگی کا سکون شوہر کی فرمانبرداری میں ہی پنہاں ہے۔نہ فرمان عورت نہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی۔شوہر کی عزت سے ہی بیوی کی عزت وابستہ ہے۔

کنول نے بھی فرمانبردار بیٹی کی طرح ماں کی ہر بات پر عمل کیا اور اپنے شوہر شہریار کی جی حضوری کی، یہاں تک کہ شادی کی پہلی شب ہی اس کا خاوند نیند کی دوا کھا کر اپنی مردانہ کمزوری کے باعث سو گیا اور وہ بیچاری ساری رات اپنی بیبسی کا ماتم کرتے خاموشی سے کروٹیں بدلنے میں گزار دیتی ہے۔عروسی لباس، گلابوں سے سجا کمرہ پھولوں کی مہک، زیورات ہر چیز اسے بھاری گزرتی ہے۔ وہ پیاسی نگاہوں بجھے دل اور مرتے ارمانوں کے ساتھ عروسی جوڑا پہنے بے چینی اور درد کی وادیوں میں اتر جاتی ہے۔صبح اٹھنے پر شہریار بیوی سے کہتا ہے کہ فٹنس کا کچھ پرابلم ہے میں دوائی کھا رہا ہوں، جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ڈاکٹرز نے کچھ دنوں کے لیے پرہیز کرنے کا کہا ہے۔میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔بات باہر نکلی تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔دوست اور رشتہ دار سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ ولیمے کا سارا بندوبست چوپٹ اور مزہ کر کرا ہو جائے گا۔کرن شوہر کی بات پر فرمانبردار بیویوں کی طرح خاموشی سے گردن جھکا دیتی ہے۔اہل خانہ اور بہنوں کے پوچھنے پر وہ فقط مسکرا دیتی ہے۔کئی روز اسی طرح بے چینی میں سلگتے گزار دیتی ہے۔وقت یوں ہی گزر جاتا ہے۔کرن بجھتی، روز جیتی مرتی رہتی ہے۔سماج، اپنوں اور غیروں کی تلخ اور چبھتی ہوئی باتوں کا سامنا کرتی ہے،ساس ہر لمحہ اسے طعنے دیتی رہتی ہے، اس کے ماں باپ اور ہر آنے جانے والے کے سامنے اسے بانجھ زمین قرار دیتی ہے۔

کرن کے جذبات کی مچلتی نرم کلیاں وقت کے ساتھ روز سرد مہری کے آسیب کی نذر ہو جاتیں۔دن تو ادھر ادھر کی باتوں میں گزر جاتا لیکن رات کاٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا۔وہ اپنے درد کا اظہار کس سے کرے۔اگر ماں کو بتائے گی تو وہ صبر وشکر کی تلقین کرے گی۔ یہ سوچ کر وہ چپ ہی رہتی ہے اور خاوند کی رازدار ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔

اس دوران سب لوگوں کی باتیں صبر سے برداشت کرتی رہتی ہے۔ساس زیرناف تعویز باندھنے، دم کیا پانی پینے کا کہتی اور جب کچھ فرق نہ پڑا تو اسے بے اعتقادی کے طعنے دینے لگی، پوتے کی خواہش میں بڑھیا جوان لڑکی کا جینا حرام کر دیتی ہے، زبردستی نرس کو دکھانے کی ضد کرتی ہے اور

نرس اسے دوائیاں پکڑا کر رخصت کر دیتی ہے۔

کنول چڑچڑاہٹ، تلخی اور غصے کا شکار ہو کر دن بدن سوکھ کر کانٹا بن جاتی ہے۔اس کی خوبصورتی اور حسن تیزی سے ماند پڑنے لگتا ہے۔وہ شوہر کا پردہ رکھتے تھک چکی ہوتی ہے۔بڑھیا سے نرس کہتی ہے کہ تمہاری بہو کا کہنا ہے کہ میرا خاوند شہریار نامرد ہے۔جس پر بڑھیا سیخ پا ہو کر دہ جاتی ہے۔اسے چڑیل، کمبخت اور بیٹے کی دوسری بیوی لانے کا طعنہ دیتی ہے۔آج کل ہمارے معاشرے میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے کہ مرد اولاد پیدا کرنے کی طاقت سے محروم ہوتا ہے، معصوم بیچاری بیوی عزت کا بھرم رکھنے کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی رہتی ہے، خود کو خود ہی تکلیف دیتی رہتی ہے۔یہاں تک کہ زمانہ اسے ''بانجھ'' اور ''بد چلن'' جیسے القابات سے نوازتا ہے۔

عورت بیچاری صبر کا پتلا ہے۔سب کچھ سہہ لیتی ہے مگر جب وہ خاوند کی دوسری شادی کا سنتی ہے تو وہ آگ بگولا ہو جاتی ہے، سوتن کا ذکر اسے چٹان کی طرح مضبوط بنا دیتا ہے۔اس کی اپنی زندگی تو برباد ہو جاتی ہے مگر وہ کسی اور کی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی۔اندر کی طاقت اسے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔مرد کی طرف سے لگائے الزامات اسے سچ بتانے پر مجبور کرتے ہیں۔''بانجھ زمین'' اک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جو کہ نہ صرف اپنے شوہر کی مردانہ کمزوری کا بھرم رکھتی ہے بلکہ تمام خاندان اور گھر والوں کے ہمراہ اسے اہل محلّہ کی باتیں، طعنے، اور بدتمیزی بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔یہ سب ذہنی سکون کو غارت اور روح کو چھلنی کر دینے والا ہوتا ہے۔

چونکہ اس کی تربیت ایک ایسے دینی گھرانے میں ہوئی ہوتی ہے جہاں مجازی خدا کے درجے اور احترام سے متعلق لڑکی کو سکھایا جاتا ہے۔اس لیے وہ سب کچھ چپ چاپ سہ لیتی ہے مگر اس لمحے اس کا نامرد مجازی خدا اس کے کردار پر الزام تراشی کر کے اسے گندا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ تڑپ جاتی ہے۔وہ اپنا قصور جاننے کا حق رکھتی ہے۔مگر مردانہ رعونت سر چڑھ کر بولتی ہے اور وہ تڑاخ کر سب کے سامنے جواب اس کے منہ پر دے مارتی ہے۔''تم نامرد ہو'' اصل میں نامردی جسمانی طور پر بیمار ہونا نہیں بلکہ اصل تو ذہنی بیماری ہے۔تم نے تو اپنی کمزور اور خباثت پر پردہ ڈالنے کے لیے مجھے بدکردار بنا ڈالا۔یہ کہانی عورت کی اندرونی اور اور بیرونی جنگ اور ستم گر سماج کے اصلی روپ کی بہترین عکاس ہے:

> ''تم اتنی گھٿیا بات کر سکتے ہو میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔تمہاری اصل نا مردی آج سامنے آئی ہے۔جسمانی طور پر بیمار ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا لیکن ذہنی بہت خطرناک اور لاعلاج ہے۔تم جسمانی سطح پر ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی بیمار ہو۔اپنی کمزوری اور خباثت چھپانے کے لیے مجھ پر بدچلنی

کا الزام لگا رہے ہو۔ میں نے پہاڑ جیسی جوانی کا جبر سہا لیکن تیری عزت
پر حرف نہ آنے دیا۔ تم نے میرے صبر کا اچھا صلہ دیا ہے۔"(19)

نکاح ایک بہت خوبصورت اور پاکیزہ رشتہ ہے جو جائز طریقے سے جنسی سکون پانے اور نسلِ انسانی کے ارتقاء کا ایک ذریعہ ہے۔ نکاح جیسے مقدس رشتے میں بندھ کر میاں بیوی ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی پاتے، ایک دوسرے کو سمجھتے اور ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر یہ ہم آہنگی اور پیار و محبت دونوں ساتھیوں میں پیدا ہو جائے تو جیتے جی زندگی جنت بن جاتی ہے۔

شادی، نکاح یا بیاہ ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی لڑکی کے جذبات مچلنے لگتے ہیں۔ کسی پیار کرنے اور خیال رکھنے والے ساتھی کی ضرورت اسے شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کا بھی اپنا گھر ہو جس کی وہ اکلوتی ملکہ ہو، ننھے منھے شرارتیں کرتے بچے ہوں جن کی وہ پرورش کرے۔ مگر ایسا تب ممکن ہے جب ایک جائز اور حلال طریقے سے نکاح کے پاکیزہ فریضے کو انجام دیا جائے۔

جوان بیٹیوں کے والدین کو ان کے ہاتھ پیلے کرنے اور ان کو دیس پیا سدھارنے اور بھیجنے کی بڑی جلدی ہوتی ہے۔ اولاد کا فرض ادا کرنے کی فکر میں بہت سے ماں باپ کو تو راتوں کو نیند تک نہیں آتی۔ پوتوں، پوتیوں کے ساتھ نواسوں، نواسیوں کو بھی گود میں کھلانے کے ارمان ہر ماں باپ ہی کو تقریباً ہوتے ہیں۔

اولاد خصوصاً بیٹی سے بالغ ہونے کے بعد کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو تمام خاندان کی عزت نہ ڈوب جائے، یہ سوچ کر والدین ان کی جلد شادی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے بدقسمت معاشرے میں ہر لڑکی کے نصیب میں دلہن بننا کہاں لکھا ہوتا ہے۔ بعض بے رحم خاندانوں میں تو صرف جائیدادوں کے لالچ اور زمین کی بھوک میں بیٹیوں کو ساری ساری عمر در و دیوار تکنے اور بے بسی کی زندگی گزارنے کے لیے بٹھا دیا جاتا ہے۔ بعض کو ونی کر کے خاندان کے مردوں کے جھگڑوں کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ بہت سے علاقے ایسے بھی ہیں کہ جہاں جوان لڑکیوں کو قرآن پاک سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ یہ سب بہت غلط اور غیر شرعی ہے۔ صرف جھوٹے اور نقلی رسوم و رواج کی فطری ضرورتوں کو بری طرح کچلا جاتا ہے۔ عورت کے ارمانوں کا قتل ہوتا ہے۔ اسے نکاح کی اجازت صرف اسی غرض سے نہیں دی جاتی کہ کہیں یہ یا اس کا خاوند کل کو جائیداد میں حصہ ہی نہ طلب کرنے لگ جائیں۔ یوں ہمارے خاندان کی زمینیں باہر والوں کے حصوں میں آ جائیں گی۔ یہی سوچ کر

بیٹیوں کو گھروں میں قیدیوں کی طرح بٹھا دیا جاتا ہے۔انہیں صرف چوہدریوں کے بیٹیاں ہونے کی کڑی سزا دی جاتی ہے۔کبھی تو خاندان میں ہونے والے بچوں کو بغیر بیاہ کے ان کی گود میں پلنے کے لیے یہ کہہ کر ڈال دیا جاتا ہے کہ کل کو بھی تو بچے ہی پالنے ہیں ناں بیاہ کے بعد۔ایسے ہی پال لو اور اسی سے ممتا کو تسکین دو۔اول تو کوئی لڑکی اس ظلم کے خلاف بغاوت نہیں کرتی لیکن اگر کوئی کسی دیوانے پر دل ہار بیٹھے یا نکاح کی بات بھی کرے تو خاندان کی بڑی بوڑھی عورتیں ان کا منہ یہ بول کر چپ کروا دیتی ہیں کہ تم سے پہلے بھی بہت سی اسی خاندان کی کنوارے ہی زندگی گزار رہی ہیں تم کون سی انوکھی ہو۔کسی نے آج تک خاندانوں کے رسم ورواجوں سے بغاوت نہیں کی تو تم بھی مت کرنا،ورنہ خاندان کے مرد حضرات تمہیں جان سے ماردیں گے۔باپ اور بھائیوں کی پورے گاؤں میں بہت عزت ہے ڈگمگا کر کوئی غلط قدم مت اٹھانا ورنہ تمہارے بھائی اور باپ کہیں منہ دکھانے لائق نہیں رہیں گے۔

ان سب باتوں کی وجہ سے لڑکیوں کو اپنا دل پتھر کر کے عمر بھر خود پر جبر کرنا ہوتا ہے۔یہ سب گھٹ گھٹ کر روز مرنے اور پہاڑ سی جوانی کانٹوں پر ننگے پاؤں چلنے جیسا ہے۔اگر کوئی دوشیزہ ان دو بڑی بڑی حویلیوں کی جھوٹی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش بھی کرے تو اسے زہر دے کر،نیند کی گولیاں کھلا کر یا بندوق سے بھون کر نیند کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اتار دیا جاتا ہے۔یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے جو آج بھی پنجاب اور سندھ کے بہت سے علاقوں میں دہرایا جاتا ہے۔بہت سی جوان کلیاں پھول بننے سے قبل ہی فرسودہ روایات کی نظر کر دی جاتی ہیں۔اصل میں ان اونچی حویلیوں میں بسنے والے لوگ بہت ہی چھوٹی ذہنیت والے ہوتے ہیں۔سسکتی بہنوں، بیٹیوں کو فقط جائیداد ھتھیانے کے لیے تڑپنے کے لیے قرآن سے بیاہ دیا جاتا ہے۔قرآن ہی کی آیتوں کہ باپ کی وراثت میں بیٹے کے دو اور بیٹی کا ایک حصہ ہے کو جھٹلایا جاتا ہے۔عورتوں کی جنسی جبلت اور فطری جذبے کی ناقدری کر کے انہیں ذہنی مریضہ اور پاگل بنا دیا جاتا ہے۔

قرآن سے شادی کا کہہ کر شادی کی غلط طریقے سے تشریح کی جاتی ہے۔نکاح تو مرد و عورت کے رشتہ ازدواج،جنسی تسکین اور تولید انسانی کا جائز ذریعہ سے اظہار ہے۔اگر ایک انسان اور دوسرا اس کے علاوہ کوئی اور ہو تو یہ شادی نہیں بلکہ رہبانیت کی طرز ہے کہ جہاں مرد و عورت کی مذہب کے ساتھ شادی کی جاتی ہے اور عمر بھر اکیلے اور مجروح رہنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔نبی کریم ﷺ کے اس حوالے سے واضح احکامات موجود ہیں کہ ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں'' بلکہ آپ ﷺ نے صحابہ کے شادی نہ کرنے ،تمام عمر روزے رکھنے

اور عبادات میں مشغول ہونے کا سن کا سخت الفاظ میں حوصلہ شکنی فرمائی۔

عزت سے نکاح ہر عورت کا شرعی اور آئینی حق ہے۔ جسے قرآن سے شادی جائز نہیں۔ خاندان میں تمہارے جوڑ کا کوئی نہیں اور ہم تمہیں کسی ایرے غیرے کے حوالے نہیں کریں گے، جیسی بے ہودہ اور منحوس خاندانی سوچ کے باعث بیٹیوں کو عمر بھر قیدیوں کی طرح گھر پر بٹھا کر رکھنا کسی صورت درست نہیں۔

قرآن سے شادی آج کے معاشرے کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔جس کے خلاف آواز بلند کرنے اور حکومتی حوالے سے پابندی لگانے کی اشد ضرورت ہے۔لوگوں کو اس حوالے سے آگاہی اور شعور دینا بھی بہت ضروری ہے۔تاکہ ان فرسودہ اور بیکار رسموں کی وجہ سے کسی جوان بیٹی کی جوانی برباد نہ ہو۔شاہد رضوان ایک ایسا قابل قدر افسانہ نگار ہے کہ جس نے عورت پر ظلم کے خلاف بہت کچھ لکھا اور معاشرے کے بھیانک چہرے سے جھوٹی عزت اور جعلی وقار کا پردہ چاک کیا۔عورت بھی انسان ہے،اس طرف معاشرے کی توجہ دلائی۔افسانہ "اونچی حویلی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے:

> ’’اونچی حویلی والے لڑکیوں کی شادیاں اس ڈر سے نہیں کرتے کہ کہیں باپ دادا کی زمین تقسیم ہو کر کم نہ ہو جائے۔اس خاندان میں لڑکیوں کی شادی نہ کرنا دیرینہ قباحت تھی۔منطق یہی تھی کہ لڑکیاں زمین مانگیں گی۔اگر کسی طرح لڑکیوں نے زبان بند بھی رکھی تو ان کے پر پرزے نکل آئیں گے اور چوہدری خاندان کسی طرح اپنی زمینوں میں کسی کو حصہ دار بنانے کو تیار نہیں تھا۔لڑکیوں کا نکاح کلام پاک سے کر دیا جاتا تھا۔کہا یہ جاتا تھا کہ یہ بڑے خاندان کی لڑکیاں ہیں کوئی بَر ان کے ہم پلہ نہیں ملتا۔‘‘(20)

جسم فروشی دنیا کے دو قدیم ترین پیشوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایسا پیشہ ہے جو بنت حوا پر جبراً مسلط کیا جاتا ہے۔ یہ پیشہ انسانی فطرت اور جنسی تسکین کے ظالمانہ رویوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہاں مظلوم ہی گناہ گار اور قابل نفرت قرار پاتی ہے۔ وہ مرد حضرات جو گھر کی شریف زادیوں سے اکتا کر رات کی سیاہی میں طوائفوں کے کوٹھوں کا رخ کرتے ہیں، اپنی جانوروں جیسی بے لگام ہوس پوری کرنے کے لیے جیبوں میں نوٹ بھر کر بازار حسن کو نکلتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم ان سے اس ناجائز خصلت کے باعث نفرت کریں، الٹا ہم اسی عورت کو حرامی قرار دیتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ اصلاح کی بجائے ایسی عورتوں کو برے برے القابات سے نوازتا ہے۔کبھی

"رنڈی"، چھنال"، گشتی"، "حرامزادی"، "دو ٹکے کی عورت"، " گندی نالی کا کیڑا"، " کمرشل سیکس ورکر" تو کبھی " کوٹھے والیاں رذیل"، بد قماش "، حرافہ "، "رذیلہ" "طوائف"، "دلدل کی پوٹلی" دھندا کرنے والیاں" غرض اس طرح کے بے شمار نام دیئے جاتے ہیں۔

دنیا کے ہر کام میں کسی نہ کسی طرح ڈنڈی مار کر بے ایمانی کی جا سکتی ہے۔ مگر طوائف کا پیشہ شاید وہ واحد پیشہ ہے کہ جس میں رہتے ہوئے، چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی خوش اسلوبی یا زبردستی اسے اپنا کام مکمل ایمانداری سے برتنا ہوتا ہے مگر اس کے باوجود بھی اس کی کمائی حرام و بدکاری کی کمائی ہے۔ یہاں آنے والے شریف اور اور ادھر کی رہنے والیاں بدکار کہلاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اگر کسی عورت سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو زمانہ اسے معاف نہیں کرتا۔ اس کی ایک نادانی پر کوئی اس کو عزت سے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ بہت سی لڑکیوں کو غیرت کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ تو کئی جو زبردستی ہراساں، جنسی درندگی کا نشانہ بننے، گھر سے بھاگ کر شادی کے بعد شوہر کے چھوڑ جانے پر مجبوری میں طوائف بن کر پیٹ کی آگ بجھاتی ہے۔ مجبوریاں، معاشرتی دھتکار یا جنسی درندگی انہیں یہ سب کرنے پر مجبور کرتی ہے کیونکہ کوئی ماں کا لال یا کسی خاندان والے اسے اپنی بیوی، بہو بنانے کو تیار نہیں ہوتے۔ شاید اک کوٹھے والی کو اپنی عزت بنانے پر ان کی اپنی عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

اس سب کے برعکس مرد اس گنگا میں ہاتھ دھونے کے باوجود بھی پاکیزہ رہتا ہے۔ معاشرہ ان ناپاک حرکتیں کرنے والوں کا گند اپنے وجود میں سمونے والی کو تو گندا کہتا ہی ہے مگر ان نام نہاد مردوں کا کیا جو معاشرے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرشتے بنے پھرتے ہیں جو تنہائی میں عورت کے تلووں کو چاٹ سکتے ہیں۔ اس کا جسم نوچ کر اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکتے ہیں مگر اسے سب کے سامنے عزت سے اپنا نہیں سکتے۔ اپنانا تو دور کی بات اس کی ذات کی توہین کی جاتی ہے۔ برے ناموں اور جگہ جگہ غلط تذکروں سے نا صرف اس کی بلکہ اس کی اولاد کی بھی بدنامی کی جاتی ہے۔ اگر کسی ایسی عورت کی کوئی اولاد ہو تو یہ معاشرہ اسے بھی کسی صورت قبول نہیں کرتا۔ ''تم اپنی ماں کے ساتھ فلاں کی شب بازی کا نتیجہ ہو۔''، ''ناجائز اولاد، نالی کا کیڑا'' اور دل چیرنے والے جملے کسے جاتے ہیں۔ اگر طوائف کی اولاد میں سے کوئی بیٹی ہو تو معاشرہ اس کی بھی معصومیت لوٹ کر اسے بھی طعنے دے دے کر اسی دلدل میں دھکا دے دیتے ہیں۔ افسوس کے اپنی مرضی سے طوائف کی بیٹی طوائف کے سوا کوئی پیشہ نہیں چن سکتی۔ یہ ظالم سماج اس کے جذبات واحساسات کو کچل کر اس کی ماں کے ماضی کو اس کے

سامنے لے آتا ہے۔ اگر وہ کسی سے محبت کر بیٹھے یا عزت سے نکاح کرنا چاہے تو زمانہ اپنے نوکیلے اور کٹیلے رویے سے اس کے ان سب خوابوں کو چکنا چور کر دیتا ہے۔ لوگ تو اسے انسان ہی نہیں سمجھتے۔

خانم اور اس کی بیٹی کا قصہ بھی اسی تکلیف اور درد سے لبریز ہے جو کہ ایک طوائف اور اس کی جوان اولاد کو معاشرے کی طرف سے سہنا پڑتا ہے۔ شاہد رضوان نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر بڑی ہی جرات مندی اور معاشرتی فکر و دردمندی کا اظہار کیا ہے۔ ''افسانہ آخری سیڑھی'' ایک ایسی طوائف کا قصہ ہے جو سماج کے بے رحم رویوں کی ستائی، مجبوری کے تحت یہ دھندا کرتی ہے۔ تاہم وہ درد کی ماری اپنی بیٹی کو اس غلاظت سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ مگر سماج کے بے رحم لٹیرے ایسا نہیں ہونے دیتے اور اس کی بیٹی کو بھی آخر کار اسی دوزخ کا حصہ بننا پڑتا ہے۔ آج ہم سب کو یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر ایک طوائف "طوائف" بننے پر مجبور کیوں ہوتی ہے؟ ایک معاشرہ طوائف کی اولاد سے ہنسی خوشی عزت سے جینے کا حق کیوں چھین لیتا ہے؟ کیا طوائف کی بیٹی کی کوئی زندگی نہیں؟ کیا ان کے اپنے کوئی جذبات و احساسات نہیں؟ کیا طوائف کو سکون اور عزت سے جینے کا کوئی حق نہیں؟ اگر وہ انسان ہے تو ہمیں اسے عزت سے جینے کا حق دینا ہوگا۔ اسے اور اس کی اولاد کو اس دلدل سے نکال کر گھر کی دہلیز تک لانے میں وہی مرد اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں جو اس کے تقدس، اس کی عفت کی بے حرمتی کرتے ہیں۔

ہمارے سرکاری اداروں کو ایسی برائیوں کی روک تھام، ایسی خواتین کو ہنر مندی کے کام اور دیگر روزگار دینے کے ہمراہ ہمارے نوجوانوں کی اخلاقی و ذہنی تربیت کرنے کی بھی بہت ضرورت ہے۔ ماں باپ کو بھی اولاد کے احترام کے قوانین سکھانے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم سب پاک رہیں گے تو ہمارا معاشرہ بھی پاک رہے گا۔

> ''مرد ذات کیا سمجھتا ہے خود کو، سرِ شام ہی ہماری منڈیوں کے گرد دم ہلانے والا کوٹھے کی سیڑھیاں اترتے ہی اخلاق اور پارسائی کا چوغہ پہن لیتا ہے، جیسے اس سے بڑا کوئی ولی نہ ہو۔ خدا کی شان ہے کہ کوٹھے پر آنے والے معزز کہلائیں اور کوٹھے پر رہنے والیاں رذیل۔ طوائف، حرافہ، رذیلہ، بدقماش، بداطوار، جسم فروش، دھندا کرنے والیاں، غرض اس معاشرے نے ہمیں کتنے نام دیئے ہیں۔ ہمارے جسموں کو نوچ نوچ کر کھانے والا فرد گردن اونچی کر کے چلتا ہے اور نیک بھی رہتا ہے۔'' (21)

ملک پاکستان جہاں دیگر بہت سے مسائل سے دوچار ہے وہیں ہر سال ہی تقریباً سیلاب کی تباہ کاریوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس کے باعث زرعی فصلیں جڑوں سے اکھڑ جاتی ہیں، گھروں کے گھر زمین بوس ہوکر ملبے کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔مال ومویشیوں کی ہلاکت ہوتی ہے، بہت سی بیماریاں جنم لیتی ہیں، جان واملاک کوشدید نقصان پہنچتا ہے۔ناصرف یہ بلکہ ظالم سیلاب سے بہت سی بے گھر ماؤں بہنوں کی عزتیں نیلام تک ہو جاتی ہیں۔افسوس سیلاب آنے سے قبل محکمہ موسمیات اور نیشنل ڈیزاسٹر سیل متاثرہ علاقوں میں وقت سے پہلے ہی آگاہی کی بگل تو بجا دیتے ہیں تاہم متاثرین کے لیے متبادل گھر یا سیلاب کی روک تھام کے لیے مؤثر حکمت عملی نہیں اپنائی جاتی اور ہر بار بھارتی دشمنی کا کہہ کر اور دریاؤں میں اضافی پانی چھوڑنے سے سطح پانی بڑھنے کی کہانی سنا کر عوام کو چپ کروا دیا جاتا ہے۔یہ سب اپنی جگہ مگر ایک غریب کو ان ڈیموں کے منصوبوں سے کیا حاصل جس کا سب کچھ پانی کی نذر ہو گیا ہو۔مون سون کی بارشیں جہاں من چلوں کے لیے رومانوی اور انجوائمنٹ کا موسم ہوتی ہیں،لوگ دریاؤں،نہروں پر پکنک مناتے ہیں، بارش میں بھیگتے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔وہیں یہ بارشیں بہت سے شہری اور دیہی علاقوں کے لیے سیلاب کی سی تباہی بھی لاتی ہیں۔پانی کے اخراج کی خطرناک حد تناسب کو کنٹرول کرنے کے لیے دریاؤں کے بندوں پر شگاف ڈالا جاتا ہے۔جس کے باعث اخراج شدہ پانی کم آبادی والے ان علاقوں جو دریا کے قرب و جوار میں ہوں، میں داخل ہو جاتا ہے جس کے سبب سڑکوں، پلوں اور املاک کوشدید نقصان پہنچتا ہے۔

ان بارشوں اور سیلاب سے کئی ہنستے بستے گھر پانی میں بہہ جاتے ہیں،مکانات پر پہاڑی تودے گر جاتے ہیں بلکہ اکثر تو کچے مکانات کے مکینوں پر ہی ان کے مکانوں کی چھتیں گر پڑتی ہیں۔غریب کی تو زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔کھانا پینا،اوڑھنا، پہننا کچھ بھی تو نہیں بچتا۔سیلابی ریلے اپنے ساتھ غریب کا سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔

حکومتی سطحوں پر ان قدرتی آفات کے حوالے سے صرف اعلانات ہی کیے جاتے ہیں۔عوام کو رہنے اور دوبارہ نارمل زندگی گزارنے کے لیے کوئی لائحہ عمل تک اختیار نہیں کیا جاتا۔لہر یا سیلابی صورت حال کے تحت علاقے اور بستیاں خالی کروالی جاتی ہیں۔غریب بے آسرا اور بے ٹھکانہ ہو جاتا ہے۔عوام بجائے اپنے ان مجبور غریب بہن بھائیوں کی مدد کرنے کے،بے حس بنے ان کا مذاق اڑاتے اور تذلیل کرتے ہیں۔آج ہمارے معاشرے مین رشتوں کا تقدس ختم ہو گیا ہے۔

قرآنی حکم کہ ''مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔'' کو لوگوں نے بھلا دیا

ہے۔ اخوت اور بھائی چارے کی جگہ بے حسی نے لے لی ہے۔ احساس انسانیت ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔ باہمی محبت اور رحم دلی ختم ہو چکی ہے۔ رشتوں کی جگہ روپے پیسے نے لے لی ہے۔ امیر اور غریب کے سٹیٹس میں اتنا فرق آ گیا ہے کہ امراء، غرباء کو فالتو دھرتی پر بوجھ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ اس افراتفری اور نفسانفسی کے دور میں اگر کوئی قدرتی آفت آن پڑتی ہے تو محلوں جیسے بنگلوں اور شہروں میں رہنے والوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیہاتی اور کچے مکانوں کے مکینوں پر کیا قیامتیں ٹوٹ پڑتی ہیں، وہ اس سب سے بے پرواہ ہنسی خوشی زندگی جیتے ہیں۔ بارشوں سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے من چلے ان موسموں میں دریاؤں، سمندروں اور نہروں کا رخ کرتے ہیں۔ دریاؤں کے قرب و جوار کے علاقوں، پلوں اور ساحل سمندر پر پکنک پوائنٹ کا سا سماں بندھ جاتا ہے۔ طرح طرح کے پکوانوں، سموسوں، پکوڑوں، شربتوں، نان چنے اور دیگر خورد نوش کی اشیاء کے اشتعال انگیز ٹھیلے سج جاتے ہیں۔ دریاؤں کی لہروں میں اتار چڑھاؤ اور ٹھاٹھیں مارتیں موجوں کا سن کر جوق در جوق دیوانوں کا ہجوم امنڈ آتا ہے۔ جہاں نئے نویلے جوڑے، جوان، بوڑھے، بچے سب خوشی سے نہال یہاں کا رخ کرتے ہیں، وہیں بہت سے آوارہ، اوباش اور لفنگے افراد بھی جیبیں کاٹنے، ساز و سامان لوٹنے، نوجوان لڑکیوں سے چھیڑ خانی اور آنکھ مٹکا کرنے ایسی جگہوں پر آ ٹپکتے ہیں۔

جوں ہی لہروں میں طغیانی زور پکڑتی ہے اور بپھری ہوئی موجیں دریاؤں کے سینے چیر کر بستوں کا رخ کرتیں ہیں تو کئی لاکھ کیوسک پانی دیہاتوں میں داخل ہوتا ہے۔ کچے مکانوں کے مکین جو کل پرسوں تک صبر و شکر کے ساتھ سفید پوشی کی زندگی جی رہے تھے ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ سارا سال محنت کر کے لگائی گئی فصلیں جو پک کر کٹنے کے لیے تیار ہوں، تباہ ہو جاتیں ہیں۔ گنے کپاس اور دھان کے کھیتوں اور پودوں میں گھرے مکانات زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان سب بہہ جاتا ہے۔ بھینس، بکریاں، مال مویشی سب پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔

''پکنک پوائنٹ'' شاہد رضوان کا ایسا افسانہ ہے جو کہ سیلابی ریلے کی داستان سناتا ہے۔ راوی کنارے بسنے والی بستی کی رجو اور اس کا بوڑھا باپ ان طوفانی بارشوں سے دریا میں آنے والی ظالم لہروں اور سیلاب کے سبب جب اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتے ہیں اور کھانے پینے کو کچھ نہیں بچتا تو جوان رجو اپنے زمین بوس گھر سے بچے کھچے جانور اور باقی ماندہ سامان لانے کے لیے کمر تک بڑھے ہوئے سیلابی پانی میں اترتی ہے تاکہ وہ اپنی بکریاں، بھینس، اس کے کٹرو، مرغے اور چوزوں کو بحفاظت راوی پل کی اونچی سڑک پر لا کر سیلابی ریلے سے بچا سکے۔ اس کے بوڑھے باپ کو کالا ناگ

کاٹ چکا ہے۔ بوڑھا راوی سڑک کنارے چارپائی پر لیٹا درد سے نیلا ہو رہا ہے۔ پٹی نہ ہونے کے سبب رجو اپنے دوپٹے کا ایک پلو کاٹ کر اپنے نحیف باپ کے پاؤں پر پیاز باندھ دیتی ہے۔

بار بار گندے پانی میں اترنے کی وجہ سے اس کی ٹانگوں پر پھنسیاں بن چکی ہیں۔ اس کے پاؤں پر کیکر کی کئی نوکیلی سولیں چبھ گئیں تھیں مگر وہ مسلسل گھر سے کبھی باپ کے لیے بستر تو کبھی اس کی بھوک مٹانے واسطے روٹی لانے کے لیے پانی میں اترتی رہتی ہے۔ کالے سیاہ ناگنوں، کیڑوں، گڈوئیوں اور بچھوؤں سے بھرے پانی میں ڈرتے پھونک پھونک کر قدم رکھتے جب وہ سامان لا چکی تو دیکھتی ہے کہ اس کا بورھا باپ بھوک سے بچوں کی طرح بلک رہا ہے۔ اس سے باپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ پانی سے واپس آنے تک اس کا تن بدن گیلا ہو چکا ہے۔ سستی لان کے پرانے کپڑے اس کے جسم سے چپک کر اس کے جسم کے تمام خدوخال بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ اردگرد لوگ سیلاب سے راوی میں اٹھنیوالی لہروں، بارش اور ہلکی ہواؤں کا لطف لے رہے تھے۔ بچے، بوڑھے، لڑکیاں، لڑکے سب کے چہرے ہشاش بشاش تھے۔ کسی کی آنکھ میں ان معصوموں کے لیے بے گھر ہونے کا کوئی دکھ نہ تھا نہ سوگوار تھے۔ عوام مزے لے لے کر سموسے، پکوڑے، چٹخارے کھا رہے تھے تو کوئی نان چنے اڑا رہا تھا، تو کہیں مشروب پیے جا رہے تھے۔ تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم لگا تھا۔ لوگ ننگے سر بیٹھی زندگیوں کو شہوت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کو بھی ان بے آسرا لوگوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ برے اوباش لڑکے آوازیں کس رہے تھے۔

رجو بوڑھے باپ کی بھوک مٹانے کے لیے نان والے سے نان دینے کی التجا کرتی ہے تو وہ گھٹیا آدمی رجو کی الہڑ جوانی کا سر تا پاؤں قصاب کی صورت معائنہ کرتا ہے۔ "اک رات میرے نام کر دو اور بھلے سارے نان لے جاؤ" کہہ کر اپنی خباثت اور غلیظ سوچ کا اظہار کرتا ہے۔ ادھر بوڑھا باپ بھوک سے نڈھال دم توڑ دیتا ہے۔ بیچاری رجو باپ کے کفن اور اس کے جسم کو ڈھانپنے کے لیے گھر سے چادریں لانے ایک بار پھر پانی میں اترتی ہے۔ دو عیاش لفنگے برابر اس کا پیچھا کرتے ہیں، آتے جاتے آوازیں کستے ہیں۔ لوگ پانی میں گری بے بس رجو کی تصویریں بناتے ہیں۔ کوئی اس کے نازک بدن سے چھیڑ خانی کرتا ہے تو کسی کے ہاتھ اس کے گریبان میں جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کے جانور، مویشی کوئی چوری کر کے لے جاتا ہے۔ برتن رضائیاں سب غائب ہو چکے ہیں۔ ہوس پرست نگاہیں رجو کے جسم پر لگی گدھوں کی طرح اسے گھور رہی ہیں۔ وہ دل میں ان نظروں کو کوستی اور آدم خور کہتی چلی جاتی ہے۔ اتنے میں کسی اوباش نے اس کے کولہے پر چٹکی کاٹ لی، ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے

سر پر اٹھایا خالی صندوق بیچ سڑک پر پھینک دیا اور وہاں بہت چپ پڑ گئی اور وہ یوں گویا ہوئی کہ، ''تم سب تماشا دیکھنے آئے ہو، سب کو بلاؤ کوئی رہ نہ جائے۔''

تکالیف، مصائب اور درد کو سہتی لڑکی نے سماج کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور معاشرے کی بے حسی پر بولی کہ تم سب کیسے انسان ہو۔ میرا باپ بنا گور و کفن مردہ پڑا ہے، میرے مال مویشی، بکریاں اور بیلوں کی جوڑی بھی کوئی لے گیا ہے اور تمہاری ہوس بھری نگاہیں صبح سے شام تک میرا پیچھا کرتی ہیں تم لوگوں نے کبھی لڑکی نہیں دیکھی؟ میرے پاس ایک عزت ہی بچی ہے تم سب وہ بھی لوٹنا چاہتے ہو تو آؤ گدھو، آؤ میرا جسم تار تار کرلو، میرا گوشت، بوٹی بوٹی نوچ کھاؤ، یہ کہہ کر رجو اپنی قمیض اتار پھینکتی ہے۔

شاہد رضوان کا یہ افسانہ اپنے اندر ایک گہرا کرب سمیٹے ہوئے ہے۔ امیری غریبی کا فرق، سیلابی عذاب سہتے انسان اوران کی مجبوری و بے بسی کا تماشا اڑاتے، کیمرے کی آنکھ میں کیچ کرتے عوام اس افسانے کا خاص موضوع ہیں۔ حالات کی تلخیوں اور تماشائیوں کی بے حسی اور لوگوں کے رویوں، انسانوں کی اندرونی غلاظتوں اور ذہنی خباثتوں نے مل کر ایک جوان دوشیزہ کی جوانی لوٹ لی۔

> ''بھائیو ہم کیسے بے حس اور ناسمجھ لوگ ہیں۔ چاند اور سورج کو گرہن لگتا ہے تو ہم توبہ استغفار نہیں کرتے بلکہ تصویریں بناتے ہیں۔ سیلاب آیا اور تم تصویریں بناتے ہو، تم اس قدر بے رحم ہو، تمہاری خنزیر جیسی آنکھیں میرے جسم پر تیروں کی طرح برس رہی ہیں۔ کوئی مجھ کو نہتی دیکھ کر گریبان میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ نان والا ایک نان کے بدلے میرے ساتھ رات گزارنا چاہتا ہے۔ میرا کچھ نہیں بچا، میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ ایک عزت ہے وہ تم لوگ لوٹنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری یہ خواہش ابھی پوری کر دیتی ہوں۔ درندو آؤ میرے اوپر جھپٹو، کتو! آؤ میرا جسم تاڑ تاڑ کرلو۔ آؤ گدھوں کی طرح میرا ماس بوٹی نوچ کھاؤ۔ رجو نے اپنی قمیض اتار کر پھینک دی تھی۔''(22)

اس کائنات میں ضمیر کی آواز سے بڑھ کر کوئی آواز نہیں حضرت آدمؑ کو جب جنت سے نکل جانے کا حکم ہوا تو یہ ان کے ضمیر کی آواز تھی جس نے ان کو خدائے باری تعالیٰ کی بارگاہ سے معافی طلب کرنے اور اس کی رحمت کا سوال کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ آپ نے رب تعالیٰ کو سچے دل سے پکارا تو آپ کی توبہ بھی قبول ہوگئی۔ یہ ضمیر ہی ہے کہ جس کے ذریعے انسان صحیح اور غلط میں فیصلہ کر پاتا ہے۔ صحیح غلط کی یہی تمیز انسان کو گناہوں سے روکتی ہے اور درست سمت کی جانب بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔

اگر ضمیر کا سودا ہو جائے تو وہ ہر برا کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے کیونکہ اسے کسی چیز کی فکر یا آخرت کا خوف نہیں رہتا۔ وہ بے دریغ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے لگ جاتا ہے۔ قتل، چوری، حرام خوری، زنا، شراب اور جھوٹی گواہی جیسی چیزیں اس کے لیے بہت معمولی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر انسان کا من صاف، ستھرا، بے داغ اور ضمیر جاگا ہوا ہو تو وہ عدل وانصاف، سچائی، دیانت داری اور حیا جیسی اچھی صفات کو محبوب بد دیانتی، کذب، بے حیائی، ظلم و زیادتی جو فطرت صالحہ میں بگاڑ اور معاشرتی تباہی کی وجہ بنتے ہیں، کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضمیر کو "نفس لوامہ" سے تعبیر کیا ہے۔

نیک انسان کا ضمیر "نفس مطمئنہ" جبکہ برے انسان کا ضمیر "نفس امارہ بالسوء" کہلاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ انسان جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو جلد یا بدیر اس کا ضمیر اسے ضرور ملامت کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ جلد جاگ جاتا ہے تو بعض لوگوں کے ہاں یہ کئی کئی سالوں تک سویا رہتا ہے۔ مگر جب یہ بیداری کی منازل طے کرتا ہے تو انسان پچھتاوے کا شکار ہو جاتا ہے۔ شاہد رضوان کا یہ افسانہ " آوازیں" فضل نامی اک شخص کی کہانی ہے۔ جو چالیس سال پہلے اپنے دوست کو قتل کے مقدمے سے بچانے کے لیے جھوٹی گواہی دیتا ہے۔ اس کا دوست اس کی سچی گواہی چھپانے کے نتیجے میں پھانسی سے بچ جاتا ہے۔ تاہم اس کا ضمیر اسے روز مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ من کی آوزیں ملامت بن کر مسلسل اس کا تعاقب کرتی ہیں "تم جھوٹے ہو"، "تم جھوٹے ہو" کی آوازیں اس کی تنہائیوں میں اسے تنگ کرتی ہیں بلکہ اب تو دن دیہاڑے جاگتے ہوئے یا سب کے بیچ بیٹھے ہوئے یہ سب باتیں آوازوں کی صورت میں اس کی سماعتوں سے ٹکراتی ہیں۔ یہ سب اس کے لیے سوہانِ روح بن جاتیں ہیں اور وہ تمام عمر مسلسل کرب کے عذاب سے دوچار رہتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ میں آوازوں کے سبب اس کا ضمیر کپکپاتا ہے۔

وہ خود اپنے آپ کو اس ہاتھوں میں رعشہ کی بیماری کا سبب سمجھتا ہے کہ اسے جھوٹ بولنے کی سزا مل رہی ہے۔ جب تک اسے ان اندر کی آوازوں کا کھوج نہ ملا تھا وہ پریشان، بے خوابی کا شکار اور خود کلامی کا مریض بن چکا تھا۔ پہلے پہل اسے وہم سمجھنے والے فضل کے دماغ سے جب ضمیر کا بوجھ اترا تو اس کے ہاتھوں نے کپکپانا بھی چھوڑ دیا اور اسے آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔

شاہد رضوان نے اس افسانے کے ذریعے جانے انجانے میں ظلم کا حصہ بننے والے انسان کی ذہنی حالت کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ضمیر کی آوازیں عمر بھر انسان

کا پیچھا کرتی ہیں اور کس طرح کسی شخص سے کی گئی ناانصافی انسان کے لیے کرب مسلسل کا باعث ہوتی ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں ظلم کا بازار، حق تلفی اور جھوٹی گواہی عام ہے۔ لوگ جھوٹی انا، ذاتی رنجش یا کسی دوستی ورشتہ داری کے تحت اپنے ضمیر کا سودا بڑے آرام سے کر لیتے ہیں اور ظالم جس کو سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے اسے تو بچالیا جاتا ہے مگر بعد میں پچھتاوے اور اندر کی آوزیں انسان کا مقدر بن جاتی ہیں۔ ہمیں اخلاقی ومعاشی حوالے سے اپنے رویوں کو غور کرنا چاہیے۔

> ''یار پچھلے کئی دنوں سے عجیب آوازیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔" کیسی آوازیں؟۔۔۔"تم جھوٹے ہو، گناہگار ہو، اور تم مرنے کے لیے ایڑیاں رگڑتے رہو گے، موت تم کو نہ آئے گی۔۔ایسی آوازیں ہر وقت میرا منہ چڑاتی تھیں۔۔۔یار پتہ ہے میرے ہاتھ کیوں کانپتے ہیں؟" "پتہ نہیں" میں نے خودساختہ سر ہلا دیا۔"میں نے جھوٹ بولا تھا۔"اس کے ہونٹوں پر معصومیت تھی۔"مطلب؟"میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی تاکہ معاملے کی تہہ تک پہنچ سکوں۔''چالیس سال پہلے کی بات ہے۔میرے دوست نے ایک معمولی جھگڑے کے دوران ایک محنت کش کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔میں اس واقعے کا چشم دید گواہ تھا۔جب مجھ سے عدالت میں پوچھا گیا تو میں نے اس واقعے سے انکار کر دیا اس طرح میرا دوست پھانسی کے پھندے سے بچ گیا۔"(23)

اسلام امن کا مذہب ہے جس کی سب سے بڑی مثال حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ ہے۔ آپ ﷺ نے اسلام کے پھیلاؤ کے لیے مسلسل تبلیغ کا رستہ اپنایا۔ اسی سبب دین اسلام دنیا میں بڑی تیزی سے پھیلا۔ اخوت کا درس دینے والے اس مذہب نے دھوکہ دہی، لڑائی جھگڑے، قتل وغارت، ظلم وستم اور خون خرابے کی سختی سے مذمت کی ہے۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک مسلمان کا قتل پوری انسانیت کا قتل کہہ کر دہشت گردی جیسی لعنت کی تردید کی گئی ہے۔

ایسے لوگ جو فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ان کے متعلق یوں کہا گیا ہے کہ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار بے شک وہی لوگ فسادی ہیں۔ لیکن شعور نہیں رکھتے۔'' فساد جہاں بھی ہوتا ہے وہاں دہشت گردی بھی جنم لیتی ہے۔ دہشت گردی بہت برا فعل اور گناہ کبیرہ ہے کیونکہ یہ کام سرانجام دینے والا بہت سی جانوں کے ساتھ کھیل رہا ہوتا ہے۔ اللہ کے پیارے نبی ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے

موقع پر انسانی مال و جان کے ضیاع اور قتل و غارت گری کی خرابی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ ”بیشک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جیسے تمہارے اس دن کی حرمت تمہارے اس شہر میں مقرر کی گئی ہے۔“

دہشت گردی کا کوئی بھی دین یا کوئی بھی مذہب نہیں ہوتا تاہم لوگوں نے آجکل مذہب کا لبادہ اوڑھ کر ضرور دہشت گردی کرنا شروع کردی ہے۔ پوری دنیا میں طاقتور ممالک کمزور ممالک میں دہشت گردی کروا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بیدردی سے شہید کیا جا رہا ہے۔ فلسطین کی عورتیں، ننھے بچے، بوسنیا کے بے گناہ معصوم مسلمان شہری، عراق کے مسلمان، کشمیری، مسلم افغانی ہوں یا کہ برما کے افراد ہر جگہ مذہب کے نام پر بے گناہ مسلمانوں کو بیدردی سے خون میں نہلایا جا رہا ہے۔

افسانہ ”انتظار“ میں شاہد رضوان نے دہشت گردی کی ذہنی کشمکش، تناؤ اور اسکی بے چینی کی بہترین انداز سے منظر کشی کی ہے کہ کس طرح وہ ایک ہاتھ میں سگریٹ پکڑے اور ریموٹ کو حرکت دیتے اپنی من پسند خبر سننے کیلئے چینل بدل رہا تھا کہ کہیں اسے دہشت گردی کی کاروائی کی بڑی خبر اور منظر کشی کی خبر نظر آئے، اسی بیقراری میں وہ مسلسل سگریٹ پھونک کر اسکی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ رہا تھا۔ وہ ماچس کی کوفت سے بچنے کیلئے نیا سگریٹ سلگا لیتا اس کے چہرے پہ بے چینی عیاں تھی۔ اس نے کئی بار چینل بدل دیے لیکن اسے مطلوبہ خبر نہ مل سکی۔ اس پر وہ دل مسوس کر رہ گیا اور امن کی یہ حالت اس کے شر پسند دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

باہر گلی میں کلمہ شہادت کی آتی ہوئی آواز اور جنازے کے پیچھے چلتے ہجوم کو دیکھ کر اس نے ایک سرد آہ بھری اور سوچا کہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ یہاں سو پچاس سے کم سکور نہ ہوتا، حکومتی اداروں کی کاروائی کے خوف سے دہشت گرد انڈر گرونڈ چلے گئے تھے اور قدرے امن کی فضاء برقرار تھی۔ میز پر پڑے موبائل فون کی رنگ ٹون اسے خوف زدہ کر دیتی ہے کہ میں نے اسے کہا تھا کہ فون نہ کرنا، اناڑی ہے اگر پکڑا گیا تو اس کی بھی شامت آجائے گی۔ اتنے میں فون کی بیل ہوتی ہے کال اٹھانے والا جو کہ کوڈ ورڈ میں بات کر رہا تھا، اسے معلوم ہوتا تھا کہ آج شہر کے مختلف بازاروں میں لڑکے پھیری لگانے پہنچے ہیں لیکن ابھی تک ان سے کسی کی خبر نہیں آئی۔ پتا نہیں ان کی سبزی بکی بھی ہے کہ نہیں، پریشانی بڑھ رہی ہے۔ اگر بکی نہ ہوئی تو بچے بھوکے مریں گے۔ اتنے میں ٹی وی سکرین اس کی مطلوبہ خبر کے ٹکر سے جگمگا اٹھتا ہے اور اسکی شیطانی مسکراہٹیں اسکے ہونٹوں پر پھیل کر رہ جاتی ہے۔ دو ننھے بچے شہید ہوئے یہ جان کر اسے بڑی تسکین ملتی مگر سکور کم ہے اور پیسہ تھوڑا ہوگا۔ کوئی

زخمی بھی نہیں یہ سب اسے ملال میں ڈال گیا۔مگر اس کے ساتھ ہی اسے اس بات سے فرحت ملتی ہے کہ شکر ہے امن وامان کی فضا کا جمود ٹوٹا اور اس کا وار کارگر ثابت ہوا۔مگر اس کے ساتھ ہی اسے یہ خبر کے مرنے والے اس کے اپنے دونوں بچے ہی تھے،سن کر سکتہ آ جاتا ہے۔

شاہد رضوان نے اس درد بھری کہانی کے ذریعے اپنے قارئین کو ملک میں ہونے والی دہشت گردی کی گھناؤنی وارداتوں، دہشت گردوں کے مذموم مقاصد، پیسے کے لالچ،امن دشمنی اور شیطانیت بھری ذہنی کیفیت کی بھرپور انداز سے منظر کشی کی ہے۔افسانہ دہشت گردی کے لیے کوشاں سرکردہ کی کیفیت بتا رہا ہے کہ کیسے معصوم افراد قتل کر کے بارود،لہو کی بو، دھوئیں کے بادلوں، چیخ و پکار، مکانوں اور بلڈنگوں کے ٹوٹے شیشوں،فضا میں اڑتے ہوئے انسانی چیتھڑوں، بم پھٹنے سے جسم کو چھلنی کر دینے والی گولیوں،لوہے کے ٹکڑوں اور خون میں لت پت لاشوں کا سن کر کلیجے کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔

یہ سب کچھ بتاتا ہے کہ دہشت گرد انسان نما جانور، بلکہ جانوروں اور درندوں سے بھی برے ہوتے ہیں۔نئ نویلی دلہنوں سے ان کے سہاگ، والدین سے ان کے ننھے منھے معصوم پھول، بچوں سے ان کے پیار کرنے والے ماں باپ،خونی رشتے اور اپنے پیارے سب چھین لیے جاتے ہیں۔گھر، فیکٹریاں، کارخانے حتیٰ کے ہسپتال،حفاظت کے اداروں بلکہ یہ بدبخت تو نماز کے لیے آئے نمازیوں اور جنازہ گاہوں تک کو نہیں چھوڑتے۔مذہب کی آڑ میں فرقہ واریت کے تحت معصوم لوگوں کو ٹارگٹ کیا جاتا ہے۔جس کے پیچھے شیطانی و ابلیسی ذہن رکھنے والی تنظیمیں،امن کے دشمن افراد اور انسانیت کے قاتل چھپے ہوتے ہیں۔

احساس انسانیت سے دور یہ افراد اگر باقی لوگوں کے بچوں کو بھی اپنا ہی بچہ سمجھیں، دوسروں کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو اپنے گھر کی خواتین کی طرح تصور کریں،نوجوان بوڑھوں کے خون سے اپنے ہاتھوں کو لت پت نہ کریں، مذہب اور دین اسلام سے قریب ہوں تو معاشرے سے یہ دہشت گردی جیسا فساد ختم ہوسکتا ہے۔مگر یہ گروہ خود کو اپنے کارندوں کو جنت کے خوابوں میں پہنچا کر جہنم واصل کرا کر ہی رہتا ہے۔ان شر پسند عناصر کو پیسوں کا لالچ ہوتا ہے۔امن کی فضا قائم کر کے انہیں سکون اور قتل انسانیت سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔یہ دہشت گرد مذہب کارڈ استعمال کر کے، جہاد اور قتال کا شوق ابھار کر، خیر و برکت کا لالچ سینوں میں ڈال کر اور تصوراتی جنت کی وادیوں کی سیر کرا کر کم عمر لڑکوں کو اپنے ناپاک مقاصد کو پانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

انسانی جانوں کے ضیاع،معصوموں کی شہادت اور اس دہشت گردی کی روک تھام کے

لیے ہمارے امن کے ادارے دن رات کوشاں ہیں۔ رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان شر پسند عناصر جو کہ دہشت گردی کی وارداتوں اور معصوموں کی جان لینے کے لیے خون کے پیاسے بنے انتظار کر رہے ہوتے ہیں، ان کو نیست و نابود کرے اور وطن عزیز کو ہر طرح کی دہشت گردی اور اندرونی و بیرونی فتنہ پروری وسے محفوظ رکھے۔ آمین۔ شاہد رضوان نے یہ افسانہ کمال دردمندی کے ساتھ رقم کیا ہے۔ دہشت گردی کی تخریب کاری کے لیے منصوبہ بندی اور دماغ میں پلتی شیطانیت کو مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ''کلمہ شہادت کے نعروں کی گونج میں کندھے بدلتے بغلی گلی سے نکل کر مین سڑک پر آتے ہی جنازے کے پیچھے پیچھے چلتے ہجوم کو دیکھ کر اس نے زبان ہونٹوں پر پھیری اور سرد آہ بھر کر سوچا۔ اسی ہجوم سے تازہ خبر نمودار ہوسکتی تھی اور سکور بھی سو پچاس سے کم نہ ہوتا لیکن افسوس کہ ایک سنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا دماغ ہارے ہوئے جواری کی طرح شکست کو جیت میں بدلنے کے لیے تخریب کاری کی سوچوں کے لچھے میں الجھتا ہی چلا گیا۔'' (24)

پیری فقیری صدیوں پرانا سلسلہ ہے۔ جس کے ذریعے اللہ کے نیک بندے لوگوں کو دین کی تبلیغ کر کے رب سے جوڑتے ہیں۔ برصغیر میں اشاعت اسلام کے حوالے سے اللہ کے نیک بندوں، عظیم روحانی ہستیوں اور دینی درسگاہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان نیک ہستیوں نے دین محمد ﷺ کی ترویج کے لیے، گناہوں کی روک تھام، اور بدعت کے خاتمے کے حوالے سے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔ لوگوں کو صراط مستقیم پر چلایا اور رب کے رستے پر چلنے کی دعوت دی۔ جس کی وجہ سے رب سے دور گناہوں کی دلدل میں پھنسے بہت سے لوگ انہیں اپنا روحانی مرشد اور رہبر ماننے لگے۔ ان کی دین سے وابستگی اور لوگوں کی اصلاح ہی کا نتیجہ تھا کہ آج صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی لوگ ان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آج ہمارے معاشرے میں کچھ افراد اس پاکیزہ عمل کو اپنے ناجائز مقاصد اور کاروبار بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہوئے جھوٹی خانقاہیں اور جعلی پیروں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ فراڈ، دھوکہ دہی، کے ذریعے خواتین اور کم پڑھے لکھے سیدھے سادے دیہاتی افراد کو نشانہ بنایا جا رہا ہے جو کہ ایسے جعلی پیروں فقیروں اور بابوں کو ولی اللہ اور بزرگ ہستیاں سمجھ کر ان کے جھانسے میں آ کر اپنا مال و دولت اور بعض اوقات تو عزت و عصمت بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ پیسہ کمانے کے لیے جھوٹے

تعویز گنڈے کرنے والے ان نقلی بابوں کے پاس خود علم نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے مگر چالاکیوں اور مکاریوں میں ان کا کائی ثانی نہیں ہوتا۔ سادہ لوگوں کو باقاعدہ منصوبے کے تحت جھوٹی کرامات دکھا کر بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ بلکہ ان نام نہاد پیروں کے مرنیکے بعد ان کے مرید ان کی قبریں بھی کاروباری مقاصد کے تحت درگاہوں اور خانقاہوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آج کل ہمارے معاشرے میں یہ سب بہت عام ہو چکا ہے۔

شاہد رضوان نے اس موضوع پر بہت خوبصورتی سے قلم اٹھایا ہے۔ آپ نے ایسے دو نمبر بابوں اور خانقاہی ماحول کی تصویر کشی کے لیے ''جنڈی والی سرکار'' کے نام سے بہت ہی شاندار افسانہ لکھا، جو پڑھنے لائق ہے۔

افسانے کی کہانی دو دوستوں ''شاہو'' اور ''دینو'' کے گرد گھومتی ہے جو کہ گاؤں میں آئے پیر جی کی شان وشوکت سے بہت متاثر تھے۔ لوگوں کی پیر جی سے عقیدت، مزے مزے کے کھانے اور عیش بھری زندگی دیکھ کر "دین محمد" عرف دینو اپنے لنگوٹیا یار شاہو سے مل کر پیری فقیری اور دم درود کا کاروبار شروع کر لیتا ہے۔ راہ چلتے دو عورتوں میں سے ایک عورت اولاد کی چاہ میں دینو کو اپنا ہاتھ دکھاتی ہے۔ دینو کاغذ پر اسے چند ترچھی اور ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچ کر اسے تعویز کی صورت میں دے دیتا ہے یوں ان کا کاروبار چل پڑتا ہے۔ دن دگنی رات چگنی ترقی، مریدنیوں اور مریدوں کی لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ تب ان کے حالات اور پھر جاتے ہیں۔ جب شاہو، دینو کے کہنے پر نوجوانوں کو کرامت دکھانے کے منصوبے کے تحت ٹرین کی زنجیریں کھینچتا ہے اور یوں چلتی ٹرین رک جاتی ہے۔ وہاں دینو کے پاس بیٹھا نوجوان اسے پیر جی کی کرامت سمجھ بیٹھتا ہے۔ کرامت کے قصے دور دور تک پھیلنے لگتے ہیں اور مرادیں مانگنے والوں کی قطاریں اور لمبی ہو جاتی ہیں۔ اس سب عرصے کے دوران وہ چند ہی دنوں میں "جنڈی والی سرکار" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ شاہو نے مختلف رنگ کے کپڑوں کی ٹاکیاں جنڈ کے چاروں اطراف شاخوں سے لٹکا دیں۔

دونوں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ پیسے کی فراوانی تھی، لنگر نیاز سب اکٹھے ہوتے تھے۔ دونوں کے دن پھر گئے تھے مگر ایک دن اچانک بابا جی دینو سرکار کو بس کچل دیتی ہے۔ بس ڈرائیور ''جنڈی والی سرکار'' کو کچلنے کے الزام سے بری الذمہ ہونے کے لیے ایک کرشماتی بہانہ تراشتا ہے اور پھر اس کے مزار کو کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی خاطر آبادی کے قریب لانے کے لیے جو معجزاتی جواز پیش کرتا ہے وہ بہت ہی دلچسپ ہے۔

''اس نے قبر کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا: کل شام تک تو قبریں دائیں جانب تھی تو آج بائیں جانب کیسے آ گئی؟ شاہو نے بڑے تحمل سے کہا: یہ بابا جی کی کرامت ہے۔ یہ راز کی باتیں ہم تم کیا جانیں؟'' (25)

انسانیت بہت بڑی چیز ہے۔ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔لیکن ہمارے ہاں آج کل انسانیت کا قتل اور انسانوں کا قتل تقریباً ایک ہی جیسا معمول بن گیا ہے۔ہم دو چار دن میڈیا پر مذمتی خبریں، تبصرے اور ٹویٹس چلاتے ہیں اور پھر زندگی کی رونقوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

آج ہمارے بچے کہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ نہ ہی گھر میں، نہ ہی کھیل کے میدان میں جہاں بچوں کو چاک و چوبند اور مضبوط بننے کے لیے بھیجا جاتا ہے، نہ ہی سکول میں جو علم کی روشنی سے ذہنوں کو جلا بخشتے ہیں، نہ تو مدارس میں جہاں بچوں کو رب تعالیٰ کی پہچان کرانے بھیجا جاتا ہے۔ ہمارے بچے آج کہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔کاش کوئی تو جگہ یا ٹھکانہ ہوتا جہاں یہ محفوظ ہوتے، جہاں کوئی بھی بھیڑیا ان معصوم بچوں کے جسموں کو نہ نوچ سکتا، جہاں بدن کے بھوکے ننھے کلیوں کو نہ مسل سکیں، جہاں ظلم و زیاتی اور بدکاری کا راج نہ ہو۔مگر افسوس آج کل یہ درندگی اور بے حسی اکثر لوگوں کی شخصیت کا حصہ بن گئی ہے۔ چھوٹی کلیوں کو بسکٹ، ٹافیوں، کھانے پینے یا کھیلنے کی اشیاء کا جھانسہ دے کر گلی محلوں سے اٹھا لیا جاتا ہے۔ پھر ان سے جنسی ہوس پوری کر کے ان کو کسی کوڑے کے ڈھیر، ویرانے یا بوری بند لاش کی صورت میں پھینک دیا جاتا ہے۔ بے چارے بدنصیب اور غریب ماں باپ ان مسخ شدہ لاشوں کو کندھوں پر اٹھائے صرف قبرستان میں ہی اتار دیتے ہیں۔مگر ایسے جنسی درندوں کو پکڑنے میں قانون مشکل ہی سے حرکت میں آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں زینب جیسی بہت سی چاند کی طرح کی بیٹیاں جن کی عمر 2 سال سے لے کر 10، 12 سال تک تھی۔جنسی زیادتی کے بعد قتل کر کے پھینکی لاشوں کی صورت میں ملی ہیں۔ننھی معصوم کلیاں جن کے ابھی کھیلنے کے دن ہوتے ہیں، جو ابھی موسموں کی نرمی و سختی جھیلنے کے قابل بھی نہیں ہوتیں، جو ابھی یہ سیکھنے کے عمل میں ہوتی ہیں کہ کون سی نظر کس زاویے سے ان کے بدن کے پار اترے تو ان کو اپنے بچاؤ کے لیے کیا تدابیر کرنی چاہیں اور وہ درندہ صفت شخص کی گدھ جیسی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے انہیں فوراً اپنے والدین کو آگاہ کرنا چاہیے۔مگر افسوس ان معصوموں کی معصومیت کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔اور درندے از خود خوشی سے دندناتے پھرتے ہیں۔

اکثر انصاف کے ادارے ایسے گروہوں اور افراد کر پکڑنے سے قاصر رہتے ہیں کیونکہ

ایسے گروہوں کے پیچھے بڑی بڑی شخصیات اور طاقتور لوگوں کے ہاتھ ہوتے ہیں جو معصوم بچوں اور بچیوں سے درندگی کے دوران بنائی گئی ان کی ویڈیو لاکھوں کروڑوں ڈالرز میں بیچتے ہیں۔اب تو ڈارک ویب نامی ویب سائٹ کا دھندا عام ہے۔وہ نوجوان جن کو والدین کی طرف سے تربیت کی کمی ہو، آوارہ دوستوں کی صحبت حاصل ہو، ماضی کے کسی ڈراؤنے جنسی واقعے نے زخمی کر دیا ہو، محبت کی ناکامی، تنہائی کا شکار ہوں یا جن کو فضول کی فراغت ہو وہ غلط کاریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ساری رات انٹرنیٹ پر فحش مواد دیکھ دیکھ کر ان کے احساسات پگھل پگھل کر جذبات کی رو میں بہہ جانے کو ہر لمحہ تیار ہوتے ہیں۔اندر کی بھوک اور بڑھتی ہوئی ہوس نسوانی خطوط کو لباس کے پردے میں سے ہی دیکھ کر بے قابو ہو جاتی ہے۔ایسے میں ہمہ وقت انٹرنیٹ کھولے ان کو عین فطری لباس میں دیکھ کر تو ان کے اندر ایک بھانبھڑ اور آلاؤ مچ جاتا ہے۔ جو کہ باہر نکلنے کا کسی بھی صورت رستہ چاہتا ہے۔پھر وہ رستہ چاہے صحیح یا غلط انہیں کیسے بھی بنانا پڑے وہ بنا کر رہتے ہیں۔چاہے اس کے لیے انہیں ننھی کلی کو ہی مسلنا پڑے۔گھر کے آنگن کی رونق، معصوم چڑیوں جیسی معصوم بچیوں کے ساتھ ریپ اور جنسی زیادتی کے واقعات میں پچھلے کچھ عرصے سے بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔جس کی وجہ سے نہ صرف والدین بلکہ بچے بھی سہم کر رہ گئے ہیں۔

ہمارے برسر اقتدار اداروں کو اس پر فوری طور پر ایکشن لینا چاہیے اور ایسے جنسی درندوں کو پھانسی جیسی سزائیں سرعام دینی چاہیے تا کہ لوگ ان سے عبرت پکڑ سکیں۔اس کے ساتھ ساتھ اہل قلم کو بھی ہر سطح اور ہر پلیٹ فارم پر آواز بلند کرنی چاہیے۔تا کہ سب لوگوں میں اس کی آگاہی پھیلے اور والدین بچیوں اور خاص طور پر چھوٹی بچیوں کو اکیلے گھر سے باہر نہ بھیجیں۔

چھوٹے بچوں سے بدفعلی ایک گھناؤنا جرم ہے جو کہ ہمارے معاشرے میں تیزی سے جڑیں مضبوط کر رہا ہے اور اس سے چھٹکارا بہت ضروری ہے۔شاہد رضوان نے اس موضوع پر بڑی دردمندی سے قلم اٹھایا ہے۔آپ نے اپنے افسانے ''گل چیں'' میں بچوں سے زیادتی کرنے والوں کو ''پھول توڑنے والے'' جبکہ بچوں کو پھول سے تشبیہ دے کر بتایا ہے کہ جب غنچے (بچے) چٹخ کر پھول بنتے ہیں تو باغبان (والدین) خوش ہوتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ہر لمحہ ''گل چیں'' (پھول چننے والے چور/جنسی درندے) کا تصور بھی رہتا ہے جو اسے افسردہ کیے رکھتا ہے۔اسے ہر لمحہ گل چیں کے کھردرے ہاتھ نظر آتے ہیں جو ہر وقت پھول نوچنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ایک پل کو اگر مالی (والدین) کی نظر چوک جائے تو گل چیں کی بے رحمی اپنے

ہاتھوں کی صفائی دکھا چکتی ہے۔

شاہد رضوان نے بڑی مہارت کے ساتھ اس افسانے ''گل چیں'' میں پھولوں کی بات کر کے جنسی درندگی اور ننھی معصوم بچیوں کے قتل کے موضوع کو سمویا ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی ذہنی و جسمانی کیفیت کا عکاس ہے جو کہ فراغت کا شکار ہے اور ہمہ وقت انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر جنسی اشتہا بڑھانے والے مواد دیکھتا رہتا ہے۔ جس سے اس کے اندر کا بھیڑیا جاگ جاتا ہے اور وہ ہر وقت اپنی جسمانی تسکین کے لیے منصوبے سوچتا رہتا ہے۔ وہ اپنے شکار کی تلاش میں سڑک پر گھومتا رہتا ہے۔ پہلے پہل تو وہ ایک سانولے رنگ کی عورت جو کہ حلیہ سے ملازمہ لگتی ہے۔ اسے ہاتھوں سے عجیب اشاروں سے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی اور سٹی بجا کر اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتی بلکہ وہ اس کی طرف تیور چڑھا کر دیکھتی ہے اور نیچے سڑک کی جانب منہ کر کے اس پر تھوکتی ہے۔ جس پر وہ غصے سے تلملا اٹھتا ہے اور ہتک کا بدلہ لینے نکل پڑتا ہے۔ وہ پارک میں جا نکلتا ہے اور نسوانی چہروں کو نفسانی بھوک بھری نظروں سے دیر تک تکتا رہتا ہے۔ مگر اس کی وہاں بھی دال نہیں گلتی تو گلی میں کھیلتے بچوں کو دیکھ کر منفی خیالات اس کے دماغ میں دوڑنے لگتے ہیں۔ وہ ان کے پاس رک کر انہیں ٹافیاں دیتا ہے۔ یوں روز بچوں کے پاس آنا، ان سے گپ شپ کرنا اور بند مٹھی کھول کر سب کو ایک ایک ٹافی اٹھانے کا اشارہ کرنا کافی دن تک جاری رہا۔ اس سب عرصے میں اس کے اندر کا بھیڑیا بھوک سے بلبلا رہا تھا۔ وہ پیٹ سے کھانا کھا کر بھی بھوکا ہی رہتا تھا۔ اس کے دماغ میں شیطانی خیالات کی عجیب کھچڑی پک رہی تھی۔ گلی میں سب بچے جمع تھے۔ وہ سب کھیل کود میں مصروف ہر لمحہ ادھم مچا رہے تھے۔ مگر ایک سات سالہ بچی انوشہ سب سے جدا بیٹھی منہ پھلائے ہوئی تھی۔ نوجوان کے ٹافیاں لاتے ہی سب بچے اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں مگر وہ غربت کی ماری تھی۔

انوشہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ وہ بچوں سے اس کے روٹھنے کا سبب دریافت کرتا ہے۔ بچے اسے بتاتے ہیں کہ وہ ماں سے چابی والی گڑیا لینے کی ضد کر رہی تھی جس پر ماں نے اسے سمجھایا کہ یہ امیر زادیوں کی سی ضد چھوڑ دے۔ مگر وہ برابر وہی خواہش کرتی رہی جس کے بدلے ماں نے اس اسے ایک چپت لگا دی۔ اسی سبب وہ یوں خاموش بیٹھی ہے۔ یہ سب جان کر نوجوان کی آنکھوں میں چمک اُبھر آتی ہے۔ وہ بچی کے کان میں کوئی ایسے بات کہتا ہے جسے سن کر اس کے چہرے پر خوشی پھیل جاتی ہے۔

نوجوان سب بچوں کو اس شرط پر دو دو ٹافیاں دے دیتا ہے کہ وہ ٹافی لینے کے بعد فوراً گھر چلے جائیں گے سب بچے باری باری گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور انوشہ نوجوان کی انگلی پکڑے، چہرے پر خوشی

سجائے، آنکھوں میں مسرت سموئے یوں اچھلتی کودتی جا رہی ہے جیسے کسی میلے میں جا رہی ہو۔ نوجوان کے چہرے پر خباثت عیاں تھی اور انوشہ آنے والے ڈراونے وقت سے بے خبر۔ ''گل چیں'' جنسی درندے کی ہوس اور اندرونی خباثت کا آئینہ دار ہے جو کہ سات سالہ غریب بچی کو کھلونے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں بچوں کا ریپ اور جنسی زیادتی وغیرہ سب کچھ بہت عام ہو گیا ہے۔ معصوم بچوں کو کھانے پینے کی چیزوں کا لالچ دے کر یا سکول سے گھر لے جانے کے بہانے گلی محلوں وغیرہ سے اغواء کر لیا جاتا ہے اور پھر مذموم جنسی عزائم کے بعد انہیں بے دردی سے قتل کر کے بوری بند لاشوں کی صورت میں ویرانوں اور کچرے کے ڈھیروں پر پھینک دیا جاتا ہے۔ غریب بچیوں کی جان اور عزت محفوظ نہیں ہے۔

ہمارے انصاف کے اداروں کو جنسی بھیڑیوں کے خلاف سختی سے ایکشن لینا چاہیے اور ان کے لیے کڑی سے کڑی سزائیں رکھنی چاہییے تاکہ آئندہ کسی کی بھی یہ سب کرنے کی ہمت نہ ہو۔ والدین کو بھی چاہیے کہ وہ بچیوں کو اکیلا گھر سے باہر نہ جانے دیں، ان پر نظر رکھیں۔ کون ان سے ملتا ہے؟ کون ان کے آس پاس زیادہ رہتا ہے۔ اس سب کے ساتھ ساتھ ماں باپ کو اپنی بچیوں کو سختی سے اس بات سے بھی منع کرنا چاہیے کہ وہ کسی انجان شخص سے کوئی بھی کھانے پینے والی چیز نہ لیں اور نہ ہی اپنے والدین کو بتائے بغیر اکیلے کسی کے ساتھ باہر جائیں کیونکہ یہ سب احتیاطیں انہیں بہت سے مسائل اور طوفانوں سے بچا سکتی ہیں۔ افسانہ ''گل چیں'' میں شاہد رضوان نے جنسی بھیریے کی شیطانیت اور پھیلائے جانے والے ایک جال سے متعلق لکھا ہے:

> ''گلی میں سب بچے جمع ہو کر ادھم مچا رہے تھے لیکن انوشہ سب سے الگ منہ پھلائے لکڑی کے شہتیر پر بیٹھی تھی۔ اس کے ٹافیاں لے کر آتے ہی سب بچے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ لیکن انوشہ نہ آئی۔ اس کے پچکارنے پر بھی نہیں آئی تو اس نے بچوں سے اس کے روٹھنے کا سبب معلوم کیا۔ ایک بچے نے بتایا کہ وہ اپنی ماں سے چابی والی گڑیا لینے کی ضد کر رہی تھی۔ ماں نے اسے سمجھایا کہ وہ یہ سوچنا بھی چھوڑ دے کہ وہ امیر زادیوں کی برابری بھی کر سکتی ہے۔ اس پر جب اس کی ریں ریں نہ رکی تو اس کی ماں نے اسے ایک چپت لگا دی۔ یہ سن کر نوجوان کی

آنکھیں چمک اٹھیں۔اس نے بچی سے کوئی ایسی بات کہی کہ جسے سن کر
اس کی چہرے پر خوشی کی لہر پھیل گئی۔''(26)

دین اسلام میں چھوٹا، بڑا، گورا، کالا، غریب، امیر گویا سب برابر ہیں۔برتری کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔اسلام نے غلاموں کی نسلی فروخت، غریبوں کے استحصال اور ان کے ساتھ برے سلوک کی شدت سے مذمت کی ہے۔اسلام نے انسانیت کو مساوات کی لڑی میں پروئے رہنے کا درس دیا۔مگر افسوس آج ہم ٹکروں اور امیر و غریب جیسے طبقوں میں بٹ چکے ہیں۔

معیشت کی اس دوڑ میں آج بچارہ ''غریب'' کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی راہ پر دیوانہ وار مسلسل چل رہا ہے اور ''امیر'' اسے ہانکتے ہوئے اپنے عیش و عشرت اور پیسے میں مسلسل اضافہ کیے جا رہا ہے۔

آج ہمارے پاکستان کے کروڑوں غریبوں پر ہزاروں امرا کی حکمرانی ہے۔جو کہ سیاہ وسفید کے مالک بنے غربا کی بنیادی ضروریات ہی سے بے خبر ہیں۔اگر دھیان سے دیکھا جائے تو آج موچی، مستری، پینٹر، درزی، خاکروب، پنکچر والا، سیلز مین، سکیورٹی گارڈ، دھوبی، منشی، بیرا، چھابڑی والا، الیکٹریشن، گوالا، کنڈیکٹر، پلمبر، نانبائی، مکینک، ڈرائیور مزدور اور نہ جانے کتنے ایسے شعبے ہیں کہ جن کا وجود ''غریب'' کی وجہ سے باقی ہے اور انہی کے دم سے ہی تو اس سارے نظام کائنات کا حسن قائم و دائم ہے۔"امیر" اور "غریب" کی تقسیم رب کے ہاتھ میں وہ جس کو چاہے جتنا نوازیا اور جسے چاہے اسے محروم رکھے مگر سرمایہ داروں کے رزق میں اللہ نے یقیناً محتاجوں اور غریبوں کا بھی حصہ اور روزی رکھی ہے جو کہ صدقہ، فطر، اور عشر کی صورت میں ادا کرنا فرض ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ اپنے سے کم تر طبقے کا خیال کرنا بھی ضروری ہے۔لیکن کتنے ہی لوگ جو ان سب فرائض سے سبکدوش ہو ہیرو ہیں۔آج ہمارے معاشرے میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔جن کے پاس کھانے کو دو وقت کی روٹی تک نہیں، پہننے کو کپڑا نہیں، ہوا لینے اور روشنی کو بجلی تک نہیں۔اناج کی کمی ہے۔علاج، پانی کا شدید مسئلہ ہے۔غریب کا کوئی پرسان حال نہیں۔غریب غربت کے مدار میں پس رہا ہے۔روز ایڑیاں رگڑ رہا اور مر رہا ہے۔مگر اس کی کسی کو پرواہ نہیں۔غریب کا کوئی پرسان حال نہیں اسے جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اس پر رہی سہی کسر طاقتور طبقہ ظلم کر کے پوری کر دیتا ہے۔انہیں مزدوروں کی عزت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، بات بات پر انہیں ذلیل کیا جاتا ہے۔یہ سلوک نہ صرف مرد مزدوروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے بلکہ ایسی غریب خواتین جن کے

خاوند جلد موت کو گلے لگا لیتے ہیں اور انہیں غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرد مزدوروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔انہیں بھی ایسے سب حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''تارکول کی سڑک''ایک ایسا افسانہ ہے جو کہ مزدور طبقے سے وابستہ خواتین کی زندگی اور ان کو درپیش مسائل و مشکلات کی عکاسی کرتا ہے۔خالص دیہاتی ماحول سے تعلق رکھنے والی ''شریفاں''اور کی بیٹی''ظہری''دونوں اس افسانے میں مرکزی کردار ہیں۔جو کہ غربت کے ہاتھوں مجبور، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کبھی گندم کی کٹائی تو کبھی کپاس کے کھیتوں میں چنائی کرتی نظر آتی۔دونوں کا کوئی اور سہارا نہ تھا۔فصلوں کے دن گزرے تو وہ دونوں فارغ تھیں۔جب کچھ عورتوں کو گاؤں میں نئی بننے والی تارکول کی سڑک پر کام کرتے دیکھا تو محنت مزدوری کی عادی شریفاں نے بے کار اور فارغ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔جھٹ منشی سے بات کی اور دونوں کام پر جانے لگیں۔یہاں بہت سی لڑکیاں بجری کے ٹوکرے اٹھانے اور بجری کوٹنے میں مصروف رہتیں۔گھروں سے پانی کے گھڑے اور روٹیاں باندھ کر لائیں جاتیں اور یہی سب روکھا سوکھا بھوک کے وقت ان کے لیے مرغ مسلم ہوتا تھا۔جسے کھا کر رب کی بارگاہ میں شکر ادا کیا جاتا۔شریفاں اور اس کی بیٹی ظہری کا عورتوں کا ساتھ کام کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔یہاں مزدور مردوں اور عورتوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔جو آپس میں ہنسی مذاق،مخول اور منہ بھر بھر کر گالیاں بھی بکتے تھے۔

ٹھیکیدار اور منشی بڑے رنگین مزاج آدمی تھے۔جس مرضی لڑکی سے چاہے وہ کسی کی ماں، بیٹی ہو گپ شپ شروع کر دیتے،علیک سلیک بڑھاتے اور جب مرضی جھگی میں بلا کر بٹھائے رکھتے۔کوئی مزدور آگے سے چوں چراں نہ کر سکتا تھا کیونکہ منشی ہر کسی کی اجرت میں سے کچھ نہ کچھ پیسے نیچے دبا کر ضرور رکھتا تھا۔پیٹ پاپی کی خاطر مرد و خواتین سب اس کی گالیاں بھی کھاتے کہیں منشی کام سے فارغ نہ کر دے اس خوف سے کسی کی اتنی جرات نہ تھی کہ وہ آگے سے اف بھی کر سکے۔

''شریفاں''کی بیٹی سانولی سلونی ظہری پر بھرپور جوانی کے دن تھے۔منشی جو کہ ان ماں بیٹی کے آنے سے قبل "چھنو" اور "صغریٰ" کے گرد منڈلاتا رہتا تھا اب ظہری کی جوانی پر فریفتہ ہونے لگا۔جس سے''چھینو اور صغریٰ''دونوں ظہری کی دشمن بن گئیں۔بات بات پر طعنے دیتیں،آتے جاتے جملے کستی،رعب گانٹھتی،بے عزتی کرتیں۔

ایک روز منہ ماری کے دوران صغریٰ نے لوگوں میں ظہری سے یہاں تک کہہ دیا کہ''تم منشی کی رکھیل ہو''جس پر وہ آگ بگولہ ہو گئی،دونوں میں خوب لڑائی ہوئی،بات چہرے اور بال نوچنے

تک آن پہنچی ۔لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ ہر کوئی ظہری کو غلط سمجھ کر فتنے کی جڑ قرار دے رہا تھا۔ادھر منشی کی شہوت اور اول فول باتیں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔اس کی نیت کا فتور اور بدمعاشی ظہری کو بہت بری گزرتی ہے۔جس کا ذکر وہ اپنی ماں سے کرتی ہے۔وہ بجائے ظہری کی بات سننے اور منشی سے پوچھنے کے ظہری کو خاموش رہنے اور پرواہ نہ کرنے کا کہتی ہے۔جس پر ظہری کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے۔

ادھر جب منشی کو اپنی دال گلتی دکھائی نہ دی تو اس نے بات بات پر ظہری کو ڈانٹنا اور بے عزت کرنا شروع کر دیا کہ وہ تھک ہار کر خود ہی ہتھیار ڈال دے گی۔مگر ایسا نہ ہوا۔منشی پانی پلانے کے بہانے ظہری کی کلائی تھامنا چاہتا ہے۔جس پر وہ تلملا کر رہ جاتی ہے اور اسے ''خبیث'' کا لقب دیتی ہے۔وہ بھرے مجمعے میں کہتی ہے کہ ''منشی نے چھینو اور صغریٰ کو سر پر چڑھا رکھا ہے، وہ اس پر صدقے واری جاتی ہیں مگر میں نہیں ہوسکتی۔'' منشی نے سب کے سامنے تذلیل ہونے پر خاموشی اختیار کر لی مگر شریفاں نے بیٹی کے منہ پر تھپڑ جھڑ دیا۔

منشی نے دونوں ماں بیٹی کو کام سے فارغ کر دیا۔ادھر تین چھوٹے لڑکوں، دو بچیوں کی کفالت اور بیمار شوہر کی دوائیوں کی پیسے نہ ہونے پر ماں ظہری کو برا بھلا کہتی اور کوستی ہے۔چھ دن کی مزدوری کے ضیاع اور دال روٹی کی کمی کے باعث گھر فاقوں کی سی نوبت آن پڑتی ہے۔ظہری اس سب سے باخبر تھی مگر وہ ایسی کمائی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جس کی قیمت اس کی عزت ہو۔وہ ماں سے کہتی ہے کہ جو منشی چاہتا ہے وہ میں کروں تو چھینو اور صغریٰ تو کیا۔ان کی مائیں بھی ہمیں کام سے نہیں نکلوا سکتیں۔لیکن میں نہیں چاہتی۔اگر مزدوری کے لیے عزت ہی نیلام کرنی ہے تو پھر بجری ڈھونے کی کیا ضرورت ہے۔اس کے بغیر ہی یہ کام کئی گنا زیادہ پیسوں میں ہوسکتا جس پر ماں خاموش ہو کر رہ جاتی ہے۔دوسری طرف شریفاں باہر بکری کے واسطے گھاس لینے جاتی ہے۔سڑک پر عورتوں کو کام کرتے دیکھ کر شریفاں کا دل مچل اٹھتا ہے۔وہ یہ سوچ کر کہ شوہر کی دوا اور بچوں کے کھانے کے پیسے کہاں سے آئیں گے، گھر کا راشن اور خرچہ کیسے چلے گا؟ اور اگر منشی نے خود بلاوا نہ بھیجا تو بھوکے مریں گے۔یہ سب ذہن میں رکھ کر وہ منشی کے پاس جاتی ہے۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی منشی اس کے آنے کے مقصد کو بھانپ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری لاڈو کے بہت نخرے ہیں۔۔۔مزدور کو نازنخرے زیب نہیں دیتے۔مجھے بھی تو ٹھیکیدار اکثر ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے مگر میں زبان نہیں کھولتا کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میں اس کا ملازم ہوں اگر میں جواب دوں گا تو ٹھیکیدار تو منشیوں کی کمی نہیں۔

جس پر شریفاں خوشامدانہ انداز میں ظہری کے بچی ہونے کا کہہ کر معافی مانگتی ہے، منت

سماجت کرتی ہے اور آئندہ ایسا نہ ہوگا کہہ کر دوبارہ سے کام پر آنے کی درخواست کرتی ہے۔منشی کے دل ونظر میں کمینگی اور کھوٹ تھا۔اس نے شریفاں کی مجبوری و بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا سوچ کر ہاں کر دی ادھر ماں اپنی بیٹی کو چپ رہنے،کسی سے نہ الجھنے اور منشی کو ناراض نہ کرنے کا کہہ کر ساتھ لے آئی۔چھینو اور صغریٰ سے بیٹی کا ہاتھ ملوایا اور منشی سے سلام کیا۔چھینو اور صغریٰ دونوں ماں اور بیٹی کو دیکھ کر جل کر رہ گئیں۔جس پر منشی غرور بھری ہنسی ہنستا ہے گویا وہ ان کی بے بسی پر خوش ہو رہا ہو۔دن گزرتے گئے،ماں کے کہنے پر ظہری کے لہجے میں نرمی آ گئی،منشی کی نگاہیں ہمہ وقت ظہری کا تعاقب کرنے لگیں۔ایک دو بار منشی نے ظہری سے بدتمیزی و چھیڑ خوانی بھی کی جس پر وہ کڑوا گھونٹ پی گئی۔

ایک روز جب سبھی مرد اور عورتیں اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ظہری سر پر ٹوکرا اٹھائے منشی کے ہاں سے گزری تو اس نے بڑے رعب سے جھگی میں آ کر سر دبانے کو کہا اور خود اندر جھگی میں چارپائی پر لیٹا اس کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے باہر بھی ایک دو دفعہ جھانک کر دیکھا کہ وہ آ رہی ہے کہ نہیں۔ظہری اس کی بے چینی کو سمجھتی رہی،اس کی سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو ٹوکرا پھینک کر ماں سے گویا ہوئی کہ ''منشی کہتا ہے جھگی میں آ کر میری بات سنو'' جس پر شریفاں دوسری جانب منہ کر کے بیٹی سے کہتی ہے کہ چلی جاؤ۔۔

شاہد رضوان کا یہ افسانہ غربت کی چکی میں پستی دو ماں بیٹیوں کی بے بسی اور معاشرتی حیوانیت کو ظاہر کرتا ہے۔معاشرے میں عورتوں کو مردوں کے برابر کام کرنے اور گھر سے باہر نکل کر کمانے کے لیے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور چند پیسوں کے لیے اعلیٰ طبقہ انہیں بات بات پر ذلیل کرتا ہے اور بلیک میلنگ کے ذریعے نوکری سے نکال دینے کا کہہ کر بدلے میں عزت کا سودا کرتا ہے۔یہ افسانہ اس کی گندی سوچ کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔افسانہ دکھوں کی ماری ایک ایسی ماں کی بے بسی بھی عیاں کرتا ہے جو معیشت کی مجبوری کی بنیاد پر بیٹی کو جسم فروشی اور منشی کی حیوانیت اور جنسی خواہش کا احترام کرنے کا کہتی ہے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ ماں ایک عورت ہو کر اپنی بیٹی کو اس ناجائز اور حرام کام کی اجازت کیوں کر دے رہی؟ آخر وہ کون سی ایسی مجبوریاں ہیں جن کے باعث وہ اس انتہائی برے قدم کی جانب بیٹی کو دھکیل رہی ہے؟ تو بہت ہی افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ غربت ہی ہے جو معیشت کی چکی میں پستی ماں بیٹی کو یہ سب کرنے پر مجبور کرتی ہے۔معاشرتی خباثت اور غربت و بے بسی کی تصویر بنی ماں بیٹی کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔۔۔۔:

''وہ جھگی میں چارپائی پر لیٹ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ایک دو بار تو اس

نے باہر جھانک کر بھی دیکھا کہ وہ آ رہی ہے کہ نہیں۔ وہ برابر جھگی کی طرف دیکھتی اور منشی کی بے چینی کو سمجھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے؟ وہ پھر ٹوکری پھینک کر اپنی ماں سے بولی: ''منشی کہتا ہے جھگی میں آ کر میری بات سنو۔" شریفاں دوسری طرف منہ کر کے بولی:"چلی جاؤ''(27)

عورت خدا کی وہ خوبصورت مخلوق ہے۔ جسے مرد کی پسلی سے پیدا کر کے مرد کو اس پر ایک درجہ فوقیت دی گئی۔ عورت کو جہاں چادر اور چار دیواری میں رہنے کا حکم دیا گیا، وہیں مرد کو باہر کے کام کاج کا ذمہ سونپا گیا۔ عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے روپ عطاء کر کے مرد کو اس کی عزت و عصمت کا محافظ قرار دیا گیا۔ مگر افسوس کہ آج صنف نازک کہلائی جانے والی یہ عورت اسی محافظ مرد کے ہاتھوں ظلم و جبر کا شکار ہو رہی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں عورت پر ظلم عام ہو گیا ہے۔ کہیں کارو کاری کہیں وٹہ سٹہ تو کسی جگہ غیرت کا نام دے کر تو بعض اوقات جنسی استحصال کے روپ میں عورت کو جبر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ شاہد رضوان نے بڑی دردمندی سیعورت پر ہونے والے ان مظالم پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ غریب اور خصوصا متوسط طبقے کی خواتین کے مختلف روپ ہمارے سامنے لائے۔

''پتھر کی عورت'' کی رضیہ ہو، چندا کی آنکھوں میں سجے بہتر زندگی کے خواب ہوں، ''آوازیں'' میں بانجھ عورت افسانے کی کنول ہو، آخری سیڑھی کی نیلوفر ہو، مائی مستانی کا کردار ہو یا پھر کتیا افسانے کی شگفتہ'' یہ تمام زندگی کے مختلف زاویوں اور مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اسی طرح ''پہلا آدمی'' میں ''جوگی چوک'' اور ''سفید بال''، مجموعہ ادھوری کہانی کی تصویر'' میں'' تارکول کی سڑک''، ''ٹھیکیدار''، ''دجال''، ''غارت گر لمحہ'' اور ''ٹرمینل'' وغیرہ ایسی ایسی شاندار کہانیاں ہیں جو تانیثی اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں تعلیمی درسگاہوں کی بچیوں سے لے کر گھر میں ہونے والے جبر کو سہتی خواتین، نئی نویلی دلہنوں، گھر سے نکل کر محنت ومشقت کرتی عورتوں، کنواری بچیوں کو پیش آنے والی مشکلات اور مردانہ معاشرے میں معاشرتی مسائل سے تنگ خواتین کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ آج ہمارے وطن کے کروڑوں پسماندہ افراد پر چند ہزار امیروں کی حکومت ہے۔ جو سیاہ وسفید کے ٹھیکیدار بنے غرباء کی بنیادی ضروریات ہی سے بے پرواہ ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارے معاشرے کے خاکروب، موچی، مستری، سیلز مین، درزی، الیکٹریشن، پنکچر والا، ڈرائیور، سکیورٹی

گارڈ، کنڈ یکٹر، نانبائی، مزدور، دھوبی، منشی، بیرا، چھابڑی والا، گوالا، پلمبر، مکینک، اور نہ جانے کتنے ہی ایسے شعبے ہیں کہ جن کا وجود غریبوں کی وجہ سے ہے، اوران مزدوروں ہی کی بدولت تو ساری دنیا کا نظام قائم ودائم ہے۔ مگر ہمارے حکمرانوں کو غریب عوام کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ انہیں فقط اپنے بینک بیلنس بھرنے اور اپنی جائیدادیں بنانے کی پڑی ہے۔ غریب بیچارہ جیے یا مرے، انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں غریبوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

شاہد رضوان کے افسانوں میں دہشت گردی جیسے واقعات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جن سے معصوموں کی شہادت کے نتیجے میں اہل خانہ پر گزرنے والے حالات، انسانی جانوں کے ضیاع، دہشت گردوں کے عزائم سے واقفیت اور دہشت گردی کی روک تھام کیلئے اداروں کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔

افسانہ نگار نے بڑے ہی جاندار انداز سے اپنے افسانوں میں غریب طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح امیر طبقہ غریبوں پر ظلم وستم کرتا ہے۔ نچلے طبقے کو اگر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کروانا ہو تو انہیں بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر کسی بات پر کوئی ظلم ہو رہا ہوں تو اسے انصاف کے لئے سالوں عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں، مگر تب بھی انصاف نہیں ملتا۔ آج غریبوں کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔ اگر کوئی معمولی حیثیت کا شخص اپنے گھر کے لیے زمین کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا خرید لیتا ہے، تو اسے مصیبت پڑ جاتی ہے۔ وہ جائیداد کے کاغذات بنوانے کے لیے ذلیل وخوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی فیصلے کی نقل حاصل کرنا ہو، نوکری کا حصول ہو یا پھر کسی بھی کام کی تکمیل ہو تو وہ بغیر رشوت کے ممکن نہیں ہو پاتی۔

شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں عدل وانصاف کے کمزور نظام، لوگوں کی مفاد پرستی و خودغرضی، سادہ لوح دیہاتیوں کے جھوٹے پیروں فقیروں کے ذریعے لٹے جانے کی وجوہات، رشوت خوری، جائیداد کے معاملوں، تلخ انسانی رویوں، زلزلوں، سیلابوں، قدرتی آفاتوں، عورتوں کو سماجی حوالے سے درپیش مسائل، زندگی سے خواتین کے سمجھوتوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کو بہت ہی موثر انداز سے بیان کیا ہے۔ شاہد رضوان نے معاشرے کے اصل چہرے سے نقاب ہٹانے کی شاندار کوشش کی ہے، اور آپ بہت حد تک اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ بلاشبہ شاہد رضوان جدید اردو افسانے کے لیے ایک بہترین اضافہ ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ شاہد رضوان، پتھر کی عورت، دانیال پبلشرز، چیچہ وطنی، 2010ء ، ص:16
2۔ شاہد رضوان، پتھر کی عورت، ص:18
3۔ ایضاً، ص:19
4۔ ایضاً، ص:40
5۔ ایضاً، ص:85
6۔ ایضاً، ص:94
7۔ ایضاً، ص:107،108
8۔ ایضاً، ص:121
9۔ ایضاً، ص:127،128
10۔ ایضاً، ص:137
11۔ ایضاً، ص:147
12۔ شاہد رضوان، پہلا آدمی، دانیال پبلشرز، چیچہ وطنی، 2013ء ، ص:26
13۔ شاہد رضوان، پہلا آدمی، ص:54
14۔ ایضاً، ص:64
15۔ ایضاً، ص:163
16۔ ایضاً، ص:76،77
17۔ ایضاً، ص:95
18۔ ایضاً، ص:131
19۔ شاہد رضوان، آوازیں، سانجھ پبلشرز لاہور، 2015ء ، ص:56
20۔ شاہد رضوان، آوازیں، ص:182
21۔ ایضاً، ص:79
22۔ ایضاً، ص:160
23۔ ایضاً، ص:42،43
24۔ شاہد رضوان، ادھوری کہانی کی تصویر، دانیال پبلشرز، چیچہ وطنی، 2020، ص:107
25۔ شاہد رضوان، ادھوری کہانی کی تصویر، ص:105
26۔ ایضاً، ص:88
27۔ ایضاً، ص:173

☆☆☆☆☆☆☆

غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان کے افسانے

(تقابلی جائزہ)

غلام فرید کاٹھیا

مہر غلام فرید کاٹھیا کا شمار دور جدید کے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔آپ اردو ادب کے ان ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں کہ جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے پسماندہ طبقے کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔مہر غلام فرید کاٹھیا کے اب تک " تین "افسانوی مجموعے "لمحوں کی قید"، "سرسوں کا پھول" اور "سفید تتلیوں کا ہار" شائع ہو چکے ہیں۔مہر غلام فرید کاٹھیا نے اپنے ان تینوں افسانوی مجموعوں میں محتاجوں،غریبوں، لاچاروں، اور مظلوم عورتوں پر ہونے والے مظالم پر قلم اٹھایا ہے۔آپ کے تمام افسانے غریبوں کے استحصال اور وڈیروں کے ہاتھوں پسماندہ طبقے سے کی جانے والی ناانصافیوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ازل ہی سے برسرِ اقتدار طبقے نے اپنے سے کم حیثیت لوگوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے ہیں۔امیروں نے غریبوں کو اپنے مفادات کی غرض سے فقط استعمال ہی کیا ہے۔لوگوں سے تھوڑی اجرت کے بدلے زیادہ مشقت کروائی جاتی رہی ہے۔پسماندہ طبقے کی غریبی کو مذاق بنا کر حقداروں سے ان کے جائز حقوق چھینے جاتے رہے ہیں۔کارل مارکس کے نظریہ مارکسزم اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے جب غریبوں پر ہونے والے جبر و زیادتی کو محسوس کیا تو ان افسانہ نگاروں نے معاشرے کی اصلاح کے لئے غریبوں کے حق میں آواز بلند کرنا شروع کر دی۔مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کو کم اجرت دینے،غریبوں کے غریب تر اور سرمایہ داروں کے امیر تر بنتے جانے کے خلاف جن مصنفین نے اپنی تحریروں میں پسماندہ طبقے کی مشکلات کے حل کے لیے قلم اٹھایا ان میں پریم چند، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اختر حسین رائے پوری وغیرہ شامل ہیں۔

جس طرح ماضی میں دیگر مصنفین و افسانہ نگاروں نے غریبوں کے حق کے لئے قلمی جہاد کیا بالکل اسی طرح آج بھی ہمارے کئی افسانہ نگار اپنے افسانوں کے ذریعے غریبوں کے مسائل کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔غلام فرید کاٹھیا کا شمار بھی ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے کہ جنھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع پسماندہ طبقے کے مسائل کو بنایا۔غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں

غریب کسانوں، ہاریوں، مزدوروں اور دیگر پسماندہ طبقات کو درپیش مشکلات کی بہترین انداز سے عکاسی کی ہے۔غلام فرید کاٹھیا کیا کثر افسانوں میں مزدور طبقے کے مسائل کی بہترین انداز سے تصویر کشی ملتی ہے۔ان کا افسانہ "دیوانے لوگ" ایک ایسے غریب مزدور کی کہانی ہے جس سے اس کا ٹھیکیدار کم اجرت کے بدلے زیادہ مشقت کرواتا تھا۔ بیچارے غریب کی بیمار بیوی کو دوائی جبکہ اس کی چند روزہ معصوم بیٹی کو خوراک اور دودھ کی اشد ضرورت تھی۔غریب مزدور کام سے نکالے جانے اور نئی جگہ فورا کام نہ ملنے کے خوف سے ٹھیکیدار کے طعنے اور ظلم چپ چاپ سہتا رہتا ہے۔آج کل ہمارے غریبوں کو مزدوری کے سلسلے میں ایسے ہی بیشمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اب مزدوروں کی ملازمت کا تمام تر انحصار ٹھیکیداروں پر ہوتا ہے۔اگر ان کا جی چاہے تو کسی کو بھی ملازمت پر رکھیں اور اگر چاہیں تو کام سے نکال دیں۔تھوڑی سی رقم کے عوض مزدوروں سے بہت زیادہ محنت کروائی جاتی ہے اگر کوئی مزدور اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرے تو اسے کام سے نکالنے کے ساتھ ساتھ سخت سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔

مزدور آج ہماری ملکی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ان غریبوں ہی کی وجہ سے ملک کی معیشت خوشحالی و ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔مگر ان غریبوں کو بہتر زندگی کے لیے آسائشیں تو دور کی بات دو وقت کا کھانا تک نصیب نہیں ہوتا۔امیر اپنی جیب پیسوں سے بھرتے رہتے ہیں جبکہ غریب لوگوں کو تو علاج معالجے کے حوالے سے بھی بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگر کوئی غریب مزدور یا اس کے خاندان کا کوئی فرد ہیپاٹائٹس، تپ دق، ٹی بی اور دمے جیسی مہلک بیماری کا شکار ہو جائے تو ان کے پاس مہنگے مہنگے پرائیویٹ ہسپتال تو کجا کسی سرکاری ہسپتال میں بھی علاج کروانے کے لیے رقم موجود نہیں ہوتی۔مجبورا انہیں قریبی جعلی اور سستے کلینک سے دوائی لینی پڑتی ہے، جو کہ تھوڑے عرصے کے لیے تو افاقہ دیتی ہے تاہم بیماری اندر ہی اندر پلتی رہتی ہے اور بلا آخر ایک ناسور کی شکل اختیار کر کے موت یا کسی بڑے نقصان کا باعث بنتی ہے۔غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں غریبوں کو طبی حوالے سے درپیش مسائل کی بہترین انداز سے عکاسی کی ہے۔ان کے افسانے غربت کی چکی میں پستے لوگوں کی مشکلات اور معاشرتی حوالے سے عدم مساوات جیسے موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا کے کئی افسانے وڈیروں، جاگیرداروں اور چوہدریوں کے ہاتھوں دیہاتی عورتوں کے جنسی استحصال پر نوحہ کناں ہیں۔آپ کے افسانے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہات

کے بڑے بڑے چوہدری، وڈیرے، سائیں اور نواب عورتوں کے تقدس کے حوالے سے نہایت چھوٹی سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں کسی بھی کسان، ہاری، مزارعے یا مزدور کی بہن، بہو یا بیٹی کی کوئی عزت و آبرو نہیں ہوتی۔ ان کا جب جی چاہے جس مرضی گھر کی عورت کو اغواہ کر کے قتل کر دیں یا جتنے مرضی دن تک اپنی ہوس اور درندگی کا نشانہ بناتے رہیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا کیونکہ یہ سوال کرنے والے کو یا تو قتل کروا دیتے ہیں، دردناک سزائیں دیتے ہیں یا پھر ان پر چوری و دیگر جرائم کے جھوٹے پرچے بنوا کر عمر بھر کے لیے انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان تمام سزاؤں کی وجہ سے کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کر سکے۔ یہ لوگ مجبور و غریب عورتوں اور ان کے بوڑھے ماں باپ کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنی ناپاک و ناجائز ضرورتوں کے لیے استعمال کر کے ان سے جنسی آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ آپ کے افسانے "ٹھنڈے ہونٹ"، "اندھیروں کا رقص" اور "لمحوں کی قید" خواتین کے جنسی استحصال کی کہانیاں ہیں۔

نچلا طبقہ جن میں چھوٹے کسان، معمولی دکاندار، ہاری، مزدور، کمہار، مزارعے، تھوڑی تنخواہ والے کلرک اور چپڑاسی اور معمولی ذاتوں والے لوگ شامل ہیں، ان سب کو نہ صرف سرمایہ داروں، امیروں، جاگیرداروں، دیہاتوں کے وڈیروں کی طرف سے دکھوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ ان سے ایک درجہ اوپر وہ افراد جو طبقہ متوسطے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی طرف سے بھی رعب و دبدبے اور ظلم وستم کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے ان تمام مسائل پر بڑی دردمندی سے اپنے افسانوں کے ذریعے بات کی ہے۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانے معاشرے کے دبے کچلے لوگوں کی تکلیفوں اور مذہب کارڈ استعمال کر کے شرپسندی کرنے والے افراد کی سوچ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے "ڈائریکٹر جنرل"، "ہیلو ہائے" اور "انتظار" کے ذریعے معاشرے میں شادی اور نکاح کے حوالے سے درپیش رکاوٹوں مثلاً ذات برادری کا فرق، روپے پیسے کی تفریق، اور امیری غریبی جیسے مسائل سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں میں ہمارے معاشرے کے ایک بہت بڑے مسئلے کہ جس کا عورتوں کو اکثر اوقات سامنا کرنا پڑتا ہے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر عورتوں کو اپنی خوشی اور رضامندی سے زندگی گزارنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ ماں باپ اپنی مجبوریوں کے واسطے دے کر کبھی انہیں اپنے سے دوگنی عمر کے مرد سے بیاہ دیتے ہیں، تو کبھی

انہیں باہر نکل کر پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی طرح بعض اوقات والدین بے بسی کے عالم میں اپنی ان بچیوں کے لیے کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھتے ہیں جن میں ان کی مرضی شامل نہیں ہوتی مگر انہیں والدین کی عزت کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے "اندھیروں کے رقص" افسانے میں بے بس باپ "بابا کرمو" اور اس کی اکلوتی جوان بیٹی کی کہانی بیان کی ہے۔

بابا کرمو ایک ہاری تھا، جسے اپنے گاؤں اور ان زمینوں، جہاں اس کے باپ دادا نے اپنی تمام عمر محنت مزدوری میں گزار دی تھی، سے بہت محبت تھی۔ وہ بیمار اور اپنی عمر کے آخری حصے میں تھا۔ گاؤں کا چوہدری جمیل اس کی جوان بیٹی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ بابا کرموں کو دھمکی کے انداز میں حکم دیتا ہے کہ تم یا تو اپنی بیٹی کو میری حویلی میں بھیج دو یا پھر چپ چاپ یہ جھونپڑی اور میری زمینیں خالی کر دو۔ جس پر بے بس باپ اپنی بیٹی کو اس کی مرضی کے بغیر حویلی بیٹھنے کا کہتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے چوہدریوں کی بے حسی، مفاد پرستی، جنسی بے راہ روی اور معاشرے کے بھیانک چہرے سے پردہ اٹھایا ہے۔

ہمارے سماج کا یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی مجبوریوں کی ماری عورت گھر سے باہر نکل کر اپنے شوہر کے ساتھ محنت مزدوری کرنا چاہتی ہے تو اسے معاشرے کی بہت سی ناگوار اور چبتیا ہوئی باتوں اور طعنوں کو سننا پڑتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں مردوں کی غلیظ نگاہوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مہر غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ٹھنڈے ہونٹ مزدور پیشہ عورتوں کے انہی مسائل کو بیان کرتا ہے۔

افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں یتیم بچوں کو پیش آنے والی مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپ کا افسانہ "انو" یہ ظاہر کرتا ہے کہ جن بچوں کے والدین ان کے بچپن میں ہی انتقال کر جاتے ہیں، انہیں سماجی حوالے سے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سے ان کا بچپن چھن جاتا ہے۔ وہ پڑھنے لکھنے، رنگ برنگی کتابوں کو تھامنے، اور کھیلنے کودنے کی عمر سے پہلے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔ ذمہ داریوں کا بوجھ ان کی خواہشات کو مار کر انہیں سڑکوں، ورکشاپوں اور مزدوری کے اڈوں پر لے آتا ہے۔ ان کا بھی جی کرتا ہے کہ وہ بھی کندھے پر بستہ اٹھائے سکول جا کر تعلیم حاصل کریں، بے فکری سے دوستوں کے ساتھ کھیلیں کودیں مگر ان کے معاشی حالات انہیں اس سب کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانے ہماری زندگی میں ہونے والے روزمرہ واقعات کو تجسس و دلچسپی اور حقیقت کی گہرائیوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آپ کے افسانوی مجموعے "لمحوں کی قید" کے اکثر افسانوں میں مکار وڈیروں کی دوہری شخصیت اور منافقت کا پردہ کھل کر چاک ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے اکثر افسانے یہ واضح کرتے ہیں کہ اس طرح یہ نام نہاد عزت کے مالک

چوہدری اور وڈیرے اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعیا پنے کسی بھی ناپسندیدہ شخص کو قتل کروا کر اس کی موت کا سارا الزام اپنے مخالفین پر تھوپ کر انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھجوا دیتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں میں منفی جاگیردارانہ سوچ کا کھلا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ غلام فرید نے اپنے افسانوی مجموعے "لمحوں کی قید" میں جیل کے قیدیوں کی زندگی کے لمحات کو بیان کیا ہے۔ ان کے یہ افسانے آج کل کے سماج کی ثقافتی، دیہاتی، تہذیبی اور طبقاتی زندگی کی کا عکس دکھائی دیتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے بعض افسانوں میں متوسط طبقے کو درپیش مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً ان کا افسانہ "ڈائریکٹر جنرل" متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک لڑکے سروش کی کہانی ہے۔ سروش جو کہ ایک نہایت لائق، محنتی، اصول پسند، کھڑی طبیعت کا مالک اور خوددار انسان تھا۔ اس کے باپ نے گھریلو اخراجات سے پائی پائی کر کے تھوڑی تھوڑی رقم بچائی اور کمیٹیوں کے ذریعے پیسے جوڑ کر اپنے بیٹے کو پڑھایا تا کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی اچھی جگہ نوکری کرے، چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم اور والدین کے بڑھاپے میں مدد کرے۔ مگر یونیورسٹی سے اچھے نمبروں میں ڈگری حاصل کرنے کے باوجود بھی اسے کسی اچھی جگہ نوکری نہیں ملتی۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی سفارش یا رشوت دینے کے لیے بہت زیادہ رقم موجود نہ تھی۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانے ہمارے معاشرے میں روز بروز بڑھتی کرپشن اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ مشکلات و مسائل مثلاً چوری چکاری، دھوکہ دہی، بدامنی و فراڈ، خودغرضی کے پیچھے چھپے محرکات کو واضح کرتے ہیں۔

آج غربت ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکی ہے اس کی سب سے بنیادی وجہ مہنگائی کا روز بروز بڑھتا طوفان ہے۔ غریبوں کے پاس اپنی ضروریات زندگی کی دستیابی کے لئے رقم موجود نہیں ہوتی۔ تھوڑی تنخواہ اور بہت سارے مسائل ہونے کی وجہ سے غریب بیچارہ غربت کی چکی میں پسنے پر مجبور ہے۔ غریبوں کے پاس اچھی خوراک، تعلیم اور صحت جیسی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سب کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں غربت اور ناخواندگی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو پڑھانے کی بجائے بچپن ہی سے محنت و مزدوری پر لگا دیتے ہیں۔ یوں یہ ننھے بچے کتابیں بستہ تھامنے کی عمر میں مختلف دکانوں، ہوٹلوں اور ورکشاپوں پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

قدرتی آفات، سیلاب اور زنزلے وغیرہ وہ آزمائشیں ہیں جو امیری غریبی کے فرق کے بغیر کبھی پر بھی کسی بھی لمحے آ سکتے ہیں۔ امیر اور سرمایہ دار لوگ تو اپنے روپے پیسے کی بدولت دوبارہ اپنے مکان تعمیر کر لیتے ہیں، جانی نقصان کے علاوہ ہر شے کا ازالہ کر لیا جاتا ہے۔ تاہم غریب بیچارہ

جس نے اپنی عمر بھر کی پائی پائی جوڑ کر اپنا مکان بنایا ہوتا ہے، کسی بھی نقصان کی صورت معاشی وجذباتی حوالے سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے "سرسوں کے پھول" کے تین افسانوں یعنی" پتھر کی گرفت "، "ویرانے کا پھول "اور" میں انجینئر بنوں گا" میں زلزلے کے نتیجے میں غریبوں کی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ قدرتی آفات امیر وغریب ہر ایک کو متاثر کرتی ہیں، مگر ہاں غریب طبقہ امیروں کی نسبت اس سے زیادہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے غریبوں کی ان دردبھری کہانیوں کے ذریعے سے زلزلے کے نتیجے میں درپیش تکلیفوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کس طرح سے جب دیہات میں زلزلہ آتا ہے تو غریبوں کے گھر اور بستیاں اس آزمائش کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کے مکان ملبے تلے دب جاتے ہیں۔ ہر طرف زخمیوں کی چیخ وپکار اور آہ وزاری ہوتی ہے تاہم انہیں سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ان بیچاروں کے لیے کوئی سرکاری مشینری نہیں آتی جو انہیں یا ملبے کے نیچے دبے انکے سامان اور پیاروں کو باہر نکالے۔ یہ غریب لوگ اپنی مدد آپ کے تحت تمام مصیبتوں سے خود ہی نہیں نمٹتے ہیں۔ مگر بعض لوگ تو کئی دنوں تک انہی حالات میں پھنسے مدد کی دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ شاید کوئی آکر معاشی حوالے سے ان کا سہارا بنے مگر ان کی یہ چیخ وپکار سن کر مدد کو آنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یوں ان کی آوازیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے حلق ہی میں پھنس کر رہ جاتی ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں کے ذریعے دیہاتی زندگی کی مشکلات سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ گاؤں اور دیہات وغیرہ میں اکثر اوقات وڈیروں، زمینداروں، نوابوں اور چوہدریوں کا راج ہوتا ہے۔ جو کہ غریبوں پر ظلم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ روپے پیسے اور طاقت کے نشے میں ڈوبے جاگیردار اپنی زمینوں کی کھیتی باڑی اور دیکھ بھال کیلئے چھوٹے کسانوں، ہاریوں، مزدوروں اور مزارعوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان غریبوں سے محنت ومشقت تو کروا لیتے ہیں تاہم ان کی مشقت کا پورا معاوضہ نہیں دیتے۔ ان کے خیال میں ان غریبوں کی اتنی اوقات نہیں ہوتی کہ انہیں بہت زیادہ اجرت وعزت سے نوازا جائے۔ اگر انہیں ان کا پورا حق دے دیا جائے تو ان کی تو عقل ٹھکانے نہ رہے گی۔ اس لیے ان غریبوں کو فقط اتنا اناج دیا جاتا ہے کہ وہ دو وقت روکھی سوکھی کھالیں۔ یہ جاگیردار غریبوں کو ان کی محنت سے کمائی روزی تک نہیں لینے دیتے، کیونکہ ان کی نگاہ میں یہ لوگ کم ذات اور کم حیثیت ہوتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت بھی نہیں ہوتی۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں غریب مزدوروں پر ہونے والے مظالم کو بڑی دردمندی سے

بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مزدور بچارے محنت مشقت کے باوجود بھی ان جاگیروں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔انہیں اپنے لیے انصاف مانگنے،حتیٰ کہ مالک سے کسی شکوے تک کی اجازت نہیں ہوتی۔کیوں کہ انہیں اپنی ملازمت چھن جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کے افسانے عہد حاضر میں غریبوں کو درپیش تکالیف ومشکلات کی عکاسی کرتے ہیں۔غلام فرید کاٹھیانے اپنے افسانوں میں سرمایہ داروں،نوابوں،وڈیروں اور جاگیرداروں کے دوغلے پن،مکاری وریاکاری،خودغرضی،فرعونیت،جھوٹی شان وشوکت اور خودی جیسی باتوں کو منظر عام پر لانے کی جی جان سے کوشش کی ہے۔اور وہ بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ٹھہرے ہیں۔آپ کے افسانوں کے موضوعات میں خاصی جدت پائی جاتی ہے۔آپ نے جن افسانوی موضوعات کا انتخاب اپنے افسانوں میں کیا،ان سے قبل ان موضوعات پر بہت تھوڑا لکھا گیا۔چونکہ پس ماندہ طبقے کی مشکلات کی لسٹ کافی لمبی ہے،افسوس کے ہمارے افسانہ نگاروں نے ان موضوعات پر کبھی کھل کر قلم ہی نہیں اٹھایا۔ بلکہ ہمارے ہاں تو وہی پرانے موضوعات ہی بار بار افسانوں کی زینت بنتے آرہے ہیں۔جن میں کسی امیر کبیر باپ کی بگڑی ہوئی اولاد،رئیس کا بزنس مین بیٹا یا کسی سول آفیسر کا بچہ اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز دکھایا جاتا ہے۔وہی پرانے عشق ومعشوقی کے قصوں کہانیوں میں لوگوں کو الجھا کر پسماندہ لوگوں کی مشکلات کو پس پشت ڈالا جاتا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے،جو آج کے دور میں غریبوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے ہیں،جو یتیموں،مسکینوں اور بے سہاروں کے دکھوں کو اپنا دکھ اور اپنی تکلیف مانتے ہیں،جن میں درد انسانیت کوٹ کوٹ کر بڑھا ہوتا ہے،جو سچ کا ساتھ دیتے اور حق کی بات پر ڈٹ جاتے ہیں۔غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں میں غریبوں کی زندگی کا کرب واضح جھلکتا ہے پھر چاہے وہ تیز دھوپ میں محنت مزدوری کرتی عورتوں کا جنسی استحصال ہو،جبر کے مختلف رویے سہتے محنت کش ہوں،طاقتور کا ظلم ہو،علاج وصحت کی سہولتیں کا فقدان ہو،کسی مجبوری کے تحت کام سے چھٹی کرنے والے محنت کش کی ملازمت وتنخواہ کا مسئلہ ہو۔ یا کسی محنت کش ہاری پر ہونے والے جبر کی داستان ہو،غلام فرید کاٹھیا نے ان تمام مسائل کو بڑے ہی بہترین انداز سے بیان کیا ہے۔غلام فرید کاٹھیا کے افسانے معاشرے کی زندہ حقیقتیں معلوم ہوتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں کے جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آج ہمارے ملک میں تقریباً60 فیصد سے زیادہ لوگ غربت اور پسماندگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ان کے

گھریلو حالات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ سکون سے دو وقت کی روٹی تک نہیں کھا سکتے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب ان کے مسائل حل ہونے کی بجائے آئے روز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانے جیل میں قید بے گناہ لوگوں اور دیہات میں رہنے والے معصوموں پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ بیشک غلام فرید کاٹھیا اردو فکشن کے لیے ایک بہترین اضافہ ہیں۔

شاہد رضوان

شاہد رضوان کا شمار ہمارے جدید دور کے ان ابھرتے ہوئے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ کہ جنہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی مسائل کی بڑی دردمندی سے تصویر کشی کی ہے۔ شاہد رضوان افسانے کی روایت کے ساتھ مضبوطی سے جڑے وہ افسانہ نگار ہیں جو منٹو کو اپنا روحانی پیر اور پیشوا مانتے ہیں۔ شاہد رضوان کے افسانوں کے موضوعات ہمارے اسی سماج سے جنم لیتے ہیں۔ جس کرب اور بے بسی کے عالم میں ہم آج مبتلا ہیں اس کی تصویر کشی ان کی کہانیوں میں واضح نظر آتی ہیں۔

شاہد رضوان کے اب تک چار افسانوی مجموعے "پتھر کی عورت"، "پہلا آدمی"، "آوازیں" اور "ادھوری کہانی کی تصویر" چھپ چکے ہیں۔ شاہد رضوان کے افسانوی مجموعوں میں درمیانے طبقے کی عورتوں کے مختلف روپ، مردانہ ظلم سہتی خواتین، نو بیاہی عورتوں کے ارمانوں، دہشت گردی کا بازار گرم کرنے والے عناصر، معاشرتی منافقت، عوام سے ناجائز پیسہ بٹورنے، کرپشن کرنے والے حضرات،، اور زندگی کی مختلف کہانیاں بڑی خوبصورتی سے سموئے گئے ہیں۔

شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں نفسانی خواہشوں، تشنہ آرزوؤں، اور جنسی بے راہ روی کے باعث معاشرے میں پروان چڑھتی اخلاقی پستیوں کا بہت کھل کر ذکر کیا ہے۔ شہروں میں بسنے والے لوگوں کی زندگیوں میں سستی، بد نیتی، بد دیانتی، رشوت خوری، ضمیر فروشی، بے چینی، بے اعتنائی، بے پرواہی، بے وفائی اور اعتبار کی کمی نے ڈیرے جما لئے ہیں۔ دیہات کی کہانیاں ہوں یا کہ شہر کے لوگوں کے قصے، اب ہر طرف مطلب پرستی کی فضا پھیل چکی ہے۔ شاہد رضوان نے ان تمام حالات کو اپنے افسانوں میں بہت ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔

شاہد رضوان کا شماران افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کے افسانوی موضوعات میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ شاہد رضوان کے افسانوں میں "وطن سے محبت کے جذبات، اپنوں کے چھوٹ جانیکا دکھ،، زندگی کے غم، خوشیوں کی نوید، عورت کو سماجی حوالے سے درپیش مسائل، محبت کی بے وفائی ظلم و جبر، جنسی استحصال، ثقافتی روایات، لوگوں کی سادہ لوحی یہاں تک کہ زندگی کا ہر رخ اور

ہر پہلو دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانوں میں جدید معاشرت جھلکتی ہے۔شاہد رضوان نے تن اور من کے تضاد کے نتیجے میں ضمیر میں پیدا ہونے والی کشمکش کو بڑی فنی مہارت اور نہایت احسن انداز سے قارئین کے سامنے بیان کیا ہے۔

شاہد رضوان سرمایہ داروں، امراء اور برسر اقتدار حضرات کی طرف سے طبقات کے فرق، ظلم اور ناانصافیوں کو بڑے ہی پر درد انداز سے اپنے افسانوں میں جگہ دیتا ہے۔ان کی تمام کہانیوں میں جگہ جگہ غلام عباس کے افسانوں جیسی وسعت اور منٹو جیسی جنسی سفا کی کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔شاہد رضوان جدید دور کے انسان کی سوچ و عادات اور موجودہ حالات پر گہری نظر رکھتا ہے۔اسی وجہ سے اس کے افسانوں میں دلچسپی و تجسس کا عنصر نمایاں ہے یہی وجہ ہے ان کی کہانی پڑھنے والا کہانی کو درمیان میں ادھورا نہیں چھوڑ پاتا۔شاہد رضوان کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اکثر اوقات کہانی کا اختتام نہیں کرتا بلکہ اسے قارعین ہی پر چھوڑ دیتا ہے تا کہ وہ اپنی سوچ کے ذریعے کوئی حتمی نتیجہ نکالے۔

شاہد رضوان کے افسانوں میں اچھائی اور برائی کی تفریق بڑے ہی واضح انداز میں نظر آتی ہے۔افسانہ نگار کے افسانوں کو پڑھ کر سماج کی بے رحمی کا پتا چلتا ہے۔شاہد رضوان کے افسانوں کی زبان نہایت سادہ، موثر اور قارئین کو اپنے سحر میں جکڑنے والی ہے۔ان کے افسانوں میں جزئیات نگاری، تفصیلات، اور محکمات کا بڑی ہنر مندی سے استعمال کیا گیا ہے۔شاہد رضوان کے افسانے سماج کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کے گرد تشکیل پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پڑھ کر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

شاہد رضوان کے افسانوں کے کردار نچلے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔جو اپنے ماحول اور طبقے کی زبان کی بہترین انداز سے عکاسی کرتے ہیں شاہد رضوان کی کہانیوں میں معاشرے کی ثقافت جھلکتی ہے اور ان کے افسانے روانی سے بھرپور ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی حقیقتوں کی خوب ترجمانی کرتے اور افسانے کو غیر جانبداری پیش کرتے ہیں۔شاہد رضوان کے افسانوی کردار اپنے پڑھنے والوں سے گفتگو کرتے، خوشیاں اور غم بانٹتے، زندہ سلامت دکھائی دیتے ہیں۔ایک بہترین افسانہ جن خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، ان سب خوبیوں کی موجودگی کا شاہد رضوان کے افسانوں میں پایا جانا شاہد کی افسانے سے دلچسپی و گہری وابستگی کا ثبوت ہے۔

دین اسلام نے عورت کو تمام مذاہب سے زیادہ عزت دی۔اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے مقدس رشتوں میں وقار سے جینے کا حق دیا۔مگر ہمارے ہاں عورت کو اس کے جائز حقوق ہی سے

محروم کر دیا جاتا ہے۔ غربت، جہالت، ہوس پرستی اور لالچ پر مبنی معاشرے میں آج یہ عورت ہر طرح سے ذلیل و رسوا ہو رہی ہے۔ اگر یہ غربت کے مارے مہنگائی سے تنگ آ کر گھریلو حالات بدلنے کی خاطر باہر نکل کر ملازمت کرتی ہے تو اسے مردوں کے چبھتے ہوئے طنزیہ جملوں اور ہوس پرست نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تو کہیں اسے سسرالی رشتوں اور بندھنوں کی زنجیروں میں جکڑ کر قربانی مانگی جاتی ہے۔ تو بعض اوقات اسے بیاولادی کا طعنہ دے کر گھر سے بے دخل کیا جاتا ہے۔ آج کل عورت سے جنسی و اجتماعی ظلم و زیادتی اور گھریلو تشدد کے واقعات بہت بڑھ چکے ہیں جس کی وجہ سے طلاق اور خودکشی کی شرح میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ہمارے معاشرے میں راہ چلتی خواتین پر آوازیں کسنا، انہیں برے برے ناموں سے پکارنا، مختلف طریقوں سے انہیں بلیک میل کرنا عام سی بات بن چکی ہے۔ جوان بہنوں کا خود ساختہ غیرت کے نام پر قتل، طاقتوروں کی طرف سے عورت کا اغوا، کام کرنے کی جگہوں پر عدم تحفظ، کہیں آنے جانے پر پابندی، زنا بالجبر، صحت و علاج کی سہولیات کا نہ ملنا، قرآن سے نکاح، کم عمری کی شادی، وٹہ سٹہ، کاروکاری، تعلیم سے محرومی، خود خلع نہ لے سکنے کی اجازت جیسے بے شمار مسائل ایسے ہیں، کہ جن کا شکار ہمارے معاشرے کی عورت ہے۔

عورت اپنی مرضی سے پسند کی شادی نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے شوہر کے ظلم کی شکایت کرنے کا حق نہیں ہوتا، حتیٰ کہ ظلم یہ ہے کہ باپ کی وراثت میں ملنے والے حصے تک پر بھائی قابض ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ آج عورت کا جنسی و ذہنی استحصال، محبت میں نامرادی، مرد کی خفیہ شادیوں، مزدوری کے سلسلے میں برسوں بیرون ملک مقیم رہنا وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کے حل اور خاتمے کی بہت ضرورت ہے تا کہ عورت بھی معاشرے میں عزت کے ساتھ سکھ کا سانس لے سکے۔ شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں عورت پر ہونے والے ان تمام مظالم پر بڑی جرات مندی سے کھل کر بات کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد رضوان کے بیشتر افسانوں میں ہمیں متوسط طبقے کی عورت کے مختلف کردار نظر آتے ہیں۔ ''آوازیں'' میں شوہر کی نامردی پر چپ رہ کر بانجھ عورت کا لقب پاتی کنول ہو یا مائی مستانی، ''پتھر کی عورت'' کی رضیہ کی کہانی ہو یا کہ چندا کے دل میں پنپتے خوشحالی کے خواب، ''آخری سیڑھی'' کی طوائف نیلوفر ہو یا پھر ''کتیا'' افسانے میں شگفتہ، یہ تمام ہی معاشرے کے ظلم سہتی مختلف خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں۔ تانیثی حوالے سے شاہد رضوان کے بہترین افسانوں میں ''جوگی

چوک‘‘، ’’تارکول کی سڑک‘‘، ’’سفید بال‘‘، ’’دجال‘‘، ’’غارت گرلمحہ‘‘، ’’ٹرمینل‘‘اور’’ٹھیکے دار‘‘ وغیرہ شامل ہیں۔غرض شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں مختلف ادارے میں زیرتعلیم بچیوں سے لے کر خاندانی جبرسہتی عورتوں ،نئی نویلی دلہنوں ،مشقت ومزدوری کے لیے دھکے کھاتی عورتوں اورسماجی ستم سے اکتائی خواتین وغیرہ ہرایک کے مسائل کو بیان کیا ہے۔آج ہمارے ملک کے غریبوں کے لئے روزگار کا مسئلہ اک بہت بڑی مشکل بن گیا ہے۔مہنگائی کے سبب غریبوں کے پاس کھانے کو روٹی نہیں تو کہیں مجبوریوں کیماریلوگ اپنی چھتوں سے محروم ہیں۔پینے کے صاف پانی کی شدید کمی ہے، تعلیم اورصحت کی سہولیات فقط امیروں ہی کے لیے ہیں۔غریب بیچارے کا کوئی پرسان حال نہیں۔ سرکارکوصرف اپنے خزانے بھرنے کی فکر ہے۔غریب بیچارہ آئے روزامیروں کےنواب زادوں کی گاڑیوں کی ٹکروں کے نتیجے آکرحادثوں کا شکارہورہاہے،کسی بھی سیاسی پارٹی کےلیڈرسے دشمنی کے باعث اس کے معمولی کارکن گولیوں کا نشانہ بنا کربھون دیے جاتے ہیں،لوگوں سے آج آزادی رائے کا اختیارچھین لیا گیاہے،دہشت گردی کے نتیجے میں معصوم لوگ اپنی جانوں سے جارہے ہیں۔ یتیموں،بیواؤں،اور بےسہاروں کا کوئی آسرہ نہیں رہا۔لوگ قدرتی آفات کے سبب سالوں تک نارمل زندگی کی خوشیوں کی طرف نہیں لوٹ پاتے۔خودکش حملے خاندان بھرکواجاڑرہے ہیں،معصوموں کی شہادتوں کے کی وجہ سے کتنے ہی بچے یتیمی کی زندگی کےسبب کم عمری ہی میں کمانے پرمجبورہوتے ہیں۔شاہدرضوان نے ہمارے معاشرے میں پائے جانے والےان تمام مسائل اورمشکلات کواپنے افسانوں کے ذریعے اجاگرکیا ہے۔شاہدرضوان کادل انصاف کے لئے دربدرپھرتے عوام،ملازمت کیلئے دھکے کھاتے لوگوں،زمینوں کی رجسٹری،اورکئی سالوں سے لٹکے کیسوں کی پیشیوؤں،اوررشوت خوروں کے مکروفریب کے سبب بہت کڑھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شاہدرضوان نے اپنے افسانوں میں انصاف کے کھوکھلے نظام،لوگوں کی خودغرضی ومفادانہ ذہنیت،تلخ رویوں،سیدھے سادھے دیہاتیوں کے جعلی بابوؤں کے جھانسے میں آنے،عورتوں سے معاشرتی ظلم کو بڑے ہی موثر انداز سے اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔شاہد رضوان نے رشوت خوری،وراثت کے گنجلگ معاملوں،قدرتی آفاتوں،زلزلوں،سیلابوں کے نتیجے میں ہونے والے جانی ومالی نقصان اورسماج کے بھیانک چہروں سے پردے نوچنے کی جرأت مندانہ کوشش کی ہے،اورآپ اس میں بہت حدتک کامیاب بھی ٹھہرے

ہیں۔ بلا شبہ شاہد رضوان جدید اردو افسانے کے لیے ایک شاندار اور بہترین اضافہ ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان کے افسانوں کا تقابل

غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان دونوں دور حاضر کے ذہین اور فاضل فکشن نگار ہیں۔ ان دونوں ہی کی افسانہ نگاری کا دائرہ کار خاصا وسیع ہے۔ ان کے افسانوں کے متعدد کردار جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں ماضی کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے اپنے شعور کے مطابق سماج کی فضا کی بڑے ہی بھرپور انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ ان دونوں کے کردار اپنی ذہانت اور زندگی کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والی فضا میں اپنے ذہن اور کردار و عمل کے لحاظ سے اپنے فیصلوں پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ہم دیکھیں تو ان دونوں کے ہاں پائے جانے والے نسوانی کردار مردوں ہی کی طرح جاندار اور اپنے قول و فعل کے خود ذمہ دار نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی سوچ کے ذریعے اپنی پہچان کرواتے، اور اپنے عہد کے انسان کے دکھ سکھ، آرزوؤں، تمنّاؤں، محرومیوں اور شادمانیوں کا عکس دکھائی دیتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان دونوں اردو افسانے کی روایت سے جڑے بہترین افسانہ نگار ہیں۔ بلا شبہ دونوں کا اسلوب سادہ، دل نشین، اور موثر ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے عوامی مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی، غربت کی چکی میں پستے لوگوں کی آواز بنے۔ ان کے افسانے صداقت سے معمور، عصری معاشرت اور اس کے مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ معاشرتی اور سماجی جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے المیے دونوں ہی مصنفین کے افسانوں کا موضوع بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان کے افسانوں کے کردار ہمارے اسی معاشرے سے جنم لیتے ہیں، اور جس کرب، دکھ، تنہائی اور بے کسی کے عالم سے ہم گزر رہے ہیں اس کی تصویریں ان کے افسانوں میں جابجا ملتی ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں کے اکثر موضوعات پسے ہوئے طبقے کے غریب کسانوں، ہاریوں، مزدوروں اور دیگر پسماندہ افراد پر مشتمل ہیں، جبکہ شاہد رضوان کیا فسانوی موضوعات متوسط طبقے کے مسائل اور خصوصاً عورتوں پر ہونے والے سماجی و جسمانی مظالم پر مبنی ہیں۔ طبقاتی کشمکش پر کڑھتے، ناانصافیوں اور ظلم کی داستانوں کو اپنے افسانوں میں سموتے ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جہاں کافی تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے، وہیں ان کے ہاں کچھ موضوعات ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں۔ اس لئے ان دونوں افسانہ نگاروں کے فکر و فن کا تقابلی مطالعہ کیا جانا از

بس ضروری ہو جاتا ہے تاکہ نہ صرف یہ کہ دونوں کی فکری و تکنیکی خصوصیات پر روشنی ڈالی جا سکے بلکہ ان کے فرق و امتیاز اور مماثلتوں اور مخالفتوں کو بھی واضح طور پر سامنے لایا جا سکے، تاکہ موجودہ صدی کے ادبی ماحول کے تناظر میں ان جدید اور ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کے فکر و فن کے مطالعے سے مستقبل کے معمار کا تعین کیا جا سکے۔

رشوت ہمارے ملک کے تمام ہی اداروں میں زہر کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ آج ہمارا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جہاں اس کا راج نہ ہو۔ تعلیمی ادارے ہوں، کسی نوکری کا حصول ہو، کوئی عدالتی فیصلہ ہو یا کے وراثت کی رجسٹری وغیرہ کے معاملات، رشوت نے ہر جگہ ڈیرے جما لئے ہیں، ہر طبقہ اس میں ملوث نظر آتا ہے، چاہے کوئی غریب مزدور کا ہو یا پھر امیر، چھوٹی پوسٹ پر کام کرنے والے کلرکھوں یا بڑے محکموں کے ملازمین، اب ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ غرض ہمارے ملک میں آج رشوت کا بازار ہر سو گرم ہے۔ شاہد رضوان نے اپنے افسانوں کے ذریعے ملک میں ہونے والی کرپشن، لوٹ مار اور رشوت کے بارے میں بڑے ہی مؤثر انداز سے بتایا ہے۔

ان کا افسانہ ''بابا جی'' ایک بزرگ محمود کی کہانی ہے، جو کے اپنی جوانی میں اپنے گھر کے قریب ایک خالی پلاٹ قیمتاً الاٹ کروانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے بڑھاپے تک پہنچ گے مگر ان کا پلاٹ الاٹ نہ ہو سکا۔ محمود نے اپنی ساری جوانی کچہریوں، پٹواریوں اور کلرکوں کے دفتروں کے چکر لگانے میں صرف کر دی۔ مگر سرکاری دفتروں میں بیٹھے رشوت خوروں نے تمام تر قانونی کارروائیاں پوری ہونے کے باوجود بھی ان کے نام پلاٹ کا اجراء نہ کیا۔ شاہد رضوان نے اپنے اس افسانے کے ذریعے بتایا ہے کہ کس طرح ایک شخص اپنی جوانی کی تمام تر بہاریں اور زندگی کے خوبصورت ترین ایام زمینی بکھیڑوں میں گزار دیتا ہے۔ سرکاری دفتروں میں بیٹھے پٹواری، کلرک اور آفیسر بار بار فائلیں اوپر سے نیچے بدل کر اس سے خرچے پانی کے نام پر پیسے بٹورتے رہتے ہیں۔

افسانے کے مرکزی کردار محمود نے قیام پاکستان سے قبل زمین کا ایک ٹکڑا اپنے نام کروانے کے لیے درخواست دی تھی، ملک کو بنے ہوئے اتنے سال بیت گے مگر اس کا پلاٹ اس کے نام جاری نہ ہو سکا۔ بچارہ محمود کچہریوں، کلرکوں اور آفیسروں کے سامنے پیش ہوتے ہوئے تھک گیا۔ مگر یہ سب لالچی ملی بھگت سے اسے ہر دفعہ کل آنے یا اگلی پیشیوں کا کہہ کر سفید جنڈی دکھاتے رہے۔ کبھی ریڈر کبھی پٹواری، کہیں چپڑاسی کبھی کلرک تو کبھی نائب تحصیل دار دستخط کروانے، ڈائری نمبر دلوانے، پیشی میں اوّل نمبروں پر لانے، بیع نامے پر کبھی دستخطوں کا سنا کر ہر بار میں اس بچارے کو لوٹتے رہے۔ ہر نئے آنے والا آفیسر سابقہ افسروں

کے کھولے گئے کیسوں کو بند کر کے نئے کیس کھول لیتا تھا جس کی وجہ سے محمود کا کیس لٹکتا گیا۔

شاہد رضوان نے اپنے اس افسانے کے ذریعے زمینی معاملوں میں ہونے والی تاخیر کے پیچھے کارفرما تمام عناصر اور کرداروں کے مکروہ چہروں سے نقاب ہٹانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ افسانے کی کہانی بہت جاندار ہے۔ رشوت خوری کو موضوع بنا کر مصنف نے معاشرے کے ان ناسوروں پر کاری ضرب لگائی ہے جو عوام کا پیسہ حرام ذرائع سے کما کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔شاہد رضوان نے محمود اور کلرک کے درمیان مکالمے اور اس دوران کلرک کے رشوت کے تقاضے کو یوں بیان کیا ہے:

> ''وہ سو کا نوٹ دے کر ایک طرف لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گیا۔لڑکا فائل ڈھونڈنے لگا، کچھ ہی دیر بعد فائل مل گئی۔کلرک نے پیشی کی تاریخ ڈال کر اسے رخصت کر دیا تھا۔وہ جب بھی جاتا صاحب چھٹی پر ہوتے، تین مہینے اسی طرح گزر گئے،دو تین بار ایسا ہوا کے صاحب بیٹھتا مگر جب اس کی باری آتی صاحب اٹھ جاتا، کیونکہ اس کا نمبر آخری نمبروں میں ہوتا تھا۔''آخری نمبر والوں کی پیشی پڑتی ہے، کام نہیں ہوتا، کام کروانے کے لیے پہلے نمبروں میں شامل ہونا بہت ضروری ہے"،اسے سمجھ آ گئی تھی۔آخر تنگ آ کر اس نے کلرک سے ساز باز کی،'' پہلے نمبروں میں آنے کے لئے۔۔۔ایک ہزار کا نوٹ لگے گا"،کلرک نے صاف بتا دیا تھا۔اس نے پانچ سو دیئے اور منت سماجت الگ کی۔کلرک اس نے اس کا نام آئندہ پیشی میں دسویں نمبر پر لکھ دیا تھا۔''(1)

ہمارے معاشرے میں امیر طبقے کی جانب سے ازل ہی سے غریبوں کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔آج بھی ان بیچاروں کے حقوق چھیننے کے ساتھ ساتھ انہیں ہر طرح سے بے عزت کیا جاتا ہے۔ معاشرے کے امیروں کی نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ انہیں طرح طرح سے ذلیل کرتے ہیں۔ اان کے جائز حقوق سے انہیں محروم کرتے ہیں۔محنت مزدوری یعنی کام کاج والی جگہوں پر ان کے حق مارتے ہیں۔ان بیچارے معصوم لوگوں کو ان کی پوری اجرت نہیں دی جاتی،اپنے مفاد کے لئے ان سے غلط اور ناجائز کام بھی کروائے جاتے ہیں۔اگر کوئی یہ سب کرنے سے انکار کرے تو اسے کام سے نکالنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔

ہمارے اکثر دیہاتوں میں وڈیروں، جاگیرداروں، زمینداروں اور نوابوں کا راج ہوتا

ہے جو اپنے ہاں زمینوں پر محنت مزدوری اور کام کرنے والوں پر طرح طرح سے ظلم ڈھاتے ہیں۔ان کو کام کی پوری اجرت نہیں دیتے، بلکہ ان سے زبردستی زیادہ مشقت کروائی جاتی ہے،ان مزدوروں کی عورتوں کی عزتوں کو تار تار کیا جاتا ہے، جب مرضی جس وڈیرے کا جی چاہتا ہے اپنے مخالفین میں سے کسی کو بھی قتل کروا کر جھوٹا الزام اپنے ان ملازمین پر ڈال کر انہیں تمام عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینکوا دیتا ہے۔ پولیس ان کے گھر کی باندی ہوتی ہے، جو ان کے روپے پیسے اور اثر ورسوخ کے باعث غریبوں پر بنا کسی ٹھوس ثبوت مقدمے ڈال دیتی ہے۔غریب بیچارے کے پاس نہ تو اتنا روپیہ پیسہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ضمانت کروا سکے،اور نہ ہی اس قدر طاقت کہ ان فرعون نما لوگوں کے سامنے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ وہ تمام عمر جیل ہی میں گزار دیتا ہے، جہاں جیل وارڈن اور عملے کی طرف سے اسے غیر انسانی برتاؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جیل کی کوٹھریوں میں مقید قیدیوں کو کھانے پینے کے لیے غیر میعاری کھانا دیا جاتا ہے۔ یہ پولیس والے اچھے بھلے آدمی کو مار مار کر ملزم سے مجرم ثابت کروا دیتے ہیں۔ یہ لوگ اکثر علاج اور صحت کی سہولیات سے بھی محروم رہتے ہیں۔ان کے خاندان اور اہل خانہ کو ان سے ملنے نہیں دیا جاتا۔اگر گھر سے ان کے لیے کوئی چیز لائے تو یہ وردی والے اس پر بھی اپنا حق جما لیتے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ ان کی لالچ تو یہاں تک ہوتی ہے کہ اگر کسی غریب کے پاس دو چار سگریٹ بھی ہوں تو یہ وہ تک نہیں چھوڑتے۔غرض ان بچارے لوگوں کو اپنا کوئی بھی چھوٹا موٹا کام کروانا ہو تو انہیں مجبوراً رشوت دینا پڑتی ہے۔

آج ہمارے ملک کے تقریباً تمام ہی اداروں میں رشوت کا بازار گرم ہے، کیونکہ رشوت کے بغیر کسی بھی کام کا تصور ناممکن ہے۔رشوت خوری ایک عام سی بات بن چکی ہے۔ ہمارے سماج میں اسے بالکل بھی غلط نہیں سمجھا جاتا۔مگر حکومت اور عوام کو مل کر اس کی روک تھام کے لیے کوشش کرنی چاہیے تاکہ ایک پاک صاف اور انصاف پر مبنی معاشرہ وجود میں آ سکے۔

رشوت جیسی لعنت ہمارے معاشرے کے لیے ناسور بن چکی ہے، آج ہر ادارہ، ہر محکمہ، ہر ڈیپارٹمنٹ، ہر ملازم، ہر ٹھیکیدار، یہاں تک کہ ہر دکاندار کرپشن میں ملوث ہے۔ ہمارے کئی فکشن نگاروں نے اپنے افسانوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ جہاں اس موضوع پر ہمارے فکشن نگار غلام فرید کاٹھیا نے قلم اٹھایا ہے وہیں ان کے ہم عصر افسانہ نگار شاہد رضوان نے بھی اس موضوع کو اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔مگر غلام فرید کاٹھیا نے اس کو اور بھی زیادہ مؤثر اور خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔اس نے بتایا ہے کہ کرپشن کرنے والے کہاں اور کیسے کیسے کرپشن کرتے ہیں۔اور ان کے ہاتھ

کتنے لمبے ہوتے ہیں۔ جو کوئی انکے ٹھگے اور غلط رویے کی نشاندہی کرے تو یہ لوگ پولیس کے ذریعے انہیں عمر بھر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بجھوا دیتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا ایک ایسے افسانہ نگار ہیں کہ جنہوں نے مزدوروں، کسانوں، ہاریوں، چھوٹے مزارعوں اور دیگر پس ماندہ طبقات کو درپیش مشکلات کا ذکر اپنے افسانوں میں بڑی ہی دردمندی سے کیا ہے۔ آپ نے غریبوں کے مسائل اور ان کی زندگیوں میں پھیلے رشوت و کرپشن کے جال پر سے کھل کر پردہ اٹھایا ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانے ''دیوانے لوگ'' میں پولیس وارڈن کے ایک غریب بندے سے رشوت لینے کے واقعے کو یوں بیان کیا ہے، عابو جو جیل میں موجود ایک قیدی ہے، اس کے جیل کے ساتھی جانو کو بہت شدید بخار ہو جاتا ہے، بوڑھا گھر والوں کی یاد میں پریشان روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے، اسے علاج کی سخت ضرورت ہوتی ہے، مگر جیل ہیڈ وارڈن اسے ہسپتال نہیں جانے دیتا، کیوں کہ اسے رشوت درکار ہوتی ہے۔ صحت اور علاج کی سہولیات تو ہر شہری کا بنیادی حق ہے، چاہے وہ آزاد ہو یا جیل میں موجود کوئی قیدی۔ مگر ہمارے ہاں جیلوں میں بھی کرپشن کا سکہ چلتا ہے۔ جس کے باعث بغیر رشوت بیماروں کو علاج کی سہولیات بھی دستیاب نہیں۔ رشوت جیسی لعنت آج پورے ملک ہی میں پھیل چکی ہیں، کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، عام ملازم ہو یا کسی بڑے سرکاری عہدے کا مالک۔ ہر کوئی اس کی پکڑ میں نظر آتا ہے۔ ''دیوانے لوگ'' میں عابو کو بھی جب بیمار جانو کو ہسپتال لے جانے کی اجازت نہیں ملتی تو اسے بے بسی اور فکرمندی کے عالم میں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا، اور وہ اپنی بات منوانے کے لیے ہیڈ وارڈن کو چند پیسے اور سیگریٹ دینے کی کوشش کرتا ہے۔

> ''ہیڈ وارڈن نے ہاتھ بڑھا کر پوٹلی لے لی اور ہاتھ سے دبا کر پوٹلی کے
> اندر کے مال کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔۔۔ ہیڈ وارڈرن جیسے مطمئن
> ہو گیا۔ یہ لو چابیاں۔۔۔ بڈھے کو کل ہسپتال لے جانا''(2)

آج ہمارے معاشرے میں حق تلفی اور رشوت خوری عروج پر ہے۔ غریبوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ان پر ظلم عام ہو چکا ہے۔ بیچارہ عام آدمی انصاف کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے۔ رشوت لینا اور دینا بہت معمولی سی بات بن گئی ہے۔ حدیث نبوی کے مفہوم کے مطابق ''رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنم کے نچلے گڑھے میں ہوں گے''۔ مگر عوام اپنی مذہبی روایات سے بے پرواہ زندگی گزار رہے ہیں۔ بلکہ لوگ تو اس گناہ کو تحفے کا نام دیتے نظر آتے ہیں۔ آج سرکاری ادارے ہوں یا کہ پرائیوٹ، ہر طرف ہی کرپشن کا بازار گرم ہے۔ کسی سے کوئی کام کروانا ہو تو لوگ

خالی منت سماجت سے کام نہیں کرتے بلکہ بھاری رقوم کا مطالبہ کرتے ہیں جو رشوت کے طور پر ادا کرنا پڑتی ہیں۔ یہ کرپشن ہی ہے جس کی وجہ سے ملک بدحالی کے راستوں پر گامزن ہے۔ کرپشن سے آج منافقت، رشوت خوری، بدعنوانی، انصاف میں تاخیر، دوسروں کے حقوق کی ڈاکہ زنی اور دیگر لاتعداد برائیاں جنم لے چکی ہیں۔ سماج سے صالح روایات، نیکی، اعلیٰ اخلاقی اقدار، شائستگی اور خوش اخلاقی کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس کرپشن کی وجہ سے نہ جانے کتنے ہی لوگوں اور بے شمار گھرانوں اور کی زندگیاں برباد ہو چکی ہیں۔ آج کوئی بھی طاقت ور اپنے روپے پیسے کے زور پر کسی کے بھی حق پر آسانی سے ڈاکہ ڈال کر مالی ہیر پھیر، دھوکہ دہی، جھوٹ اور غبن کے ذریعے اپنے بینک بیلنس اور اثاثہ جات کی فہرستیں بڑھا سکتا ہے۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کیوں کہ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک شعبہ رشوت کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ چھوٹے چپراسی سے لے کر بڑے سے بڑا جج آج پیسے کی وجہ سے بک رہا ہے۔

آج ہمارے ملک میں کرپشن اور رشوت خوری جہاں زندگی کے تمام ہی شعبوں میں ناسور کی طرح پھیل چکی ہے، وہیں پولیس کا شعبہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ ملک کے محافظ لوگوں کی جانوں کے لٹیرے اور دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ کالی بھیڑوں کے روپ میں یہ لوگ غریبوں کے خون پسینے اور حق حلال کی کمائی بٹور رہے ہیں۔ امیر، درمیانے اور غریب طبقے کے افراد کے لیے اے، بی اور سی کلاس جیلوں کے الگ الگ انتظام سے طبقاتی کشمکش کو ہوا مل رہی ہے۔

ہمارا پیارا ملک پاکستان جو اتنی قربانیوں کے نتیجے میں حاصل کیا گیا، جس کے لیے لوگوں نے اپنی جانوں کے نذرانے دیئے، ماؤں کی گودیں اجڑ گئیں، بیویوں سے ان کے شوہر الگ ہو گئے، نوجوانوں کو قتل کیا گیا، عورتوں کی عزتیں لٹیں، جس وطن اور آزادی کے لیے ہجرت کے دوران تکلیف اٹھانی پڑیں آج اس وطن میں بظاہر تو ہم آزاد ہیں مگر ذہنی طور پر آج بھی ہم غلام ہیں۔ کیونکہ ہم غلاموں کی طرح رشوت دینے اور لینے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے پیارے ملک میں سرکاری اہلکاروں کو دونوں ہاتھوں سے رشوت سمیٹنے کی آزادی ہے۔ یہ سرکاری عہدیدار جب اور جس سے چاہیں جتنی مرضی رشوت کا مطالبہ کر لیتے ہیں۔ جو کے غریبوں کو مجبوراً ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی غریب ان کے اس رویے کی شکایت کرے تو اس کی بات سنی نہیں جاتی، بلکہ انصاف دلانے والے خود ایسے لوگوں کے ساتھ مل جاتے ہیں اور لوگوں کا خون چوسنے لگتے ہیں۔ قانون کے رکھوالے جب رشوت لیتے ہوئے یا غلط کاموں میں ملوث پائے جائیں تو وہ سب سے پہلے قانون ہی کو بدل دیتے ہیں، اور انہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ اگر چھوٹا آدمی چوری یا کوئی جرم نہ بھی کرے تو اسے جھوٹے

مقدمے کے نتیجے میں ساری عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑتی ہے، جبکہ ملکی املاک قومی خزانہ لوٹنے والوں کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ان کے لیے انصاف کا کوئی ادارہ، کوئی قانون حرکت میں نہیں آتا کیونکہ وہ روپے پیسے کے زور پر ہر کسی کے ضمیر کو خریدنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ شاہد رضوان نے رشوت خوری اور لوٹ مار کے نتیجے میں ملک کا نقصان کرنے والوں پر طنزیہ انداز سے قلم اٹھایا ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانے ''آزادی'' کے ذریعے ملک کو لوٹنے والوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ ملک اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا، اور کیسیا س آزاد ملک میں ہر کوئی اپنے آپ کو قانون سے ماورا سمجھ کر آزادی سے رشوت خوری اور لوٹ مار کر رہا ہے، افسانہ نگار شاہد رضوان نے بظاہر پاگل نظر آنے والی نوراں کے کردار کے ذریعے ملک کے بڑے ہی سنگین مسائل سے پردہ اٹھایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہیکہ کہیں نہ کہیں اس رشوت کی وجہ سے بڑے لٹیرے آزاد گھوم رہے ہیں۔

''سرکاری اہلکاروں کو دونوں ہاتھوں سے رشوت لینے کی آزادی۔۔۔
ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔ قانون بنانے والے جب خود قانون کے شکنجے میں
پھنسنے لگیں تو اسے بدلنے یا اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کی آزادی۔
ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔ غریب آدمی اگر چھوٹا سا جرم بھی کرے تو اس کی ساری
عمر جیل کی کال کوٹھریوں میں گزر جائے۔ جبکہ بڑے بڑے ''مگرمچھوں''
کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے۔"(3)

رشوت کسی بھی معاشرے میں اس وقت پروان چڑھتی ہے جب وہاں عدل و انصاف کا نظام کمزور ہو جاتا ہے۔ انصاف کے خاتمے سے عوام میں خود غرضی، مفاد پرستی اور لالچ جیسی برائیاں پیدا ہوتی ہیں، لوگ خود ہی دوسروں کے حقوق پر قابض ہونے لگتے ہیں۔ اس سب سے ملک اور خصوصاً پسماندہ طبقے کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

نچلے طبقے کو اگر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کروانا ہو تو انہیں بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیچارے غریبوں کی بات کو تو نہ ہی کوئی دھیان سے سنتا ہے اور نہ ہی ملازمت وغیرہ کے معاملات میں ان کا ہنر دیکھا جاتا ہے۔ چاہے زندگی کا کوئی بھی شعبہ کیوں نہ ہو، غریب کو ہر جگہ ہی ذلیل و خوار کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی عام آدمی زمین کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا خریدتا ہے تو اسے تو مصیبت پڑ جاتی ہے۔ اسے پٹواریوں، کلرکوں اور تحصیلداروں کے ہاتھوں جائیداد کے کاغذات بنوانے کے لیے اسے بار بار رسوا ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی غریب کو گھریا کام کی جگہ بجلی و گیس کے بل کی درستگی

کروانا ہو، عدالتی فیصلے کی نقل لینی ہو، یا پھر کوئی بھی کام کروانا ہو تو اسے ہر حال میں رشوت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے لوگ اپنا کام جلدی کروانے کے لیے رشوت لیتے اور دیتے بھی ہیں۔

رشوت خوری نے ہمارے معاشرے میں بہت سی برائیوں مثلاً بدامنی، بداعتمادی، سنگ دلی، غنڈہ گردی، انتشار، خود غرضی، دہشت گردی، حرص، مفاد پرستی اور طمع ولالچ وغیرہ نے جنم لے لیا ہے۔ رشوت کے نتیجے میں غریب بندے کی زندگی کی مشکلات میں بہت اضافہ ہو گیا۔ آج اگر نچلے یا درمیانے طبقے کا کوئی فرد اپنے معاشی حالات کی تنگی کے باوجود بھی پڑھتا لکھتا اور تعلیم حاصل کرتا ہے، تو اس کے خاندان کی اسے بہت سی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں، کیوں کہ اس بچی یا بچے کی تعلیم کے لیے بوڑھے ماں باپ نے بہت تنگی والے حالات دیکھے ہوتے ہیں، صرف اس بچے اور خاندان کے اچھے مستقبل کی خاطر اسکے باقی تمام بہن بھائیوں کی ضروریات کو پس پشت ڈالا ہوتا ہے، نہ جانے کتنے قرضوں کا بوجھ کندھوں پر ہونے کے باوجود بھی کمیٹیاں ڈال کر اور پیسے جوڑ جوڑ کر اس کی فیسیں ادا کی ہوتی ہیں۔ اکثر سادہ لوح ماں باپ خود تو پڑھے لکھے نہیں ہوتے تاہم ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بڑے بچے کو پڑھا لکھا دیں گے تو وہ پڑھ لکھ کر اچھا افسر یا کسی بہترین سرکاری عہدے پر فائز ہو جائے گا، یوں وہ گھر اور باقی بہن بھائیوں کی پڑھائی اور تعلیم کی ذمہ داریاں بھی اپنے کندھوں پر اٹھا لے گا۔

ایسے غریب والدین جو اپنے بچوں پر محنت کرتے ہیں اکثر ان کی اولاد بھی محنتی و ذہین نکلتی ہے، کیونکہ انہیں اپنے والدین کی قربانیوں اور جذبات کا بھرپور احساس ہوتا ہے، وہ اپنے اور اپنے خاندان کے معاشی حالات بدلنے کی خاطر دن رات محنت سے پڑھائی کرتے ہیں۔ ان میں کچھ کرنے کی لگن اور کچھ بننے کی جستجو ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر اپنی جماعت میں بھی لائق طالب علموں کی فہرست میں صفحہ اول پر ہوتے ہیں۔ اور آخر کار اعلی نمبروں سے کامیابی کے ساتھ اپنی ڈگری مکمل کرتے ہیں۔ مگر جب قوم کے یہ یہ ہونہار معمار ملازمت کے لیے کسی سرکاری ادارے میں درخواست جمع کرواتے ہیں تو میرٹ میں اول لوگوں کی فہرست میں ہونے کے باوجود انہیں ملازمت نہیں ملتی۔ کیونکہ ملازمت کے حصول کے لیے آجکل بہت ساری رشوت یا کسی بڑے آدمی کی سفارش ہونا بہت ضروری بن گیا ہے۔ جو کہ غریبوں کے پاس نہیں ہوتی۔

اسی طرح پرائیوٹ ادارے میں درخواست جمع کرواتے ہیں تو ان کی درخواستوں پر اول تو غور ہی نہیں کیا جاتا اور انہیں یہ کہہ کر واپس لوٹا دیا جاتا ہے کہ "ابھی ہمیں نئے ملازمین کی ضرورت نہیں، اگر ضرورت ہوگی تو آپ کو کال کر لیں گے" اور وہ کال کبھی بھی نہیں آتی کیونکہ وہ اپنے ہی

ادارے کے کسی رشتے دار یا جاننے والے کو ملازمت پر پہلے ہی سے بھرتی کر چکے ہوتے ہیں۔ یوں طالب علم بیچارہ نوکری کے انتظار میں ذلیل و خوار ہوتا رہتا ہے۔

رشوت ایک ایسی لعنت ہے کہ جس کے نتیجے میں بے شمار گھرانوں کی خوشیاں، سکون اور اطمینان چھن جاتے ہیں، لوگوں کے مستقبل داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ نفرت، بدامنی، انتشار، حرص و لالچ اور خود اعتمادی میں کمی واقعہ ہوتی ہے۔ رشوت کے باعث غریبوں اور متوسط طبقے کو بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں رشوت کے بارے میں بہت کھل کر بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ کس طرح امیر طبقہ غریبوں کا سماجی و معاشی استحصال کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانے میں رشوت خوری اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی کی ایک ایسی ہی کہانی بیان کی ہے۔ جس میں نچلے طبقے کے ایک ایسے غریب طالب علم کا ذکر کیا گیا ہے جو دن رات محنت کر کے اپنی جماعت میں اول کارکردگی دیکھا تا ہے اور اس اعتماد سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں درخواستیں دیتا ہے کہ وہ منتخب ہو جائے گا، مگر اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس معاشرے میں اچھی نوکری کے ساتھ اچھی سفارش اور بھاری رشوت کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ افسانہ نگار غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے میں اس کا اظہار کیا ہے:

> ''پھر بھی ماں نے ضد کر کے بھیج ہی دیا۔ اور وہ جگہ میرے بیچ کے ایک ساتھی سے پر کر لی گئی جو پوزیشن کے لحاظ سے مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ پر وہ مجھ سے آگے اس لیے تھا کہ وہ ایک بڑے سرکاری عہدے دار کا بیٹا تھا۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں واپس لوٹا تو ماں اور باپ کو بہن اور بھائی کو یہی بتایا کہ ملازمت کی کال آئے گی۔ میرے ذہن پر ناانصافی کا بہت بڑا دھچکا تھا۔ میرا تمام اعتماد ختم ہو گیا۔ اپنے آپ پر، اپنی محنت وقابلیت پر۔ تمام اعتماد خاک میں مل گیا۔'' (4)

غریبوں کا استحصال ہمارے معاشرے میں ہر طرف عام ہو چکا ہے۔ جسے دیکھو حق تلفی، ڈاکہ زنی، بدعنوانی اور غنڈہ گردی کے ذریعے مظلوموں اور بیچاروں کی آہیں سمیٹ رہا ہے۔ آج ہر سو ظلم کا بازار گرم ہے۔ روپے پیسے والا اپنی دولت کے بل بوتے پر کسی کو بھی کبھی بھی خرید سکتا ہے، ضمیر فروشوں کی منڈی لگی ہوئی ہے۔ چالاکی و مکاری اور غبن عروج پر ہے۔ امیر طبقہ غریبوں پر سکون سے جینا تنگ کر رہا ہے۔ لوگ پیسوں کے لالچ کی خاطر غیر تو دور کی بات اپنے سگے اور پیارے رشتوں تک کو معاف نہیں کرتے۔ دوسروں کی جائیدادیں ہڑپ کرنے کی خاطر انہیں قتل تک کر دیا جاتا ہے۔

اس سب میں طاقتور کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کسی غریب کی موت پر کوئی فوری عدالتی فیصلہ نہیں سنایا جاتا، بلکہ کسی کے بھی قتل کو طبعی موت کا رنگ دے کر معاملے کو چھپا لیا جاتا ہے۔ دولت مند لوگ عیاشیاں کرتے پھرتے ہیں، ان کے جرم کے خلاف کوئی قانون حرکت میں نہیں آتا، چھوٹا چور چوری کرے تو اسے فورا پکڑ لیا جاتا ہے جبکہ بڑے ڈاکوں کے خلاف کوئی بھی ایکشن لینے والا نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں آج غریب انصاف کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے۔ جبکہ طاقتور دوسروں کے حقوق پر قبضہ کر کے عیاشی سے زندگی کے مزے لے رہا ہے۔ آج شہروں کی طرح دیہاتوں کے رہنے والے بھی اپنے سے اعلی طبقوں کے ظلم وستم کو سہنے پر مجبور ہیں۔ دیہاتوں کے نمبردار، چوہدری، نواب اور وڈیرے کمزوروں کا استحصال کر رہے ہیں۔ غریب کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ وہ اپنے خلاف ہونے والے ظلم پر فقط دہائیاں ہی دے سکتا ہے، کیونکہ انصاف دلانے والے منصف خود ظالم بنے بیٹھے ہیں۔

غریبوں کے حقوق اور ظالموں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے لوگوں کی آج کے سماج کو بہت شدت سے ضرورت ہے۔ اگرچہ درد انسانیت رکھنے والے لوگوں کی تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے تاہم اب بھی بہت سے افراد ایسے موجود ہیں، جو بے لوث اور بغیر کسی غرض کے مجبوروں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ غریبوں کی آواز بننے والے ایسے ہی افسانہ نگاروں میں ایک نام شاہد رضوان کا بھی ہے۔ جنہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے غریبوں پر ہونے والے جنسی وجسمانی بلکہ ذہنی اور روحانی تشدد پر بھی بڑی دردمندی سے قلم اٹھایا ہے۔ شاہد رضوان نے اپنے افسانوں کے ذریعے ظلم کی چکی میں پستے ہوئے عوام کے حقوق کی بات کی ہے۔

غریبوں پر ہونے والے جبر کے بارے میں آپ کے افسانے " آزادی" میں انسان کے اندر کے کرب کو واضح کیا گیا ہے۔ اتنی بڑی بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا یہ وطن آج اس حال میں ہے کہ یہاں چور، ڈاکو، کرپشن مافیا، ظالم و جابر اور دوسروں کے حقوق چھیننے والوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ سرکاری اہلکاروں کو ملک اور عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی آزادی ہے۔ قانون بنانے والے جب خود قانون کے شکنجے میں پھنسنے لگیں تو اسے بدلنے یا اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کی آزادی حاصل ہے۔ غریب آدمی اگر چھوٹا سا جرم بھی کر لے تو اسے اپنی ساری عمر جیل کی کال کوٹھریوں میں گزارنی پڑتی ہے، جبکہ بڑے بڑے مگرمچھوں کو ہر غلط کام کی کھلی آزادی ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے اس افسانے میں علاقے کے چوہدری اور ایک پولیس افسر کے ہاتھوں مظلوم

دیہاتی پر جبر کا ذکر کیا ہے۔گاؤں کا ظالم چوہدری خود اپنے ہی یتیم بھتیجے کو اغواء کروالیتا ہے، تاکہ اسے مار کر اس کی تمام جائیداد پر قبضہ کرلے۔اس سارے منصوبے کی تکمیل اور اپنے اوپر لگنے والے کسی بھی الزام سے بچنے کے لئے وہ ایک سازش تیار کرتا ہے اور اغواہ کا تمام الزام ایک غریب دیہاتی پر ڈال دیتا ہے۔جس کے نتیجے میں پولیس بنا کسی ثبوت کے چند پیسوں کے لالچ میں بچاری غریب دیہاتن کے اکلوتے بیٹے کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔اس پر تشدد اور اسے بری طرح زدوکوب کرتی ہے۔اس سب کے سبب بوڑھی ماں اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے تفتیش کرنے والے آفیسر کی ماں نوراں کے پاس آتی ہے اور اس سے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرتی ہے کہ میرا بیٹا بے قصور ہے۔اسے چھوڑ دیا جائے۔مگر اس بیچاری کو کیا خبر کہ اس ملک میں تمام ڈاکو، ملک کے لٹیرے غریبوں کی جان کے دشمن بنے ان کا استحصال کر رہے ہیں۔آج امراء، سرمایہ داروں، چوہدریوں اور وڈیروں کی جانب سے متوسط اور پسماندہ طبقے پر بہت ظلم کیا جا رہا ہے، اگرچہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں نے بے بسوں اور مجبوروں پر ہونے والے ان مظالم پر قلم اٹھایا ہے۔تاہم شاہد رضوان ایک ایسا افسانہ نگار ہے کہ جس نے اپنے افسانوں میں ان موضوعات کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔نوراں کے پاس غریب عورت کے فریاد لانے کو شاہد رضوان نے یوں بیان کیا ہے:

> ''ایک دن ایک غریب عورت نوراں کے پاس فریاد لے کر آئی، اور کہا میرا بیٹا بے قصور ہے۔اس نے کسی کو اغواء نہیں کیا۔اغواء تو "پنڈ" کے چوہدری نے خود اپنے یتیم بھتیجے کو کیا ہے۔تاکہ اس معصوم کو قتل کر کے اس کے حصے کی جائیداد ہڑپ کر سکے۔لیکن میرے بے قصور بچے کو سازش سے پھنسایا گیا۔پولیس نے مار مار کر میرے بیٹے کا حشر نشر کر دیا۔تمہارا بیٹا تفتیش کر رہا ہے۔میری مدد کرو! چند روپیوں کی خاطر میرے بے گناہ بیٹے کو پھنسا کر تم لوگوں کو کیا ملے گا۔خدا کے واسطے میری مدد کرو۔بوڑھی عورت نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔"(5)

مزدور طبقہ کسی بھی معاشرے کی معیشت میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے، سماج میں اس کی اہمیت ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتی ہے۔مگر افسوس کہ سردی و گرمی میں دن رات فیکٹریوں ،ملوں، کارخانوں اور بھٹوں پر کام کرنے والے اس طبقے کو ہمارے معاشرے میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔غربت سے لاچار ان افراد کی زندگی سے، ان کی خوشی یا غمی سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔سرمایہ داران کے ساتھ کھانا پینا، ملنا جلنا تو بہت دور، وہ تو ان سے بات بھی کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

یہ سرمایہ دار، وڈیرے اور جاگیردار غریبوں پر طرح طرح سے ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ بیچارے غریبوں کی محنت و مشقت کے عوض انہیں بہت کم اجرت دی جاتی ہے۔ ان سے کم تنخواہ کے بدلے زیادہ وقت جانوروں کی طرح اضافی کام کروایا جاتا ہے۔ اگر یہ تنخواہ بڑھانے کی درخواست کریں تو انہیں کام سے نکال دینے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ ان مزدوروں اور ان کے خاندان کے ساتھ غلط رویہ برتا جاتا ہے۔ ان کی عزت و آبرو کے تقدس کو پامال کیا جاتا ہے۔ بات بات پر انہیں سب کے سامنے ذلیل کیا جاتا ہے۔ اگر یہ، ان کے خاندان میں سے کوئی بیمار پڑ جائے، یا کسی کی وفات ہو جائے تو انہیں چھٹی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، اگر یہ کسی مجبوری کے تحت چھٹی کر بھی لیں تو اول تو انہیں بہت ذلیل کیا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ان کی تنخواہ سے اس ناغے کی رقم بھی کاٹ لی جاتی ہے۔ ہمارے اکثر اوقات دیہاتوں میں وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوابوں کا راج ہوتا ہے۔ جو اپنے پاس کام کرنے والے غریب مزدوروں، کسانوں، ہاریوں اور دیگر پسماندہ طبقے کے افراد پر معاشی جبر کرتے ہیں۔ وہ ان سے جبراً محنت و مشقت کرواتے ہیں، انہیں صرف اتنی اجرت دیتے ہیں جس سے وہ مشکل سے فقط دو وقت کی روٹی کھاسکیں۔ یوں یہ ظالم لوگ ان کی محنت و حق حلال کی کمائی پر ڈاکہ ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ملازمین سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے ہیں۔ ان پر رعب جماتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات تو انہیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے ناجائز کام بھی سرانجام دیں۔ یہ ان غریبوں کو کام سے نکالنے کی دھمکیاں، یا تھوڑے بہت پیسوں کا لالچ دے کر ان سے اپنے مخالفین کا قتل کروا کر بعد میں انہیں ہی پھنسا دیتے ہیں۔ بلکہ ان سرمایہ داروں کے غریبوں پر ظلم کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اگر انہوں نے اپنے کسی بھی ناپسندیدہ بندے کو اپنی راہ سے ہٹانا ہو تو یہ اپنی طاقت اور پیسے کے زور پر ان غریبوں پر جھوٹے الزامات لگا کر انہیں جیل بھجوا دیتے ہیں۔ ان بیچاروں کے حالات اتنے اچھے نہیں ہوتے کہ ان کے اہل خانہ میں سے کوئی ان کی ضمانت کروا سکے، یا جیل میں ان کی خوراک کے لیے گھر سے کچھ پکا کر لاسکیں۔

آج غریبوں پر ہونے والا ظلم بہت عام ہو چکا ہے، افسانہ نگاروں نے غریبوں کے استحصال پر بڑی دردمندی سے قلم اٹھایا ہے، ان افسانہ نگاروں میں سے ایک بڑا ہی اہم نام غلام فرید کاٹھیا کا بھی ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں دیہات کے پستے ہوئے اور کمزور طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے اکثر افسانے گاؤں کے معاشرتی حالات، لوگوں کے رہن سہن، غریبوں کی غربت، وڈیروں، زمینداروں، نمبرداروں اور چودھریوں کے غریبوں پر مظالم، پولیس کا

ظلم و ستم، پنچایتوں کے نظام، زمینوں کے مسائل، دیہاتی لوگوں کی سادگی، اور مجبوروں کی مجبوریوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے ہیں۔ غلام فرید کے بیشتر افسانے حقیقت نگاری کا عکس دکھائی دیتے ہیں۔

''سونے کی چوری'' محنت کش لوہار عبدالکریم کی کہانی ہے۔ عبدالکریم اپنے کام کا ماہر ہوتا ہے، اس کے بنائے ہوئے اوزار، زرعی آلات کسی، کھرپے پھالے، درانتیاں، اور دیگر گھر کے استعمال کی چیزیں دیہات بھر میں مشہور تھی۔ عبدالکریم چاک و چوبند، اور لمبے، اونچے قد کا توانا وخوبرو نوجوان تھا۔ اس کی ایمانداری اور کام سے لگن دیہات بھر میں مشہور تھی۔ سہاوے کے ملک محمد دین کو اپنے گھریلو استعمال کی چیزوں کے علاوہ کھیتوں کے لئے بھی آلات کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، جنہیں وہ صرف عبدالکریم ہی سے بنواتا۔ عبدالکریم اس کا کام ہمیشہ بڑی محنت اور لگن سے کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک محمد دین نے اس کی ایمانداری سے متاثر ہوکر اسے بیٹوں کی طرح چاہنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھار تو ملک محمد دین اسے اپنے گھر بھی بلوا لیتا اور گھر ہی میں کھیتوں کے لیے زرعی آلات کی تیاری بھی کرواتا۔ ملک محمد دین کی صاحبزادی رحمتے اس چاک و چوبند اور توانا نوجوان عبدالکریم کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے، مگر عبدالکریم نگاہیں جھکائے، ہمیشہ دل سے اس کی عزت کرتا ہے۔ عبدالکریم تھا تو ایک مزدور ہی۔ وہ اپنی حیثیت اور مرتبے سے اچھی طرح واقف تھا اسی لئے وہ خود کو ان باتوں سے پرے رکھنا چاہتا تھا۔ رحمتے کے بڑے بھائی اسماعیل کو جب اپنی بہن رحمتے کی عبدالکریم کے لیے پسندیدگی کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنے خانداں کی عزت بچانے کی غرض سے عبدالکریم پر بغیر کسی گواہ اور ثبوت کے چوری کا سنگین الزام دھر دیتا ہے۔ پولیس کسی تفتیشی کارروائی کے بغیر ہی چودھری سے رشوت کے پیسے وصول کر کے کر عبدالکریم کو ملزم سے مجرم بنا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیتی ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانے کے ذریعے سرمایہ داروں کی طرف سے غریبوں پر ہونے والے ظلم و جبر کو بیان کیا ہے۔

> ''عبدالکریم نے سہاوے کے ملک محمد دین کے گھر سے چوری کی ہے۔ ملک محمد دین کے بڑے بیٹے ملک اسماعیل نے تو اسے سامان سمیت موقع پر ہی پکڑ لیا تھا۔ طاقتور جو بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ بہت بڑی چوری ہزاروں روپے کا سونا ایک گٹھڑی میں لے کر بھاگ رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سونے کی گٹھڑی تو ملکوں کے باڑے سے برآمد ہو گئی جہاں عبدالکریم رات کے وقت سوتا تھا۔''(6)

زلزلے سے قبل لوگ اپنے اپنے اشغال میں مگن ہوتے ہیں۔ گلیوں بازاروں میں

رونقوں کا سا سماں ہوتا ہے، ہسپتالوں، تھانوں، عدالتوں اور دفتروں میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔۔۔ بے شمار معصوم علم کی پیاس بجھانے کی خاطر تعلیمی درسگاہوں کی چھتوں کے نیچے، آنے والے خوفناک لمحوں سے بے پروا۔۔۔ جب کہ دیر سے نیند کی وادیوں میں اترنے والوں کی تو ابھی تک صبح ہی نہیں ہوئی ہوتی۔ مگر اچانک ہی زمین میں حرکت سی پیدا ہوتی ہے۔ قیامت خیز جھٹکوں سے ہر شے تہس نہس ہو جاتی ہے۔ شہروں کے شہر، اور بستیوں کی بستیاں کھنڈرات اور گورستان کا سا سماں پیش کرنے لگتے ہیں۔ بڑی بڑی فلک بوس عمارتیں ہوں یا کہ خوبصورت ہوٹل زلزلے کی تباہ کاریوں سے ہر ایک شے برابر متاثر ہوتی ہے۔ جب زلزلے جیسی قدرتی آفت آتی ہے تو ہر چیز دھڑم سے ڈھے کر زمین میں دھنس جاتی ہے۔ جہاں چند لمحے قبل خوشیاں، بہاریں، رونقیں ہوتیں، زندگیاں ہنستی مسکراتی، چہروں اور آنکھوں میں چمک ہوتی ہے۔ وہاں چند ہی لمحوں میں لاشوں، تباہی اور پریشانیوں کا ڈیرہ جم جاتا ہے۔ فضا میں چیخ و پکار، گاڑیوں اور عمارتوں کے شیشے ٹوٹنے کا شور، ہر شے پر خوف طاری، ہر آنکھ اشک زدہ اور ہر زبان ماتم کناں دکھائی دیتی ہے۔ یہ زلزلے لوگوں کے ہنستے مسکراتے خاندانوں کو اجاڑ دیتے ہیں۔ غریب اور دیہاتی لوگ اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس سہولیات کی کمی ہوتی ہے۔ زلزلے میں ملبے تلے دبے لوگوں کو باہر نکالنے کے لئے مشینری کی کمی، کفن دفن کا انتظام، اور قبروں کی کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ زلزلے چند لمحوں میں لوگوں کی زندگیاں، ان کے پیارے، خوشیاں اور سکون چھین لیتے ہیں۔ یہ زلزلے دنیا میں کبھی بھی کہیں بھی آ سکتے ہیں۔ ان کا کسی خطے، کسی علاقے یا بستی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ ہر شے کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں 2005 میں پاکستانی تاریخ کا بدترین اور دنیا کا چوتھا بڑا زلزلہ آیا۔ جس کے نتیجے میں 75 ہزار سے زائد افراد ابدی نیند سو گئے۔ ملک میں سب سے زیادہ زلزلہ صوبہ خیبر پختونخوا اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں ریکارڈ کیا گیا جس کی وجہ سے خیبر پختونخوا میں 73 ہزار 338 اور کشمیر میں 1360 اموات ریکارڈ ہوئیں۔ اس زلزلے کی وجہ سے مجموعی طور پر 6 لاکھ کے قریب مکانات 35 لاکھ آبادی اور 30 ہزار مربع کلومیٹر کا علاقہ متاثر ہوا۔ جو کہ بہت بڑا نقصان تھا۔ ایک سروے کے مطابق اس زلزلے سے سب سے زیادہ عمارتیں بالاکوٹ اور مظفر آباد میں تباہ ہوئیں۔ اس کے علاوہ ایبٹ آباد، راولاکوٹ، اسلام آباد، اور ناران کاغان بھی زلزلے کی تباہ کاریوں کی زد میں آئے۔

زلزلے کے نتیجے میں بہت سی تباہ کاریاں جنم لیتی ہیں۔ لوگ اپنی جانیں گنوا بیٹھتے ہیں،

گھر، عمارتیں، بستیاں اور شہر تہس نہس ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ غرض زلزلے جیسی قدرتی آفت کے نتیجے میں قیامت خیزیوں کے انمٹ نقوش اور غریبوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان میں آنے والے زلزلوں کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں، اور جسمانی و مالی نقصانات کے حوالے سے جہاں دیگر کئیں افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے، وہیں جدید اردو افسانے میں ابھرتا ایک نام شاہد رضوان کا بھی ہے، جنہوں نے اپنے افسانے " کمبل" کے ذریعے زلزلے کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ کا یہ افسانہ قدرتی آفت زلزلے کی تباہ کاریوں، لوگوں کی بے بسی اور کرپشن مافیا کیغریبوں کے لئے صدقہ وخیرات کے سامان سے چوری چکاری کی داستانیں بیان کرتا ہے۔ شاہد رضوان نے اس افسانے میں چشم کشا انداز میں زلزلے سے قبل اور زلزلہ آنے کے بعد کے حالات کو بیان کیا ہے۔ زلزلے سے پہلے کے حالات بیان کرتے ہوئے شاہد رضوان لکھتے ہیں کہ اس آفت کے آنے سے پہلے زندگی پرسکون تھی، ہر طرف چہل پہل تھی مگر اچانک زمین میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اور اس نے زمین کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں۔ گھر اور مکان ہر شے تباہ ہو گئی۔ ہر سو چیخ و پکار کا عالم دکھائی دینے لگا، لوگوں کو ملبے سے نکالنے کے لیے مشینری نہ ہونے کے برابر تھی۔ انسانی لاشیں کئی روز تک ملبے تلے دبی رہنے سے تعفن اور بد بو پیدا کرنے لگی۔ زلزلے کے نتیجے میں زندگیاں اجڑ گئیں۔ لاشوں کو دفنانے کے لیے کفن دفن کا بندوبست نہ ہو سکا، قبروں کی کھدائی کے لیے اوزار نہ تھے۔ جانے کتنے ہی دن لاشے بے گور و کفن جانوروں کی خوراک بنتے رہے۔ لوگوں میں بیماری اور معذوری پیدا ہونے لگی۔ سردیوں کے موسم میں خوراک اور ادویات کی شدید قلت سے لوگ مرنے لگے۔ لوگوں کے پاس پہننے کے لئے لباس اور ٹھنڈ سے بچنے کے لیے گرم کپڑوں کی شدید کمی واقع ہو گئی تھی۔

افسانہ نگار کے افسانے سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی زلزلے جیسی قدرتی آفت نازل ہوتی ہے تو غریبوں کی زندگیاں کیسے بے بسی اور بے چارگی کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دیہاتوں کے متاثرین میں سے بے شمار کی موت تو صرف اس لئے واقع ہو جاتی ہے کیونکہ انہیں فوری طبی امداد وقت پر نہیں پہنچی۔ ان کے لیے اچھی اور معیاری خوراک نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ ان سب حالات کی وجہ سے اموات اور بیماریوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اگر چہ ان قدرتی آفات سے بچنا ممکن نہیں تاہم حکومت اس کی شدت میں کمی لانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر دیہاتوں میں بھی شہروں

کی طرح کھانے پینے کا سامان، اچھی اور معیاری صحت وعلاج کی سہولیات، لباس اور رہائش کا بروقت بندوبست ہو سکے تو بہت سی آخری سانسیں لیتے لوگ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ شاہد رضوان نے اپنے افسانے ''کمبل'' میں زلزلے سے متاثر لوگوں کی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''یک بیک زمین میں ارتعاش پیدا سا ہوا۔۔۔۔ وہ قیامت خیز جھٹکے محسوس ہوئے، جن کی شدت ریکٹر سکیل 8.7 ریکارڈ کی گئی۔ یہ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے خطے کی تاریخ کا بدترین زلزلہ تھا۔ ایک ایسی آفت جس نے پورے ملک کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ بالخصوص شمالی علاقوں کو۔۔۔۔کوئی شہر یا بستی ایسی نہ تھی جہاں اس نے اپنی قیامت خیزیوں کے انمٹ نقوش نہ چھوڑے ہوں، چیخ و پکار کا عالم۔۔۔ مغموم فضا۔۔۔ ہر شے پر ہیبت سی طاری۔۔۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں۔۔ کھنڈرات ہی کھنڈرات۔۔۔بستیوں کی بستیاں شہروں کے شہر ایک ہی ان میں ملیامیٹ ہو گئے۔۔۔۔ جہاں ایک منٹ پہلے رونقیں تھیں، خوشیاں تھیں، زندگیاں مسکراتی اور چہکتی تھیں، وہاں اب انسانی لاشوں۔۔۔اور تباہی کے دل دوز مناظر پر ہر آنکھ اشکبار ہر زبان نوحہ کناں تھی۔ لوگ اپنی مدد آپ ملبے کو ہٹا ہٹا کر زندہ انسانوں یا لاشوں کو باہر نکال رہے تھے، لاکھوں انسان لقمہ اجل بنے، کوئی ان کے کفن دفن کا بندوبست نہ ہو سکا، جانور انسانی لاشوں کو کئی دنوں تک نوچتے رہے، ہر طرف تعفن پھیل گیا، جو بچ رہے، ان کے گرد بیماری نے شکنجہ کس لیا، ان کی خوراک۔۔۔ادویات۔۔۔ اور گرم کپڑوں کا مسئلہ پیدا ہوا''۔(7)

قدرتی آفات وہ واقعات کہلاتے ہیں جو انسانوں اور زندگیوں پر منفی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ قدرت کی جانب سے آنے والی آزمائشیں ہوتی ہیں جو کہ زلزلے، طوفان، سیلاب اور آتش فشاں کی صورت آتی ہیں۔ اس سے نہ صرف انسان بلکہ ماحول بھی بہت بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ انھی آفات کی وجہ سے جانی و مالی نقصان کا قوی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سیلابوں، طوفانوں، اور زلزلوں کے سبب جہاں دیگر بہت سے طبقات اور زندگی متاثر ہوتی ہے وہیں ان کی وجہ سے سب سے زیادہ غریب لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قدرتی آفات کا کبھی بھی کسی کو بھی سامنا کرنا

پر سکتا ہے کیونکہ یہ کسی بھی جگہ وقوع پذیر ہو سکتی ہیں۔قدرتی آفات کا امیروں اور غریبوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا، کیوں کہ یہ بس قدرت کا فیصلہ ہوتا ہے۔تاہم اس سے غریبوں کی زندگیاں بہت زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ان آفات کے سبب جہاں ملکی معیشت کو بہت بڑا دھچکا لگتا ہے، وہیں مالی کے ساتھ بہت سا جانی نقصان بھی ہوتا ہے۔

یہ زلزلے دنیا بھر کے مختلف ممالک کو متاثر کرتے ہیں جہاں دنیا بھر کے دیگر ممالک ان آفات کی زد میں آتے ہیں، وہیں پاکستان کو بھی ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔عالمی بینک کی رپورٹ کے مطابق یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قدرتی آفات کی وجہ سے دنیا بھر میں تیزی سے غربت پروان چڑھ رہی ہے۔پاکستان میں آزاد کشمیر وشمالی علاقہ جات سمیت، لاہور، اسلام آباد، اور پشاور وغیرہ میں زیادہ تر لوگ زلزلے جیسی خطرناک آفات سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔جس سے ہمارے ان علاقوں کے پسے ہوئے افراد غربت کا شکار ہو رہے ہیں۔یہاں جب زلزلے اور سیلاب وغیرہ آتے ہیں تو بہت سی پراپرٹیز ملبے تلے دب جاتی ہیں۔جس کی وجہ سے جانی کے ساتھ ساتھ بہت سا معاشی اور مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔اگر چہ ان آفات پر قابو پانا نہایت مشکل ہے لیکن حکومت کو اپنی احتیاطی تدابیر پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔شہروں اور بڑی عمارتوں کو ایسی جگہ آباد کرنا ضروری ہے جہاں نقصان کی کم سے کم توقع ہو۔کیونکہ ان لوگوں کو جو کہ غریب ہوتے ہیں اور زندگی بھر پیسے جوڑ جوڑ کر اپنا گھر اور تھوڑی بہت جائیداد بناتے ہیں، انہیں قدرتی آفات کی وجہ سے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔زلزلے جہاں انہیں اپنے تعمیر کردہ گھروں سے بے گھر کر دیتے ہیں اور وہیں کچھ افراد تو ملبے تلے دب کر خالق حقیقی سے جا ملتے ہیں۔اسی طرح بے شمار لوگ معذور ہو جاتے ہیں اور یوں وہ دوبارہ کبھی اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہتے۔ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کے شہر میر پور اور جہلم میں 24 ستمبر 2019ء کو فقط پچاس سیکنڈ تک ایک زلزلہ آیا جس کی شدت ریکٹر سکیل پر 5.8 ریکارڈ کی گئی تھی، اس سے بہت زیادہ مالی اور جانی نقصان ہوا خصوصاً بہت سارے لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا کیونکہ دیہاتوں میں بڑے ہسپتال تو دور کی بات چھوٹے کلینک بھی مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔کسی بھی حادثاتی صورت میں زخمی مریضوں کو ہسپتال لے جانے تک بہت سے مریض راستے میں ہی اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں جبکہ اگر شہر میں اس طرح کے واقعات ہوں تو مریضوں کے لیے فوری طور پر طبی امداد کی سہولیات موجود ہوتی ہیں۔جس کے سبب ان کے مالی نقصان کے ساتھ ساتھ جانی نقصان سے بچت ہو جاتی ہے۔

زلزلے کے نتیجے میں ہسپتالوں کی کمی اور علاج کی سہولیات کے فقدان کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ غلام فرید کاٹھیا کے ہم عصر شاہد رضوان نے بھی اس موضوع کو اپنے ہاں بڑے ہی بہترین انداز سے جگہ دی ہے تاہم غلام فرید کاٹھیا زلزلے کے نام سے مشہور اس زندگیاں نگل لینے والی آفت کو زیادہ موثر انداز میں ہمارے سامنے لائے۔ غلام فرید کے افسانے "پتھر کی گرفت"، "ویرانے کا پھول" اور میں انجینئر بنوں گا 2005" ء کے زلزلے کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ 8 اکتوبر 2005ء میں آنے والا زلزلہ جہاں بہت سے لوگوں کی ہنستی بستی زندگیوں کو اجاڑ گیا، وہیں یہ اپنے پیچھے بچ جانے والوں کی کئی ادھوری کہانیاں بھی چھوڑ گیا۔ غلام فرید نے ان درد بھری کہانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر ان کی مشکلوں اور پریشانیوں سے ہمیں آشنا کروایا۔ آپ کے افسانے بتاتے ہیں کہ دیہات کے پسماندہ طبقے پر جب قدرتی آفات نازل ہوتی ہیں تو انہیں کون کون سے مسائل سے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا افسانہ "ویرانے کا پھول" دیہاتی لوگوں کے 2005ء کے زلزلے جانی و مالی نقصان کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ کس طرح لوگوں کے تمام گھر ملبے تلے دب چکے تھے۔ کمبو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے، جس کے ماں باپ، بہن بھائی اپنے گھر کے ملبے تلے دب چکے تھے۔ اس کا تمام گاؤں گورستان میں بدل چکا تھا۔ جو کوئی اس ملبے سے بچ نکلا ان کی زبانیں بند اور نظریں پتھرا چکی تھیں۔ واحد کمبو تھا جو زندہ اور ٹھیک تھا اس نے زندوں کو جھنجھوڑا، مرنے والوں کے لاشے اٹھائے اور اپنے گھر والوں کو ملبے کے نیچے سے نکالا اور وہ کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا مگر جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا گھر بھی ملبے کے ڈھیر میں بدل چکا تھا۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے اس افسانے کے ذریعے قدرتی آفات کا شکار ہونے والوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی عکاسی کی ہے۔ افسانہ نگار نے دیہاتوں میں علاج معالجے کی کمی، ہسپتالوں کا نہ ہونا اور سہولیات کی کمی جیسے معاملات پر روشنی ڈالی ہے۔ کمبو کی بے بسی کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:-

> ''کمبو بہت سے کراہنے والوں کو ملبے سے نکالنے کے بعد اپنے گھر کے ملبے تک بھی پہنچا لیکن وہاں کوئی کراہنے والا نہیں تھا نہ کراہٹ نہ سرسراہٹ۔ ملبہ تھا اور ملبے تلے مکمل خاموشی۔ اس نے لکڑی کاٹنے والی کہاڑی سے ملبہ کاٹ کر راستہ بنانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار تھک کر پریشان حال ملبے پر بیٹھ گیا۔ بچ رہنے والے باقی لوگ بھی ہلکا پھلکا ملبہ ہٹا کر زخمیوں کو نکال لینے کے بعد اب بھاری ملبے کے ہاتھوں مجبور

ہو گئے تھے۔ زخمیوں کی چیخ و پکار سن رہے تھے مگر کیا کر سکتے تھے۔ نزدیک
کہیں ہسپتال بھی تو نہ تھا جہاں انہیں منتقل کیا جا سکتا۔''(8)

والدین کے سائے سے محروم مزدور بچوں کو زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن بچوں کے والدین حیات نہیں ہوتے انہیں اپنے لئے اپنی زندگی کی تمام جنگیں خود ہی اکیلے لڑنا پڑتی ہیں۔ غربت میں کوئی دوست، رشتہ دار، کوئی اپنا پیارا کسی کام نہیں آتا۔ جس بچے کے ماں باپ نہ ہوں، سب اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر اسے خود ہی اپنے پیٹ کو بھرنے کے لیے محنت مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں مزدوروں کی کوئی بھی عزت نہیں۔ امیروں، سرمایہ داروں اور با اختیار لوگوں کی طرف سے غریبوں کا بری طرح استحصال کیا جاتا ہے۔ کام کاج کے دوران انہیں سب کے سامنے بے عزت کیا جاتا ہے۔ جو بچے کم عمری ہی میں غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر کی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں، انہیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج ہمیں اکثر دکانوں، ورکشاپوں، ہوٹلوں، پٹرول پمپوں اور سڑکوں وغیرہ پر بہت سے معصوم بچے کام کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے معاشی حالات انہیں یہ سب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

غربت انسان کو بہت بے بس کر دیتی ہے۔ غریبی کی وجہ سے لوگ اپنے بچوں کو پڑھنے لکھنے نہیں بھیجتے، کیونکہ اول تو ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اپنی اولاد کو پڑھا لکھا سکیں۔ دوسرا وہ یہ بھی جانتے ہیں پڑھ لکھ کر ان کی اولاد کو کون سی نوکری مل جائے گی، کیونکہ ہمارے معاشرے میں رشوت، بدعنوانی، لالچ اور ہوس کا ہر سُو راج ہے اسی لیے اکثر غریب اور مزدور والدین کے بچے مزدوری ہی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس جن بچوں کے والدین انہیں کم عمری ہی میں چھوڑ کر اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں، انہیں پھر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کم عمری ہی میں مختلف جگہوں پر کام کاج کرنا پڑتا ہے۔ ایسے بچوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ انہیں کام کی جگہوں پر مختلف طرح سے زدوکوب کیا جاتا ہے، چھوٹی چھوٹی بات پر ان کی سب کے سامنے تذلیل کی جاتی ہے۔ کسی معمولی سی بھی غلطی پر کام سے نکالنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ اگر یہ کسی مجبوری کے تحت چھٹی کر لیں تو ان کی تنخواہ سے رقم کاٹی جاتی ہے۔ مگر یہ معصوم گھریلو حالات سے تنگ تمام مظالم چپ چاپ سہنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی کسمپرسی سے باخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

ان غریبوں کا بھی دل کرتا ہے کہ وہ بھی پڑھیں لکھیں، اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیل کود جیسی سرگرمیوں میں حصہ لیں مگر ان کی معاشی مجبوریاں انہیں یہ سب کرنے سے روکتی ہیں۔ یہ غریب

جتنی بھی محنت کر لیں کم اجرت میں ان کا بس دو وقت کا کھانا ہی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔تھوڑی سی رقم بھی بیماری، ضرورت یا کسی قدرتی آفت کے لیے بچا کر رکھنا ان کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے ان غریب و یتیم بچوں سے ان کی شرارتیں اور ان کا بچپن غربت چھین لیتی ہے۔

مشکلوں اور سخت حال میں زندگی گزارنے والے ان مزدور بچوں کیلئے کبھی بھی جوانی نہیں آتی، وہ بچپن کے بعد سیدھا بڑھاپے کی طرف چھلانگ لگا لیتے ہیں۔غربت و مہنگائی انہیں زندگی کی خوشیوں ہی سے محروم کر دیتی ہے۔ان کے پاس صحت اور علاج کی سہولیات کا فقدان ہوتا ہے۔ شادی بیاہ، عید، تہوار وغیرہ کے دن سب ان کے لیے عام اور معمولی دنوں جیسے ہوتے ہیں۔ان بچاروں کی زندگیوں میں بہت سی ادھوری خواہشیں اور ان کی آنکھوں میں بے شمار سلگتے ہوئے سپنے ہوتے ہیں۔معاشی مشکلوں میں پھنسے ان مزدور بچوں کے لئے زندگی کی بہاریں کبھی نہیں آتیں، کیونکہ ان کے معاشی حالات کبھی بہتر نہیں ہو پاتے۔شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں غریب مزدوروں کے مسائل پر بڑی ہی دردمندی سے قلم اٹھایا ہے۔آپ کا افسانہ "تارکول کی سڑک" غریب مزدوروں کی بے بسی کو بیان کرتا ہے۔یتیم و بے بس بچوں سے کس طرح بچپن اور جوانی کی رونقیں چھن جاتیں ہیں۔غربت ان کے ہمرہ سائے کی طرح چپکی رہتی ہے، ان کے معاشی حالات ساری زندگی نہیں بدلتے، شاہد رضوان کا یہ افسانہ غریب مزدور کے مسائل کو اجاگر کرتا ہے:

> ''غریب مزدور روتا دھوتا پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح مر جاتا ہے۔
> کیوں کہ پیدا ہوتے ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ لد جاتا ہے۔وہ بچپن
> کی سیڑھی سے چھلانگ لگا کر بڑھاپے کی چھت پر قدم رکھ لیتا ہے۔
> جوانی اس کے لیے آتی ہی نہیں''۔(9)

والدین خدائے پاک کا بہت بڑا انعام ہوتے ہیں۔ماں باپ اپنی اولاد کو صحیح غلط کی تمیز سکھاتے، ان کی تربیت کرتے اور معاشرے کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے انہیں بچانے کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔والدین کی بے لوث محبت کے سائے میں پل کر اولاد خوشی اور فخر محسوس کرتی ہے۔مگر اس کے برعکس جو بچے اپنے والدین کے سایہ شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں زندگی ان سے بڑے کٹھن امتحان لیتی ہے۔انہیں کم عمری میں ہی گھریلو حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے۔آج ہمارے معاشرے میں ایسے بے شمار بچے ہیں جو معاشی مسائل کے ہاتھوں مجبور کم عمری ہی میں گھر کی تمام ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر

اٹھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ محنت و مشقت کرتی یہ ننھی جانیں ہمیں اکثر ورکشاپوں اور مختلف دکانوں پر کام کرتی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض بچے ہوٹلوں میں برتن دھونے کچھ پٹرول پمپوں پر گاڑیوں کے شیشے صاف کرنے اور اسی طرح بعض سڑکوں یا چوراہوں پر کھڑے منیاری وغیرہ کا سامان بیچتے دکھائی دیتے ہیں۔ صبح سویرے کام پر جانے والے یہ بچے اپنے گھر ہی سے دوپہر کے کھانے کا تھوڑا بہت سامان ہمراہ لے جاتے ہیں، کیوں کہ ان کے پاس باہر کے چٹ پٹے کھانے، کھانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ اسی طرح بعض ایسے بچے جن کے گھر کھانا پکانے والا کوئی نہیں ہوتا، وہ معصوم دن بھر یوں ہی خالی پیٹ کام کاج میں مصروف رہتے ہیں۔

غربت آج ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔ اس غربت کی وجہ سے بہت سارے بچوں سے ان کا بچپن اور خوشیاں چھن جاتی ہیں کیونکہ انہیں اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے گھر سے نکل کر محنت مزدوری کرنا پڑتی ہے۔

آج ہمارے بہت سے فکشن نگاروں نے اپنے افسانوں میں غریب مزدوروں کے اُن مسائل کا ذکر کیا ہے، جن سے انہیں اپنی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ایک نام شاہد رضوان کا بھی ہے۔ اگرچہ شاہد رضوان نے بھی اپنے افسانوں میں مزدوروں کے مسائل کا ذکر کیا ہے، تاہم غلام فرید کاٹھیا نے اس موضوع کو زیادہ بہتر اور خوبصورت انداز سے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے، اور آپ نے بتایا ہے کہ غریب اور مزدور طبقے کو اپنی زندگی میں کب اور کیسے کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کا افسانہ ''انو'' ایک یتیم مزدور بچے انو کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے ذریعے کم عمری میں کام کرنے والے ننھے مزدور بچے کی مشکلات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے "انو" کے ذریعے باپ کی شفقت اور ماں کے پیار سے محروم بچے انو کی دردبھری کہانی بیان کی ہے، اور بتایا ہے کہ ماں باپ کے بغیر اولاد کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ''انو'' افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کی ولادت کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کا والد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یوں انو یتیمی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ گھر کی دال روٹی چلانے کے لئے وہ اپنی ماں کے ساتھ مل کر اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی معمولی سی منیاری کی دکان پر بیٹھنے لگتا ہے۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد انو کی والدہ نمونیا کے باعث جان کی بازی ہار جاتی ہے۔ اس طرح انو کا واحد سہارا بھی اس سے چھن جاتا ہے۔ وہ باپ کی شفقت سے تو پہلے ہی محروم تھا، اب اس کم عمری میں اسے ماں کی ممتا کے لیے بھی محروم ہونا پڑتا ہے۔ انو تیسری جماعت کا طالب علم تھا جب اس معصوم کے

ننھے ہاتھوں نے بستہ اور کتابیں تھامنے کی عمر میں ہی مشقت و مزدوری کرنا شروع کر دی تھی۔ ادھوری تعلیم اور چھوٹے چھوٹے خوابوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے بیچارہ انو تن ڈھانپنے اور پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر دکانداری کرنے لگا۔ اس کی دکان کیا تھی فقط معمولی سا منیاری کا سامان تھا۔

غلام فرید کاٹھیا نے اس افسانے کے ذریعے چھوٹی عمر میں محنت مزدوری کرتے بچوں کے بارے میں بتایا ہے کہ ان معصوموں کی بھی بہت سی خواہشیں، ان کے بھی کچھ جذبات اور ارمان ہوتے ہیں۔ یہ جب اپنی عمر کے بچوں کو ہنستے کھیلتے اور کندھوں پر بستے لٹکائے سکول جاتے دیکھتے ہیں، تو ان کا بھی جی کرتا ہے کہ یہ بھی تعلیم حاصل کریں، اپنے ہم عمر بچوں کی طرح ہنسیں، کھیلیں، کودیں، موج مستی کریں، اور عیش سے بے فکری کی زندگی جیے، مگر بدقسمتی سے گھریو ذمہ داریوں کا بوجھ انہیں یہ سب نہیں کرنے دیتا۔ ان معصوم بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور خواب، کم عمری میں ہی ادھوری رہ جاتے ہیں۔ ایسے بچے نہ اپنا بچپن جی پاتے ہیں اور نہ ہی بڑے ہو کر جوانی کی خوشیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کیوں کہ غربت و مہنگائی انہیں یہ سب کرنے سے روکتی ہے۔ یوں تو آج چائلڈ لیبر کی روک تھام کے لیے بہت سی این جی اوز کام کر رہی ہیں، اس کے ساتھ ہی حکومتی سطح پر بھی کئی قوانین بنائیجاتے ہیں۔ تاکہ نے بچوں کو کام کرنے کی بجائے پڑھائی لکھائی کے لیے سکولوں میں بھیجا جاسکے، تاہم ان پر کوئی عمل نہیں کیا جاتا۔

غربت کا مارا غریب زندگی بھر غریب ہی رہ جاتا ہے، اس کے حالات کبھی بھی نہیں بدلتے۔ کم عمری ہی میں مختلف جگہوں پر کام کرنے والے بچوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ انہیں اپنے ان پڑھ استادوں کی طرف سے مختلف طریقوں سے زدوکوب کیا جاتا ہے، کام سے نکالنے اور تنخواہ کاٹنے جیسی مختلف دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بڑی بڑی سزائیں، اور والدین کی گالیاں دی جاتی ہیں۔ ان بیچاروں کو ڈرایا، دھمکایا اور ان سے بدتمیزی سے پیش آیا جاتا ہے۔ مگر یہ معصوم معاشی حالات کے باعث تمام ظلم چپ چاپ برداشت کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے گھریلو حالات سے باخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے ''انو'' کے ذریعے یتیم بچے انو کو درپیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ غربت کے مارے چھوٹے معصوم بچے کی کھیلنے کودنے کی عمر میں معاشی مسائل کے تحت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بیچارہ انو بھی غریبی کے باعث شدید گرمی میں روٹی کمانے نکلتا ہے۔ منیاری کا سامان کندھوں پر اٹھائے انو دوسرے گاؤں جاتا ہے،

تا کہ وہاں اس کا زیادہ سے زیادہ سامان بکے اور اسے کچھ منافع حاصل ہو سکے۔ ننھے مزدور انو کے دوسرے گاؤں جا کر سامان بیچنے کے منظر کو غلام فرید کاٹھیا نے بڑی ہی دردمندی سے اپنے افسانے میں یوں بیان کیا ہے:

> ''پسینے میں شرابور وہ گاؤں میں واقع چند دکانوں پر مشتمل بازار میں گیا تو اسے دو دکانوں کے درمیان خالی جگہ ملی جو لسوڑے کے سرسبز اور گھنے پتوں والے درخت نے گھیر رکھی تھی۔۔۔۔اس نے لسوڑے کے درخت سے چند شاخیں توڑیں جن سے اس نے جھاڑو کا کام لیتے ہوئے، جگہ صاف کرتے ہوئے اپنی گٹھڑی کھولتے ہوئے چادر بچھائی اور اپنی دکان سجا دی۔۔۔۔کچھ بچے اس کے گرد جمع ہو گئے اور چادر پر سجی چیزوں کو غور سے دیکھنے لگے۔ لیکن جلد واپس جا کر اپنے کھیل میں مصروف ہو گئے کیونکہ ان کو اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ انو انہیں دیکھتا رہا اس کا بھی ان کے ساتھ کھیلنے کو دل کر رہا تھا لیکن وہ نہیں کھیل سکا۔'' (10)

مذہب اسلام ہر بڑے، چھوٹے، گورے، کالے، امیر، غریب کو برابر قرار دیتا ہے۔ برتری کا معیار صرف اور صرف تقویٰ کو کہا گیا۔ اسلام غریبوں کے استحصال، غلاموں کی نسلی فروخت، اور کمزوروں کے ساتھ غلط رویے کی شدت سے مذمت کرتا ہے۔ اسلام انسانیت کو بھائی چارے کی لڑی میں پروئے رہنے کا درس دیتا ہے لیکن صد افسوس ہم آج امیر و غریب جیسے طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ روپے پیسے کی اس کشمکش میں آج ''غریب'' بیچارہ کولہو کے بیل کی طرح اک ہی راستے پر بے بسی سے دیوانہ وار لگاتار چلتا جا رہا ہے اور ''امیر'' اسے ہانکتے ہوئے اپنی عیش و مستی میں مگن دکھائی دیتا ہے۔

میرے وطن عزیز پاکستان کے کروڑوں غریبوں پر آج فقط چند ہزار امیروں کا تسلط ہے جو کہ صحیح و غلط کے مالک بنے غریبوں کی بنیادی ضروریات ہی سے بے پروا ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو آج سیکیورٹی گارڈ، چھابڑی والا، پنکچر والا، بیرا، سیلز مین، مستری موچی، پینٹر، درزی، خاکروب، دھوبی، منشی، مکینک، الیکٹریشن، گوالا، کنڈیکٹر، پلمبر، نانبائی، ڈرائیور، مزدور اور بے شمار ایسے ہی شعبے ہیں کہ جن کا وجود ''غریب'' کی وجہ سے برقرار ہے اور ان سب ہی کے تو دم سے نظام کائنات کا حسن سلامت ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں بیشتر افراد ایسے ہیں جو غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جن کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور علاج معالجے کا بندوبست نہیں۔ آج میرے وطن کے

غریب اشرافیہ کے ہاتھوں لٹ رہے ہیں۔ ان بچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ آج پسے طبقے کا فرد غربت کے مدار میں گھوم رہا ہے روز ایڑیاں رگڑ رہا اور مر رہا ہے۔ مگر کسی کو اس کی پرواہ ہی نہیں۔ مہنگائی و غربت کے سبب غریب کو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس پر رہا سہا ستم سرمایہ دار طبقہ اپنی طاقت کے زور پر پورا کر دیتا ہے۔ امیروں کو مزدوروں کی عزت کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا، وہ بات بات پر ان کمزوروں کو ذلیل کرتے ہیں۔ یہ سلوک نہ صرف مرد مزدوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے بلکہ ایسی غریب عورتیں جو غربت کے باعث گھر سے باہر نکل کر کام کرتی ہیں انہیں بھی اسی طرح کے نازیبا سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے اکثر دیہاتوں میں وڈیروں، جاگیرداروں، چوہدریوں، زمین داروں اور نوابوں کا راج ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے اپنے انوکھے ہی قانون، قاعدے ہوتے ہیں۔ پیسے کا نشہ، طاقت کا غرور، اور ناجائز زمینوں کی ملکیت کے تکبر کی بنا پر یہ لوگ غریبوں کو پاؤں کی جوتی کے برابر سمجھتے ہیں۔ انہیں غریبوں کا حق کھاتے ہوئے ذرا شرم نہیں آتی۔ یہ لوگوں سے کام کاج کروا کر انہیں معمولی سی اجرت دے کر ان پر احسان جتلاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک غریبوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ انہیں کسی کی بھی بہو، بیوی یا بیٹی کو اپنے پاس قید کر لینے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ وہ غریب مزدوروں کے گھروں کی عورتوں مثلاً بیویوں، بیٹیوں سے ہم بستری کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ انہیں اس تمام ظلم کے خلاف کوئی بھی روکنے والا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کی اپنے گاؤں میں حکمرانی ہوتی ہے، جہاں آئے روز عصمت دری اور جنسی استحصال کے واقعات رونما ہونا معمولی سی بات ہوتی ہے۔ آج ہمارے سماج میں قتل و غارت گری، زیادتی اور جنسی تشدد جیسے واقعات میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومتی اداروں کو اس کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات کرنے کی شدید ضرورت ہے، تاکہ ہمارا معاشرہ اس طرح کی برائیوں سے پاک ہو سکے۔

آج کل ہمارے معاشرے میں ہوس پرست اور وحشی نما بھیڑیے چھوٹی بچیوں سے لے کر بڑی عمر تک کی عورتوں کو اغوا اور جنسی تشدد کے بعد بڑی تعداد میں قتل کر دیتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی جانب سے پسماندہ طبقے کے ساتھ اس طرح کا ظلم زیادہ روا رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس طبقے کو معاشرے میں اپنی عزت خراب ہونے کی بڑی پرواہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ لوگ سارے ظلم کو چپ چاپ سنتے ہیں۔ اگر کوئی عورت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف میڈیا اور سول سوسائٹی سے مدد لے کر کیس رجسٹر کروا بھی لے تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ بیچاری وکیل کی فیسیں ادا کرتی رہے۔ جبکہ ظلم کرنے والا ظالم اپنے روپے کی طاقت سے سبھی کچھ خرید لیتا ہے۔

پولیس کے ذریعے سے کیس کمزور کروا کر ضمانت حاصل کرنا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔

دیہاتوں کے چوہدری، وڈیرے اور جاگیردار غریب عورتوں کی مجبوریوں سے فائدے اٹھا کر ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ غربت کے ہاتھوں تنگ، کام کاج کرنے والی خواتین کو ملازمت سے نکالنے کی دھمکیاں دے کر ان سے غلط اور ناجائز فائدے سمیٹے جاتے ہیں۔ عورتوں کا جنسی استحصال آج بہت عام ہو چکا ہے۔ حکومت کو اس کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں تا کہ اس برائی کو ختم کیا جا سکے۔ جہاں ہمار دیگر بہت سے افسانہ نگاروں نے عورتوں پر ہونے والے مظالم کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، وہیں شاہد رضوان نے بھی اپنے افسانوں میں عورتوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ''تارکول کی سڑک'' آپ کا ایک ایسا افسانہ ہے جو کہ مزدور طبقے سے وابستہ خواتین کی زندگی اور ان کو درپیش مسائل و مشکلات کی بھرپور انداز میں عکاسی کرتا ہے۔ خالص دیہاتی ماحول سے تعلق رکھنے والی ''شریفاں'' اور کی بیٹی ''ظہری'' دونوں اس افسانے میں مرکزی کردار ہیں۔ جو غربت کے ہاتھوں مجبور، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کبھی گندم کی کٹائی، کبھی کپاس کی چنائی تو کبھی مزدور مردوں کے ساتھ تارکول کی سڑک پر پتھر کوٹتی نظر آتی ہیں۔ دونوں ماں بیٹی کا کوئی اور سہارا نہ تھا۔ فصلوں کے دن گزرے تو محنت مزدوری کی عادی شریفاں نے بے کار بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ گاؤں میں تارکول کی تازہ بنتی سڑک پر عورتوں کو کام کرتے دیکھا تو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر، جھٹ منشی سے بات کی اور دونوں ماں بیٹی کام پر جانے لگیں۔ یہاں بہت سی لڑکیاں بجری کے ٹوکرے اٹھانے اور کوٹنے میں مصروف رہتیں۔ ظہری کو یہ کام پسند نہ تھا مگر وہ معاشی حالات سے تنگ آ کر مجبوراً ماں کے ساتھ کام کے لئے جاتی تھی۔ مگر یہاں اسے منشی کی باتوں، تلخ جملوں اور اس کی غلیظ نظروں کا سامنا کرنا پڑتا۔ منشی اسے وقتاً فوقتاً چھیڑتا بھی اور باتوں ہی باتوں میں اس سے اپنی غلط خواہشات بھی پوری کرنے کا کہتا۔ مگر ظہری اس سب کے لئے نہ مانی، جس پر منشی نے ان مجبور ماں بیٹیوں کو بہانہ بنا کر کام سے نکال دیا۔ شاہد رضوان کا یہ افسانہ غربت کی چکی میں پستی دو ماں بیٹیوں کی بے بسی اور معاشرتی حیوانیت کی کہانی ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج عورتوں کو مردوں کے برابر کام کرنے اور گھر سے باہر نکل کر کمانے کے لیے بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ غریب مزدور عورتوں کو بات بات پر ذلیل و رسوا اور بلیک میل کر کے، نوکری سے نکالنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ کام کاج کے اڈوں، اور مزدوری کے ٹھکانوں پر ان بچاری عورتوں سے چند روپوں کی خاطر جس طرح اپنی عزتوں کا سودا کرنے کا کہا جاتا ہے، شاہد رضوان کا یہ افسانہ اس

سب کی بہترین مثال ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ افسانہ دکھوں کی ماری ایک ایسی ماں کی بے بسی بھی عیاں کرتا ہے جومعیشت کی مجبوری کی بنیاد پر بیٹی کوجسم فروشی ،منشی کی حیوانیت اوراسکی جنسی خواہشات کااحترام کرنے کا کہتی ہے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ ماں ایک عورت ہوکراک عورت یعنی اپنی بیٹی کو ان ناجائز اور حرام کام کی اجازت کیوں کر دے رہی؟ آخر وہ کون سی ایسی مجبوریاں ہیں جن کے باعث وہ اس انتہائی برے قدم کی جانب بیٹی کو دھکیل رہی ہے؟ تو بہت ہی افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ غربت ہی ہے جومعیشت کی چکی میں پستی ماں بیٹی کو یہ سب کرنے پر مجبور کررہی ہے۔

شاہد رضوان کےاس افسانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح جنسی درندے گھریلو حالات بدلنے کے لیے محنت مزدوری کرتی خواتین اور نوجوان لڑکیوں کواپنے مذموم مقاصد اور جنسی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔افسانہ نگار نے بڑے ہی بہترین انداز سے طاقتوروں کے ہاتھوں مظلوم عورتوں کے استحصال کواپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔معاشرتی خباثت کی شکاراور غربت و بے بسی کی تصویر بنی ماں بیٹی کے مکالمے کوافسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

> "وہ جھگی میں چارپائی پر لیٹ کراس کا انتظار کررہا تھا۔ایک دوبار تو اس نے باہر جھانک کر بھی دیکھا کہ وہ آرہی ہے کہ نہیں۔وہ برابر جھگی کی طرف دیکھتی اور منشی کی بے چینی کو سمجھتی رہی۔اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے؟ وہ ٹوکرا پھینک کر اپنی ماں سے بولی: ''منشی کہتا ہے جھگی میں آ کر میری بات سنو۔'' شریفاں دوسری طرف منہ کر کے بولی:"چلی جاؤ"(11)

عورت خدا کی خوبصورت مخلوق ہے۔جس کا ادب اور احترام ہم سب پر فرض ہے۔مگر چونکہ ہمارے دیہاتوں میں جاگیرداروں،چوہدریوں،زمینداروں،وڈیروں اور نوابوں کی حکومت ہوتی ہے۔کسی کی بھی بیٹی،بہو یا بیوی کواپنے پاس قید کرلینے کی انہیں کھلی آزادی ہوتی ہے۔جوعورتوں کے تقدس کا ذرا لحاظ نہیں کرتے۔بلکہ وہ غریبوں،ہاریوں اور کسانوں کی بہو،بیٹیوں اور بیویوں پر ہر طرح کاظلم کرنااورہم بستری کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اورانہیں کوئی روکتا بھی نہیں۔کیونکہ ان کے گاؤں میں اپنے ہی قانون ہوتے ہیں جہاں عزت سستی اور روٹی مہنگی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں عصمت دری اور جنسی استحصال کے واقعات آئے روز ہوتے دیکھائی دیتے ہیں۔پسماندہ طبقے میں ان کیسز کی شرح میں اضافہ زیادہ تیزی سے ہوتا ہے،کیونکہ اس طبقے کے پاس نہ تو کیس لڑنے کے لیے پیسہ ہوتا ہےاور نا ہی اتنا شعور کہ وہ اپنے خلاف ہونے والے ظلم پر آواز بلند کرسکیں۔اگراس

طبقے کی کسی خاتون کے ساتھ کوئی جنسی زیادتی ہوجائے تو اول تو ان کے بیانیے کی شنوائی ہی نہیں ہوتی، دوسرا اگر میڈیا اور سول سوسائٹی کی وجہ سے ان کا کیس رجسٹرڈ ہو بھی جائے تو ان غریبوں کے پاس کیس کی فیس بھرنے کی سکت ہی نہیں ہوتی ،جس کی وجہ سے ملزمان پیسے کی بنیاد پر پولیس کو ساتھ ملا کر کیس کمزور بنا دیتے ہیں اور بالآخر خود آزاد گھومتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں غریبوں کو کبھی انصاف نہیں ملتا کیونکہ امیر لوگ ان پر اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔قانون اور عدالتوں پر ان کا راج ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے فیصلہ انصاف کے بجائے طاقت ور کے حق میں ہوتا ہے۔حکومت کو ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے قانون بنا کر مجرموں کے خلاف سخت ترین سزائیں مقرر کرنی چاہیں۔تاکہ معاشرہ ان سے سبق حاصل کر سکے۔

افسانہ نگار نے سماج کے ان ہوس کاروں پر بھی قلم اٹھایا ہے جو اپنی ناپاک خواہشات کے لیے مجبور غربت کی ماری عورتوں کو شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے سے باز نہیں آتے۔

غلام فرید نے اپنے افسانے ''ٹھنڈے ہونٹ'' میں صغریٰ کی بے بسی کو بڑے ہی عمدہ انداز سے بیان کیا ہے۔صغری جو سانس کی بیماری کی ایک سال سے مریضہ بن چکی تھی۔اس بیماری کے باوجود وہ محنت ومشقت کر کے اپنے شوہر کے ساتھ سال بھر کیلئے راشن اکٹھا کر رہی تھی۔ چوہدری انیس کی نظر صغری پر پڑی تھی جو کسی جنت کی حور سے کم دکھائی نہیں دیتی۔وہ کن اکھیوں سے صغریٰ کو دیکھنے اور تھریشروں کی نگرانی کے صغریٰ کے بہانے، مشین کے قریب اٹھنے بیٹھنے لگا،کبھی عنایتے تو کبھی صغریٰ سے براہ راست بات چیت کرنے کی مسلسل کوششیں کرتا رہا۔مگر جب وہ صغریٰ کے ساتھ زیادہ گفت و شنید کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تو اس نے اپنے دو خاص آدمیوں کے ذریعے رات کے پہر صغریٰ کو اٹھا کر لانے کا منصوبہ بنایا۔صغریٰ بیچاری سانس کی بیماری کی وجہ سے لاچار و بے بس،نیم بے ہوشی کے عالم میں سوئی پڑی تھی۔

افسانہ نگار نے خوب حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے کہانی کے فن کو واقعات میں پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح چوہدری کے پروپیگنڈے میں اس کے کارندے اس کا ساتھ دیتے ہیں،اور بڑی ہی ہوشیاری اور چابکدستی اپنے گناہ کو چھپا کر کسی کو کانوں کان خبر ہوئے بغیر پارسائی کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ان ظالموں کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ سانس کی بیماری میں مبتلا،ایک غریب مزدور عورت وقت پر دوا نہ ملنے کے سبب موت کو گلے لگا لیتی ہے۔اوران ہوس کے

پجاریوں کو کسی قسم کا کوئی پچھتاوا یا دکھ نہیں ہوتا۔

عورتوں پر جنسی تشدد کے حوالے سے ہمارے فکشن نگاروں نے بڑے ہی بہترین اور بلند پایہ افسانے لکھے ہیں۔ اگر چہ غلام فرید کاٹھیا کے ہم عصر افسانہ نگار شاہد رضوان نے بھی عورتوں پر جنسی جبر کے حوالے بہت اچھے انداز سے لکھا ہے، تاہم میری ذاتی رائے کے مطابق غلام فرید کاٹھیا نیا س حساس اور توجہ طلب موضوع کو اپنے افسانوں میں نئے انداز اور زیادہ بہتر زاویے سے بیان کیا ہے۔ اور بلا شبہ آپ اپنے افسانوں کے ذریعے دیہاتی زندگی کے ان مظالم کو اجاگر کرنے میں بہت حد تک کامیاب بھی ٹھرے ہیں۔ آپ کی اکثر کہانیاں عورتوں پر ہونے والے جبری ظلم کو عیاں کرتی ہیں۔ افسانہ ''ٹھنڈے ہونٹ'' صغریٰ کی بے بسی ،اور چالاکی و مکاری کا لبادے اوڑھے، ہوس پرست چوہدری انیس کی جھوٹی شان وشوکت کا پول کھولتا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''ابھی اذانیں نہیں ہوئی تھی کے دونوں ملازمین اپنے فرض سے فارغ ہوکر واپس ڈیرے پر پہنچتے ہیں جہاں چوہدری انیس سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر تیز تیز قدموں سے گھوم رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی بول اٹھا ''کسی نے دیکھا تو نہیں؟'' اور دونوں نے بتایا ''سب ٹھیک ہے۔'' اور بولے۔۔۔ چوہدری انیس نے ڈانٹا اور کہا چپ رہو جب ہمیں کسی نے دیکھا ہی نہیں تو ہمیں کیا معلوم۔ اسی دن سہ پہر کے وقت جب صغری کا جنازہ پڑھایا جارہا تھا تو چوہدری انیس اور ان کے دونوں ملازم جنازے کی پہلی صف میں امام کے عین پیچھے موجود تھے۔'' (12)

مرد کی طرح کسی بھی معاشرے میں عورت کا بھی بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ اگر مرد کا فرض روزی کمانا ہے تو یہ عورت گھر رہ کر بچوں کی پرورش کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ عورت کو فطری طور پر مرد کی نسبت ذرا کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مرد طاقتور ہونے کی بنا پر عورت کا استحصال کرے۔ بلکہ عورتیں پیار، محبت، عزت واحترام کی حقدار ہوتی ہے۔ حضور پاک ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے فرمان کے مطابق لوگوں کو عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرنے اور ان کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

عورت کو آدھی دنیا تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے کسی بھی معاشرے میں اس کی اہمیت کو نظر انداز کرنا آسان نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عورت انسانی زندگی کی گاڑی کا لازمی پہیہ ہے، مگر انسانی

تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ آدھی دنیا ہونے کے باوجود عورت کو وہ اہمیت وحیثیت نہیں دی جاتی، جس کی واقعتاً وہ حقدار ہے، جس طرح اسلام کی آمد سے پہلے عورت کی عزت کو تباہ کیا جاتا، خواتین کے ساتھ غیر انسانی رویہ روا رکھا جاتا۔ شوہر کے مرنے کے بعد عورت کی زندگی بے کار ہو جاتی۔ مرد عورت کا جنسی استحصال کرتا تھا۔ بہن، بیوی، بیٹی جیسے پاکیزہ رشتوں کا کوئی احترام نہ تھا۔ آج بھی اسی طرح ہماری جدید تہذیب میں عورت کو کوئی عزت نہیں دی جاتی۔ بلکہ خواتین کا بہت بری طرح سے جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں عورت فقط جسمانی لذت کا ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ چھوٹی بچیوں سے لے کر نوجوان لڑکیوں اور بڑی عمر کی عورتوں تک کی عزتیں محفوظ نہیں۔ ہمارے معاشرے میں جنسی درندے اپنی آنکھوں میں ہوس لیے معصوموں کی عزتیں تار تار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عورت ہر عمر اور ہر روپ میں درندگی کا نشانہ بن رہی ہے۔ پھر وہ چاہے ملوں میں کام کرنے والے کسی غریب کی بیٹی ہو، کسی کسان یا ہاری کے گھر کی عزت ہو، غربت کے ہاتھوں گھر سے نکل کر کام کرنے والی کوئی بے بس خاتون ہو یا پھر کسی غریب مزدور کی کم عمر ننھی شہزادی۔ غرض ہمارے معاشرے میں عورت کو ہر طرح سے نوچا جا رہا ہے۔ عورتوں کا جنسی استحصال کرنے والے لوگ اب نہ صرف فرد واحد کی صورت یہ جنسی جبر جیسا کھیل کھیلتے ہیں، بلکہ یہ لوگ منظّم گروہوں کی صورت اس کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ چھوٹی عمر کی بچیوں سے لے کر نوجوان لڑکیوں تک کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے بہلا پھسلا کر اغواء کیا جاتا ہے، اور پھر ان سے جنسی تشدد، جبر، اور زیادتی جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کرنے والے بعض لوگ انہیں مختلف گروہوں اور جنسی کام کے اڈوں میں بیچ دیتے ہیں، کسی بہت بڑی عمر کے مرد ساتھ زبردستی بیاہ دیتے ہیں یا ان کی گھر واپسی کے بدلے تاوان کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جنگل جیسا قانون ہے۔ ان ظالموں اور درندوں کو پکڑنے والا کوئی نہیں۔ انصاف کے اداروں کو چاہیے کہ وہ ایسے مجرموں کے لیے سخت ترین سزائیں رکھیں، تاکہ کسی معصوم لڑکی کی عزت داغدار نہ ہو۔ خواتین کا اغواء اور جنسی زیادتی جہاں ایک بہت ہی قبیح عمل ہے۔ وہیں چھوٹی بچیوں سے بدفعلی بھی ایک گھناؤنہ جرم ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج جنسی زیادتی جیسا ناسور تیزی سے جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔ جس سے چھٹکارا پانا بہت ضروری ہے۔ شاہد رضوان نے اس موضوع پر بڑی دردمندی سے قلم اٹھایا ہے۔ آپ نے اپنے افسانے ''گل چیں'' میں بچوں سے زیادتی کرنے والوں کو ''پھول توڑنے والے'' جبکہ بچوں کو پھول سے تشبیہ دے کر بتایا ہے کہ جب غنچے (بچے) چٹخ کر پھول بنتے ہیں تو باغبان (والدین)

خوش ہوتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ہر لمحہ ’’گل چیں‘‘(پھول چننے والے چور/جنسی درندے) کا تصور بھی رہتا ہے جو اسے افسردہ کیے رکھتا ہے۔اسے ہر لمحہ گل چیں کے کھردرے ہاتھ نظر آتے ہیں جو ہر وقت پھول نوچنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ایک پل کو اگر مالی (والدین) کی نظر چوک جائے تو گل چیں کی بے رحمی اپنے ہاتھوں کی صفائی دکھا چکتی ہے۔

شاہد رضوان نے بڑی مہارت کے ساتھ ’’گل چیں‘‘ افسانے میں پھولوں کی بات کر کے ننھی معصوم بچیوں سے جنسی درندگی کے موضوع کو سمویا ہے۔افسانہ نگار نے ایک ایسے شخص کی ذہنی و جسمانی کیفیت کو واضح کیا، جو کہ فراغت کا شکار ہے اور ہمہ وقت انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر جنسی اشتہا بڑھانے والا مواد دیکھتا رہتا ہے۔جس سے اس کے اندر کا بھیڑیا جاگ جاتا ہے اور وہ ہر وقت اپنی جسمانی تسکین کے لیے منصوبے سوچنے میں لگا رہتا ہے۔وہ اپنے شکار کی تلاش میں سڑک پر گھومتا ہے۔پہلے پہل تو وہ ایک سانولے رنگ کی عورت جو کہ حلیے سے ملازمہ معلوم ہوتی ہے چھت پر کپڑے پھیلاتی نظر آتی ہے، وہ اسے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے عجیب اشارے کرتا ہے، کبھی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتا تو کبھی سیٹیاں بجا کر اسے اپنی جانب مائل کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔مگر وہ اس کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے، تیوری چڑھا کر غصے سے اسے گھورتی ہے اور نیچے سڑک کی جانب منہ کر کے اس پر تھوک دیتی ہے۔جس پر وہ غصے سے تلملا اٹھتا ہے اور اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لینے نکل پڑتا ہے۔وہ پارک میں جاتا ہے اور نسوانی چہروں کو نفسانی بھوک اور ہوس بھری نظروں سے دیر تک تکتا رہتا ہے۔مگر وہاں بھی اس کی دال نہیں گلتی، تو وہ وہاں سے واپس لوٹ رہا ہوتا ہے یہ اچانک اس کی نظر گلی میں کھیلتے ننھے بچوں پر پڑتی ہے جنھیں دیکھ کر اس کے دماغ میں منفی خیالات پنپنے لگتے ہیں۔وہ اپنے ناپاک منصوبے کی تکمیل کے لئے ان بچوں کے پاس رک جاتا ہے اور انہیں ٹافیاں دیتا ہے۔اسی طرح روز بچوں کے پاس آ کر، ان سے گپ شپ کرنے اور بند مٹھی کھول کر سب کو ٹافیاں بانٹنے کا یہ سلسلہ کافی روز تک جاری رہتا ہے۔اس سب عرصے میں اس کے اندر کا بھیڑیا بھوک سے بلبلا رہا تھا۔وہ پیٹ سے کھانا کھا کر بھی بھوکا ہی رہتا اس کے دماغ میں شیطانی خیالات پلتے اور عجیب کھچڑی پکتی رہی۔ایک روز وہ جب گلی میں آیا تو گلی میں سب بچے جمع تھے۔وہ سب کھیل کود میں مصروف ہر لمحہ اودھم مچا رہے تھے۔مگر ایک سات سالہ بچی انوشہ سب سے جدا منہ پھلائے بیٹھی تھی۔نوجوان کے ٹافیاں لاتے ہی سب بچے اس کے ارد گرد جمع ہو گے، مگر انوشہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔وہ بچوں سے اس کے روٹھنے کا سبب دریافت کرتا ہے۔جس پر بچوں نے اسے

بتایا کہ وہ ماں سے چابی والی گڑیا لینے کی ضد کر رہی تھی ،جس پر ماں نے اسے بہت سمجھایا کہ یہ امیر زادیوں کی سی ضد چھوڑ دے، کیوں کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔مگر وہ برابر وہی ضد کرتی رہی جس کی بنا پر ماں نے اسے زور سے ایک تھپڑ دے مارا۔اور وہ دیر تک روتی رہی۔اسی لیے وہ آج یوں چپ چاپ دکھائی دیتی ہے۔جب نوجوان کو یہ سب پتا چلا تو اس کی آنکھیں شیطانیت سے چمکنے لگیں۔اس نے بچی کے پاس ہوکر اس کے کان میں کوئی ایسی بات کہی کہ جسے سن کر اس کے روتے چہرے پر رونق آ گئی۔

نوجوان نے اپنے سوچے ہوئے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے تمام بچوں کو اس شرط پر دو دو ٹافیاں دینے کا اعلان کیا کہ وہ ٹافی لینے کے فوراً بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔یوں سب بچے باری باری گھروں کو پلٹ جاتے ہیں اور انوشہ نوجوان کی انگلی پکڑے، چہرے پر خوشی سجائے، آنکھوں میں مسرت سموئے یوں اچھلتی کودتی اس کے ساتھ ایسے چل رہی ہوتی ہے جیسے کسی میلے کے لیے قدم بڑھا رہی ہو۔جہاں نوجوان کے چہرے پر شیطانیت جھلک کر رہی تھی وہیں انوشہ کے چہرے پر ملنے والے کھلونوں کے لیے خوشی اور طمانیت تھی۔وہ آنے والے ڈراونے لمحوں سے بالکل بے خبر تھی۔شاہد رضوان کا افسانہ ''گل چیں''ایک ایسے جنسی درندے کی ہوس اور اندرونی خباثت کا آئینہ دار ہے جو فقط سات سالہ ننھی غریب بچی کو کھلونوں کا لالچ دے کر اپنی جنسی تسکین کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں بچیوں کا ریپ اور ان سے جنسی زیادتی بہت عام ہوگئی ہے۔ ان اغواء کاروں کا طریقہ اغواء کچھ یوں ہوتا ہے کہ یہ ننھی معصوم بچیوں کو کھانے پینے کی چیزوں کا لالچ دے کر یا سکولوں سے واپسی پر مختلف حیلوں بہانوں سے اغواء کر لیتے ہیں اور اس طرح پھر مذموم جنسی عزائم کی تکمیل کے بعد انہیں بے دردی سے قتل کر کے بوری بند لاشوں کی صورت ویرانوں اور کچرے کے ڈھیروں میں پھینک دیا جاتا ہے۔غریب بچیوں کی جان اور عزت محفوظ نہیں ہے۔ہمارے انصاف کے اداروں کو جنسی بھیڑیوں کے خلاف سختی سے ایکشن لینا چاہیے اور ان کو کڑی سے کڑی سزائیں دینی چاہیئے تاکہ کسی بھی جنسی درندے کی یہ سب کرنے کی ہمت نہ ہو۔

ماں باپ کو اپنی جوان لڑکیوں کے ساتھ ساتھ،اپنی کم عمر بچیوں کو بھی اکیلے گھر سے باہر نہیں جانے دینا چاہیے، چھوٹی معصوم بچیوں کے والدین کو ان پر نظر رکھنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ان سے کون، کب اور کیوں ملتا ہے؟۔اس سب کے ساتھ ساتھ ماں باپ کو اپنی بچیوں کو سختی سے اس بات

سے بھی منع کرنا چاہیے کہ وہ کسی انجان شخص سے کوئی بھی کھانے پینے والی شے لے کر نہ کھائیں، اور نہ ہی والدین کو بتائے بغیر اکیلے کسی کے ساتھ باہر نکلیں، کیونکہ یہ سب احتیاطیں انہیں بہت سے مسائل اور طوفانوں سے بچا سکتی ہیں۔ افسانہ ''گل چیں'' میں شاہد رضوان نے جنسی بھیریے کی شیطانیت اور اسکی طرف سے اغواء کے سلسلے میں پھیلائے جانے والے ایک جال کو شاہد رضوان نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''گلی میں سب بچے جمع ہو کر ادھم مچا رہے تھے لیکن انوشہ سب سے الگ منہ پھلائے لکڑی کے شہتیر پر بیٹھی تھی۔ اس کیٹافیاں لے کر آتے ہی سب بچے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ لیکن انوشہ نہ آئی۔ اس کے پچکارنے پر بھی نہیں آئی تو اس نے بچوں سے اس کے روٹھنے کا سبب معلوم کیا۔ ایک بچے نے بتایا کہ وہ اپنی ماں سے چابی والی گڑیا لینے کی ضد کر رہی تھی۔ ماں نے اسے سمجھایا کہ وہ یہ سوچنا بھی چھوڑ دے کہ وہ امیر زادیوں کی برابری بھی کر سکتی ہے۔ اس پر جب اس کی ریں ریں نہ رکی تو اس کی ماں نے اسے ایک چپت لگا دی۔ یہ سن کر نوجوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے بچی سے کوئی ایسی بات کہی کہ جسے سن کر اس کی چہرے پر خوشی کی لہر پھیل گئی۔''(13)

آج ہمارے ملک کے کئی علاقوں میں نوابوں، وڈیروں، چوہدریوں اور جاگیرداروں کا راج ہے۔ جو اپنی زمینوں پر کام کرنے والے ہاریوں اور کسانوں پر بہت ستم ڈھاتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار بے چارے غریبوں سے محنت مزدوری کرواتے ہیں اور اس کے بدلے ان کے حصے میں اناج کا کچھ حصہ آتا ہے۔ اگر کسی سال فصل بہت اچھی ہو جائے اور کسانوں یا ہاریوں کے پاس ان کی ضرورت سے زائد اناج جمع ہو جائے، تو یہ جھوٹی شرافت کے لبادے اوڑھنے والے وڈیرے مختلف حیلوں، بہانوں سیان غریبوں کو پیداوار کے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ وہ ان پر کبھی اناج کی چوری جیسا سنگین الزام لگاتے ہیں تو کبھی کسی گائے، بھینس کے ڈاکے کے جھوٹے مقدمے کے سلسلے میں انہیں جیل بھجوا کر ان بیچاروں کی رقم اور اناج وغیرہ پر قبضہ جما لیتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں غریبوں کا بہت بری طرح سے استحصال کیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو کوئی ان ظالموں کے سامنے آنکھ اٹھا کر یا اونچی آواز میں بات کرتا ہے تو یہ وڈیرے اسے بڑی ہی سخت قسم کی سزائیں دیتے ہیں۔ ان ہاریوں

اور کسانوں کی زندگی نوابوں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔ بعض کسانوں کے معاملات میں یہ جاگیردار اور وڈیرے اتنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں کہ وہ ان کی بہنوں اور بیٹیوں کے رشتے اپنے ملازموں یا اپنے من پسند افراد سے طے کر دیتے ہیں اور وہ چھوٹے کسان اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ انہیں بغیر چوں چرا کیے ان کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔ اسی طرح چھوٹے ملازموں کی بہنوں، بیٹیوں یا بیویوں پر اگر کسی وڈیرے، اس کے بیٹے کی نظر آ جائے اسے گھر سے اٹھا کر لے جانا ان وڈیروں کے لئے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ نو جوان لڑکیوں کو اغوا کر کے ان سے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے والے ان ظالموں سے سوال کرنے کا حق کسی کو بھی نہیں ہوتا۔۔ کیونکہ دیہات اور گاؤں میں ان ظالم وڈیروں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ وہ جب جسے مرضی قتل کے الزام میں پھنسا دینے کا ہنر رکھتے ہیں۔

ان مظلوم کسانوں اور ہاریوں کی کبھی بھی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ وڈیروں، نمبرداروں اور چوہدریوں کی جانب سے غریب کسانوں کو ہمیشہ ہی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی کی بھی جوان حسین بیٹی اٹھوانا ان کے لیے ذرا مشکل نہیں ہوتا پولیس اور قانونی ادارے ان کے زیر سایہ چلتے ہیں۔ انہیں کسی کی بھی ذرا برابر پرواہ ہوتی ہے نہ ہی خوف۔ یہ وڈیرے اپنے سے کمزور یا چھوٹے ملازموں اور غریبوں سے اپنی کسی پرانی دشمنی، حسد یا ذاتی انا کا بدلہ لیتے ہیں۔ غرض وہ ان غریبوں پر ہر طرح کے مظالم کے پہاڑ توڑتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے ''لمحوں کی قید'' کے ذریعے دیہاتوں کے فرعون نما وڈیروں کی اصلیت اور ان کی وجہ سے ظلم کی چکی میں پسنے والی عورتوں کی بے بسی کا تذکرہ کیا ہے۔ افسانہ نگار نے افسانے کے مرکزی کردار ''شمو'' کے ذریعے معاشرے میں دوہری شخصیت اور منافقانہ رویوں کے مالک چوہدریوں کے ناپاک اور مذموم مقاصد سے پردہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ افسانے میں محنت پسند ''شمو'' کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جو کہ جدی پشتی ہاریوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ محنت و مشقت اس کے لہو میں بچپن ہی سے شامل رہی تھی۔ وہ دن رات جانفشانی سے کام کرتا اور وڈیروں کی زمینوں پر کاشتکاری کرتا۔ وہ یہ سب اس لیے کرتا کیوں کہ وہ اپنی اکلوتی بہن ''رانو'' کا مستقبل سنوارنا چاہتا تھا۔ عزت اور شان سے اسے اگلے گھر رخصت کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو بڑھاپے میں خوشحال زندگی کی تمام سہولیات مہیا کر سکے۔ اسی غرض سے وہ گاؤں کے سائیں کی زمینوں پر کاشکاری کا کام انجام دینے لگتا ہے۔ وہ جی جان سے مزدوری کرتا ہے۔ فصل کی کاشت بہت اچھی

ہوتی ہے جس کے نتیجے میں شمو کے حصے میں بہت سارا اناج آتا ہے۔ وڈیرے سے یہ سب ہضم نہیں ہوتا کہ شمو اتنے زیادہ آناج کا مالک بن جائے۔ اس لیے وہ اپنی اندرونی خباثت اور ہوس وحرص کے باعث شمو سے اناج ہتھیانے اور اس کی اکلوتی بہن کو حاصل کرنے کے لیے رانو کو اغوا کروالیتا ہے اور سارا الزام دوسرے وڈیرے پر لگا کر خود بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ گاؤں کے وڈیرے اور چودھری کتنی غلیظ اور گھٹیا فکر کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر میں ہوس کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ان کی نگاہ میں کسی بھی عورت کا کوئی تقدس نہیں ہوتا۔ ان وحشی بھیڑیوں کہ اپنے الگ ہی قانون ہوتے ہیں۔ ان کا جب جی چاہے یہ جس مرضی غریب کی بہن، بیٹی کو طاقت کے زور پر اغواء کر لے جاتے ہیں، اور ان سے جتنا عرصہ ان کا جی چاہے ہم بستری کرتے ہیں۔ ان وڈیروں کے نزدیک غریب کے گھر کی عورت کی اس کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ ان سے ناجائز سلوک روا رکھنا اپنا حق تصور کرتے ہیں۔

آج ہمارے معاشرے میں طاقت کے نشے، خاندانی جھگڑے، کینے، حسد، پیسے کی لالچ اور جنسی تسکین کے لیے کم عمر بچیوں سے لے کر بزرگ خواتین تک کو زیادتیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انہیں مختلف مذموم مقاصد کے تحت اغواء کر کے مختلف گروہوں کے ہاتھوں بیچ دیا جاتا ہے۔ غرض آج ہمارے معاشرے کی عورت بالکل بھی محفوظ نہیں ہیں۔ حکومتی سطح پر اس سب کی روک تھام کے لیے اقدامات اٹھانے کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ عورت عمر کے کسی بھی حصے میں ان جیسے درندوں کے ہاتھوں داغدار ہونے سے بچ سکے۔

آج جہاں ہمارے کئی دیگر افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے ان ٹھگ اور جنسی اغواء کاروں کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے، وہیں اس فہرست میں ایک نام غلام فرید کاٹھیا کا بھی ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے بہت سے افسانوں میں عورتوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ آپ کے بیشتر افسانے ہمارے معاشرے کے ان ہوس کاروں کے چہروں پر طمانچہ ہیں، جو غریب اور بے بس عورتوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے اغوا کر کے ان سے جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اگر چہ غلام فرید کاٹھیا کے بہت سے ہم عصر افسانہ نگاروں جن میں ایک نام شاہد رضوان کا بھی ہے، ان سب ہی نے عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں، نوجوان لڑکیوں، اور معصوم بچیوں کے اغوا سے متعلق اپنے اپنے انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ بلاشبہ ان کے افسانے حقیقتوں کی تصویر دکھائی دیتے ہیں۔

شاہد رضوان نے بھی عورتوں کے جنسی استحصال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا

ہے، اور آپ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ٹھہرے ہیں، تاہم غلام فرید کاٹھیا کے ہاں یہ موضوع وسعت، گہرائی اور زیادہ جاندار انداز سے ملتا ہے۔ بلاشبہ دونوں افسانہ نگاروں نے عورتوں پر ہونے والے مظالم کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے تاہم غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں میں دیہاتی عورتوں کے استحصال کی کہانیاں زیادہ بہتر انداز میں ملتی ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا نے رانو کے اغواء اور وڈیرے کی منافقت کو بڑے ہی دلچسپ انداز سے اپنے افسانے میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''سائیں، رانو گھر سے غائب ہے یقیناً اسے اٹھوا لیا گیا ہے، وہ ایسی ویسی بالکل نہیں ہے۔ یہ سردار ڈوڈے خان کے بھتیجے رحیم داد کی حرکت ہے اور سائیں اللہ ڈوائے نے دانت پیستے ہوئے کہا: رحیمو کے بچے کی میری گوٹھوں میں یہ جرات۔ میں ان کے سب ہاریوں کی بیٹیاں اٹھوا لوں گا۔ میں دیکھتا ہوں وہ باز وواپس کیسے نہیں کرتے۔'' (14)

''ظلم'' عدل کی ضد ہے۔ عدل و انصاف ہی کے باعث انسانیت کا وقار قائم و دائم رہتا ہے۔ جو معاشرہ انصاف کو پروان نہ چڑھا سکے وہاں پھر ظلم کا راج اور ظلم کی بات چلتی ہے۔ پھر ایسے سماج میں دہشت و درندگی کا بسیرا ہو جاتا ہے۔ لوگ طاقت اور رشوت کے زور پر چند ہی لمحوں میں ملزم کو مجرم اور سزا یافتہ مجرم کو بے گناہ بنا دیتے ہیں۔ اور ایسے معاشرے میں انصاف فقط چند پیسوں کی خاطر بکنے لگتا ہے۔ کسی بھی سماج کی خوشحالی، سکون اور بہتری کے لیے وہاں انصاف کا نظام ہونا بہت ضروری ہے۔ انصاف کے بغیر انسانیت کا قتل ہو جاتا ہے اور انسانیت کے ختم ہو جانے کا مطلب ہے جانوروں سے بھی بدتر زندگی ہونا ہے۔ قرآن کریم میں ہمیں بار بار انصاف کا حکم ملتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''کسی قوم (یا فرد) کی عداوت تمہیں ناانصافی پر نہ ابھارے، تم عدل کرتے رہو کیونکہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔'' انصاف قوموں کے وقار کی علامت ہے۔ آپ ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع امیر، غریب، گورے، کالے ہر ایک کو برابر قرار دیتا ہے، برتری کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ امیر طبقہ ازل ہی سے کمزوروں اور غریبوں کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرتا آیا ہے اور آج بھی ہمارے جنوبی پنجاب اور دیہی علاقوں میں ایسے بے شمار جاگیردار، نواب اور وڈیرے نظر آتے ہیں جو غریبوں کا بڑی بے دردی سے استحصال کرتے ہیں۔ یہ چالاک اور مکار لوگ اپنی نسلوں تک پرانی دشمنیوں میں اپنے مخالفین کو مروا کے اس کا سب مدعا بیچارے غریبوں اور کمزوروں کے سر ڈال دیتے ہیں۔ غریب بیچارے کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ ان مقدموں کو لڑنے کے لیے اپنے لئے کوئی اچھا وکیل

کرے یا پھر امیروں کی طرح اپنی ضمانت کروا سکے۔ ہمارے ہاں عدل وانصاف کا پیمانہ بہت کمزور ہے، چھوٹے چور کو پکڑ کر سزا دی جاتی ہے جبکہ بڑا چور چوری کرتا ہے تو اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ امیر طبقہ جرم کر کے بھی باعزت ومعزز بن جاتا ہے۔ اور اپنے جرموں کو چھپانے کے لیے غریبوں کے سر الزام تھوپ دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ہاں جیلیں صرف غریبوں سے بھری ہیں جبکہ بڑے ڈاکو آزادانہ معاشرے میں دندناتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سب سے معاشرتی بگاڑ وانتشار جنم لیتا ہے۔

آج سرمایہ دار، وڈیرے، چودہدی اور نواب اپنی دولت اور رشوت کے سبب پولیس اور انصاف کے اداروں کو خریدنے میں مشغول ہیں۔ یہ غریبوں پر جھوٹے مقدمے بنوا کر انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے تمام عمر سڑنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں ان پر ظلم کرتے ہیں اور انہیں شدید تشدد کا بھی نشانہ بناتے ہیں۔ چھوٹے طبقے سے تعلق رکھنے والے یہ قیدی اکثر اپنے گھر والوں کے اکلوتے کفیل ہوتے ہیں۔ ان کی گرفتاری ان کے اہل خانہ کو فاقوں تک لے آتی ہے۔ بوڑھے ماں باپ کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے کوئی تگڑا وکیل کروا کے ان کی ضمانت کروا سکیں۔ پولیس اپنی سنگدلی، پیسوں کے لالچ اور وڈیروں کی وجہ سے بوڑھے والدین کو اولاد سے ملنے تک کی اجازت نہیں دیتی۔ یوں نہ صرف گرفتار ہونے والا جھوٹے مقدمے، پولیس تشدد اور تنہائی کے سبب مرتا ہے، بلکہ اس کا تمام خاندان بھی فکر میں جیتے جی مر جاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں ظلم بہت بڑھ گیا ہے۔ سرمایہ داروں اور وڈیروں نے غریبوں اور ان کے خاندانوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ ان مظلوموں پر ستم کے پہاڑ توڑتے، ان کے خلاف جھوٹے مقدمے بنواتے، انہیں تشدد اور قتل تک کا نشانہ بنواتے نظر آتے ہیں۔ ان ضمیر کے سوداگروں کے باعث سماج سے بڑی تیزی سے عدل وانصاف کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ آج ظلم کی روک تھام اور غریبوں کے حقوق تحفظ کے لیے وڈیرہ سسٹم اور پولیس گردی کا خاتمہ بہت ضروری ہے، ہر چھوٹا بڑا سکون اور آزادی سے اپنی زندگی جی سکے۔

شاہد رضوان درد انسانیت رکھنے والا ایک ایسا فکشن نگار ہے کہ جس نے اپنے افسانوں کے ذریعے غریبوں پر ہونے والے جبر پر بڑی ہنرمندی سے قلم اٹھایا ہے۔ اس کے افسانے معاشرتی رویوں کو بڑی حقیقت نگاری سے واضح کرتے ہیں۔ اس کا یہ افسانہ پولیس گردی اور مظلوموں کی بے بسی کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے جیل میں قید دلبر کے کردار کے ذریعے پولیس کے قیدیوں سے بُرے سلوک اور غریبوں کی بے کسی کے منظر کی وضاحت کی ہے۔ بچارہ دلبرا پنے خلاف جھوٹے الزام

کی تردید کرنے پر کس طرح پولیس کے تشدد کا شکار ہوتا ہیا وراس کے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی پراس کی جدائی کے نتیجے میں کیا بیتی، اس سب کا اظہار شاہد رضوان کے افسانے میں یوں ملتا ہے:

> ’’یہ سب جواٹ ہے، من گھڑت کہانی ہے، دلبرا پنے خلاف لگنے والے الزام پر چلایا، تیری ماں ـ ـ ـ ـ ـ ـ تیری بہن ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ایس ایچ او نے ماں بہن کی گالیاں دیتے ہوئے گھونسوں سے اس کے منہ پر حملہ کر دیا، وہ بے چارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بیٹے کی یاد میں رو رو کر نوراں کی آنکھوں کا پانی ختم ہو گیا تھا، کرن کی کچی آنکھیں رو رو کر سوجھ گئیں، ان میں سرخی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ ناصر اور اختر بھائی کی تصویروں سے لپٹ لپٹ کر اپنی اداسیوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ امام دین تو پتھر کی مورتی کی طرح چارپائی پر پڑا رہتا، کون آیا؟ کیا ہوا؟ اس نے ایسی باتوں سے چھٹکارا پالیا تھا‘‘۔(15)

دین اسلام ہمیں عدل وانصاف کا حکم دیتا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی کے میدان ہو عدل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسی کے سبب انسانیت اور رشتوں کا حسن ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں انصاف کا حصول ہر ایک شہری کا بنیادی حق ہے۔ مگر افسوس آج ہمارے غریبوں کے لیے اس کی رسائی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ غریب بے گناہ ہو کر بھی گناہگاروں اور مجرموں کی فہرست میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جبکہ امیر ظالم، جابر اور قاتل ہو کر بھی سر بازار آزادی سے دھندناتا پھرتا ہے۔

آج ہمارے ہاں انصاف فقط امراء، وڈیروں اور جاگیرداروں تک محدود ہو رہ گیا ہے۔ وہ جب اور جیسے چاہیں قانون کو اپنی مرضی کے مطابق کر لیتے ہیں۔ اس سب کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان غریبوں کا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ امراء غریبوں کا بہت بری طرح سے استحصال کرتے ہیں۔ یہ اپنے ماتحت کام کرنے والے غریب مزدوروں کو ہر طرح سے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں۔ افسانہ نگار غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے ’’دیوانے لوگ‘‘ کے ذریعے ظلم کا نشانہ بننے والے مزدوروں گے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ آپ کا افسانہ "دیوانے لوگ" موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد افسانہ ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے جیل میں قید بے گناہ مزدوروں کی مشکلات کا تذکرہ بڑی حقیقت نگاری سے کیا ہے۔ اس افسانے میں عابو کو مرکزی کردار کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ عابو کا کردار ایک مثالی مزدور کا ہے۔ جس کو ٹھیکیدار اپنے ہاں کام پر رکھ کر اس پر احسان جتاتا ہے۔ آج کے دور میں مہنگائی

عروج پر ہے۔مزدور طبقہ اپنی دیہاڑی چھوٹ جانے کے ڈر سے کم معاوضے کے عوض کام کرنے پر مجبور ہے۔ بیچارہ غریب مزدور مشکل سے دو وقت کی روٹی کھا پاتا ہے۔ٹھیکیدار اس کی غریبی اور بے بسی کا ناجائز اٹھا کر اس سے غلط کام بھی کروا لیتے ہیں۔وہ ان پر کام سے نکالنے کا دباؤ ڈال کر انہیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔غلام فرید کاٹھیا نے مزدوروں کے استحصال کا ذکر کرتے ہوئے ٹھیکیدار کی ذہنیت سے پردہ اٹھایا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ٹھیکیدار ان غریبوں کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔مگر جب یہی مزدور ان سے اپنی اجرت بڑھانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ انہیں کام سے نکالنے جیسی دھمکیاں دیتے ہیں،مگر اس کے ساتھ ہی ان منافقانہ رویوں کے مالک ٹھیکیداروں کو جب کسی ناجائز کام میں مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو بڑے ہی پیار سے ان مزدوروں سے گفتگو کرتے ہیں،انہیں چائے پانی کی دعوت دیتے ہیں اور بعض اوقات تو ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔اپنے مطلب کے تحت یہ انہیں مختلف طرح کا لالچ دے کر ورغلانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔غرض یہ ٹھیکیدار انہیں مختلف طریقوں سے بلیک میل کرتے رہتے ہیں۔کچھ ایسا ہی حال اس افسانے میں عابو کا بھی ہے جو بہت غریب لیکن محنت کش اور ایماندار شخص ہے۔جس پر ٹھیکیدار تھوڑی سی نوازش کرتا ہے اور اسے بدلے میں رات کے وقت کچھ مزدوروں کے ساتھ مل کر بجری اور سریے کی ٹرالی بھرنے کا حکم دیتا ہے۔مگر جب عابو کو ٹھیکیدار کی بے ایمانی اور چوری کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے باقی ساتھیوں سمیت وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے کامیابی نہیں مل پاتی۔ یہ مالک کو ہماری شکایت نہ لگا دیں،اور معاشرے میں ہماری عزت نہ خراب ہو جائے،ٹھیکیدار اس خوف سے عابو اور اس کے مزدور ساتھیوں پر چوری اور قتل جیسے سنگین الزامات لگا کر انہیں جیل میں پھنکوا دیتا ہے۔افسانہ نگار نیا فسانے میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کس طرح اوورسیئر ٹھیکیدار اور جیل وارڈن وغیرہ سب رشوت خور،کمیشن خور اور منفی سوچ کی حامل قوتیں ہیں۔وہ بے چارے لاچار اور غریبی کے شکار محنت کش مزدوروں پر ظلم کرتے رہتے ہیں۔ یہ بے ضمیر ملی بھگت سے ملک کی املاک اور قوم کا خزانہ چراتے رہتے ہیں۔ان ظالموں کو فقط لالچ،خود غرضی اور منافع کمانے کی پڑی ہوتی ہے۔انہیں بیچارے غریب مزدوروں کی جان،مال یا عزت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔انہیں بس اپنی جھوٹی اور نام نہاد عزت بچانے سے سروکار ہوتا ہے جس کے لیے یہ لالچی اور رشوت خور پولیس پر نوٹوں کی بارش کرتے ہیں،اور ان معصوم و بے گناہ مزدوروں کو ڈکیتی اور قتل اور کے الزامات میں پھنسا کر سخت سزائیں دلواتے ہیں۔

آج ہمارے معاشرے میں سرمایہ داروں اور وڈیروں کے ہاتھوں غریبوں کا بہت بری طرح استحصال ہو رہا ہے۔جس کی روک تھام بہت ضروری ہے۔ ہمارے کئی افسانہ نگاروں نے مزدوروں کے مسائل اور پولیس گردی پر قلم اٹھایا ہے اور وہ غریبوں کے حق کے لیے آواز بھی بلند کر رہے ہیں۔ایسے ہی افسانہ نگاروں میں ایک نام غلام فرید کاٹھیا کا بھی ہے جنہوں نے اپنے افسانوں میں پسماندہ طبقے کو موضوع بنا کر امیر ٹھیکیداروں اور ان کے کارندوں کے ہاتھوں مزدوروں کے استحصال کو بیان کیا ہے۔اگر چہ یہ موضوع غلام فرید کاٹھیا کے ہم عصر افسانہ نگار شاہد رضوان کے ہاں بھی ''تارکول کی سڑک'' میں ملتا ہے تاہم غلام فرید کاٹھیا نے اس موضوع کو وسعت و گہرائی کے ساتھ زیادہ موثر انداز میں بیان کیا ہے۔شاہد رضوان نے اس موضوع کو متوسط جبکہ غلام فرید کاٹھیا نے پسماندہ طبقے کے تناظر میں دیکھا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا پسماندہ طبقے کے مزدوروں کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ امیر لوگ غریب عوام کو اپنے ناجائز کاموں میں استعمال کر کے بعد میں انہیں جیل بھجوا دیتے ہیں۔ جہاں ان ملزمان کو سب سے نچلے درجے کی جیل میں رکھا جاتا ہے۔وہاں ان سے ظالموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان غریبوں کے گھریلو حالات اتنے اچھے نہیں ہوتے اور ان کے گھر والوں کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ وہ اپنے پیاروں کی ضمانت کروا کر انہیں جیل سے نکلوا سکیں۔اس لئے ان بیچاروں کو برسوں اور بعض اوقات تو عمر بھر بھی جیل ہی میں رہنا پڑتا ہے۔غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''دیوانے لوگ'' ایک غریب مگر ایماندار اور محنت کش مزدور عابو کی کہانی ہے۔ٹھیکیدار عابد اور اس کے ساتھیوں سے غیر قانونی کام کرواتا ہے اور پکڑے جانے پر الٹا ان بیچاروں پر ہی ڈکیتی اور قتل کا جھوٹا الزام لگا کر انہیں جیل میں ڈلوا دیتا ہے۔عابو کے اہل خانہ کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اس کی رہائی کے واسطے کوئی پیشہ ورانہ وکیل کروا کر اس کی معصومیت و بے گناہی کو ثابت کروا سکیں۔ ٹھیکیدار نے عابد کے خلاف جھوٹے گواہ پیش کر کے عابد کو تمام عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھجوا دیا۔غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے کے ذریعے مزدوروں پر ہونے والے ظلم اور پولیس کے منفی کردار پر روشنی ڈالی ہے:

> ''پھر وہ دن بھی عابد کو کل کا دن نظر آنے لگا جب اسے اور اس کے زخمی ساتھی کو عدالت نے اوورسیئر کے قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا دی تھی۔ان کا تیسرا ساتھی ان کے جرم کی اعانت کے پانچ سال سزا بھگت

کر جا چکا تھا۔ ان تینوں کے خلاف اوورسیئر سے ساٹھ ہزار چھیننے کے لیے قتل کا الزام لگا۔ مدعی وہی پھاٹک والا چوکیدار بنا۔ ٹھیکیدار اور ٹریکٹر ڈرائیور ان کے خلاف چشم دید گواہ تھے۔ جنہوں نے ملزموں کو شناخت پریڈ میں کمال مہارت سے شناخت کر لیا تھا۔‘‘(16)

غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان نے اپنے افسانوں کے ذریعے اردو افسانے کے دامن کو وسعت دی ہے۔ دونوں کے افسانے حقیقت سے قریب اور معاشرتی رویوں کے عکاس ہیں۔ اگرچہ دونوں افسانہ نگاروں کی فکروفن، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی تصورات اور پیشکش و اسلوب کے سلسلے میں کافی مماثلتیں اور اختلافات موجود ہیں، مگر اس تحریر اور تقابلی موازنے کے نتیجے میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مقصود نہیں بلکہ دونوں افسانہ نگاروں کی ادبی اہمیت اور حقیقی مقام و مرتبہ کا تعین مقصود تھا۔ دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں کا جائزہ لینے، غوروفکر اور تلاش و جستجو کے بعد جو اہم نکات سامنے آئے ہیں اور جن کی تفصیل مختلف ابواب میں مع حوالہ جات دی جا چکی ہے ان کو بطور اجمال چند نکات کی شکل میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

☆ شاہد رضوان کا سرمایہ ادب غلام فرید کاٹھیا کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

☆ اگرچہ غلام فرید کاٹھیا نے سفرنامہ جبکہ شاہد رضوان نے ناول اور شاعری کی، تاہم دونوں کے فن کا عروج افسانے میں نظر آتا ہے۔

☆ غلام فرید کاٹھیا نے عموماً پسماندہ طبقے کو اپنے افسانوں میں منعکس کیا ہے جبکہ شاہد رضوان کے ہاں سبھی طبقات کی نمائندگی ملتی ہے۔

☆ غلام فرید کاٹھیا کے ہاں واضح اور صاف پلاٹ ہمیشہ موجود رہتا ہے جبکہ شاہد رضوان کے ہاں کبھی کبھار پلاٹ خاصا پیچیدہ نظر آتا ہے۔

☆ غلام فرید کاٹھیا کی کہانیوں میں علامت و اشاریت نہیں ہوتی جبکہ شاہد رضوان کے ہاں بعض افسانوں میں علامت و اشاریت واضح طور پر موجود ہیں۔

☆ غلام فرید کاٹھیا نے افسانوی فن اور تکنیک میں کوئی اجتہاد نہیں کیا تاہم ان کا اسلوب تحریر سادہ اور جاندار ہے، جبکہ شاہد رضوان اپنے فن اور تکنیک کے بعض جدید رویوں کو شعوری طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً شعور کی رو اور فلیش بیک خیالات کا استعمال ملتا ہے۔

☆ شاہد رضوان نے نسوانی کردار زیادہ تعداد میں پیش کیے ہیں جبکہ غلام فرید کاٹھیا کی تخلیقات

میں نسوانی کردار نسبتاً کم ہیں۔

☆ شاہد رضوان کے یہاں بے باکی اور کسی قدر جنسیت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ غلام فرید کاٹھیا پر ایسے موقعوں پر بے باکی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

☆ شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا دونوں کے یہاں داخلی ماحول کا اثر نظر آتا ہے۔ اور ان کے کرداروں کی جذباتی کیفیات بڑے بہترین انداز سے بیان کی گئی ہے۔

☆ شاہد رضوان کے ہاں افسانوں میں تو اتنی طوالت نہیں البتہ غلام فرید کاٹھیا کا ایک افسانہ ''لمحوں کی قید'' کچھ طویل ہے۔

☆ شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں کے کردار زندگی کی حرارت سے بھرپور وہ جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔

امید ہے کہ مندرجہ بالا نکات مقالے کے نفس مطلب کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہونگے اور اس مقالے کے مطالعہ سے اہل نظر دونوں فکشن نگاروں کے بارے میں منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رویہ اپنائیں گے نیز دونوں فکشن نگاروں کی جہات پر مزید غور و فکر کے راستے نکلیں گے اور ان کے فکرو فن سے آئندہ زیادہ بہترین طریقے سے استفادہ کیا جا سکے گا۔

غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان دونوں کی کہانیوں میں دور حاضر کے مسائل اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں نے بڑے ہی بہترین انداز سے زندگی کو ہر رُخ سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے مگر ہر رخ میں انہیں شاید ایک ہی پہلو سب سے زیادہ نمایاں نظر آیا۔ وہ پہلو ''بھوک'' ہے، جو کسی جگہ جسمانی بھوک کہیں حرص و ہوس کی بھوک تو کسی جگہ پیٹ کی بھوک کی صورت میں ان کی کہانیوں کا موضوع بنتی دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح غلام فرید کاٹھیا کے اکثر افسانوں میں متضاد معاشرتی رویوں مثلاً وڈیروں، جاگیرداروں اور چوہدریوں کی منافقانہ شخصیت کا ذکر ملتا ہے۔ بالکل اسی طرح شاہد رضوان بھی اپنے افسانوں میں موجود کرداروں کی زندگی میں خواص و عام کی تخصیص کرتا ہے۔ مثلاً آپکے افسانے ''بچھو'' اور ''مسلی ہوئی پتیاں'' معاشرتی تفریق کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا کے ہاں یوں تو وہ خاصے متنوع موضوعات نظر آتے ہیں تاہم کچھ ایسے موضوعات بھی ہیں جو دونوں میں مماثل ہیں مثلاً ''رشوت خوری''، ''غریب مزدوروں کا استحصال''، ''عورتوں سے جنسی جبر''، ''پولیس گردی و کمزور نظامِ انصاف'' اور ''قدرتی آفات'' وغیرہ وہ موضوعات ہیں جو دونوں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں کی ایک خاص بات ان کے نسوانی کردار ہیں۔ جو عورت کی نفسیات وکیفیات اور مرد کے ہاتھوں اس کے استحصال کی داستان سنتے ہیں۔شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا کی کہانیاں دھرتی کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں۔ان میں اسی لئے مٹی کی بو اور خالص پن موجود ہے۔ان کے تمام کردار اپنے اپنے طبقے کے ماحول،اسکی زبان اور معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار صداقت سے معمور لمحوں کی تلاش میں ان کے ساتھ چلتے نظر آتے ہیں دونوں افسانہ نگاروں نے مسجع ومقفع الفاظ کی بجائے سادہ اور دیہات کی عوامی زبان کو اپنے افسانوں میں استعمال کیا ہے۔ بلاشبہ دونوں افسانہ نگاروں نے منفرد موضوعات پر افسانے تحریر کیے ہیں۔ دونوں نے اپنے افسانوں میں اپنا زندہ معاشرہ محفوظ کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ شاہد رضوان، پتھر کی عورت، دانیال پبلشرز، چیچہ وطنی، 2010ء، ص:164-165
2۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، گنجی بار پبلشرز، ساہیوال، 2008ء، ص:116
3۔ شاہد رضوان، پہلا آدمی، دانیال پبلشرز، چیچہ وطنی، 2013ء، ص:155
4۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:34
5۔ شاہد رضوان، پہلا آدمی، ص:152
6۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:130
7۔ شاہد رضوان، پتھر کی عورت، ص:41
8۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:17
9۔ شاہد رضوان، ادھوری کہانی، کی تصویر، دانیال شاہد، چیچہ وطنی، 2020ء، ص:167
10۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، سفید تتلیوں کا ہار، بک ہوم لاہور، 2022ء، ص:30
11۔ شاہد رضوان، ادھوری کہانی کی تصویر، ص:173
12۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، سفید تتلیوں کا ہار، ص:97
13۔ شاہد رضوان، ادھوری کہانی کی تصویر، ص:88
14۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:53
15۔ شاہد رضوان، پتھر کی عورت، ص:127-128
16۔ مہر غلام فرید کاٹھیا، لمحوں کی قید، ص:11

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حاصلِ تحقیق

افسانے کا شمار اردو کی مقبول ترین اصناف میں ہوتا ہے۔ اس کی روایت اگرچہ مغرب سے ہمارے ہاں آئی مگر قصوں، حکایتوں اور داستانوں کی صورت میں کہانی کی ایک مضبوط روایت ہماری تہذیب اور ادب میں پہلے سے تھی۔ جدید ادب کی اس صنف میں افسانوی انداز میں حقیقی واقعات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ افسانہ ناول کی نسبت کافی چھوٹا ہوتا ہے۔ دراصل افسانہ وہ صنف ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکے۔ انگریزی میں افسانے کے لیے Short Story کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اردو افسانے کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ افسانے سے قبل لوگ لمبی لمبی داستانوں اور ناولوں کو پڑھنے اور سننے کے شوقین تھے۔ ان کے پاس وافر وقت موجود تھا۔ جھوٹی من گھڑت پریوں، جنوں اور مافوق الفطرت عناصر سے بھرپور کہانیاں کئی کئی دنوں اور بعض اوقات تو مہینوں چلتی رہتی ہیں۔ مگر ایجادات اور ترقی کے سفر کے ساتھ ہی لوگوں کی مصروفیات میں اضافہ ہونے لگا۔ وقت کی قلت ہونے لگی تو لوگوں نے لمبی داستانیں سننا اور پڑھنا ترک کر دیں۔ افسانے کی ایجاد کے پیچھے انسان کی بڑھتی ہوئی مصروفیات بھی کارفرما ہیں۔ ایک ایسا انسان جس کے پاس وقت کی کمی ہو اس کے لیے افسانہ ہی اس کے ذوق کی تسکین ہے۔

افسانے کا ہمارے ادب سے بڑا گہرا تعلق ہے، کیونکہ ادب زندگی کا عکاس ہے۔ اس کے ذریعے معاشرتی تعمیر و ترقی پروان چڑھتی ہے۔ ادب تہذیبی، سماجی اور فکری رجحانات و میلانات کو اپنے دامن میں سموئے ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب زندگی سے جنم لیتا ہے اور ادب اور زندگی ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ چونکہ افسانے میں زندگی اور اس کی حقیقتوں سے متعلق بات کی جاتی ہے اس لیے ادب اور زندگی دونوں سے افسانے کا بہت گہرا تعلق ہے۔ افسانے میں افسانہ نگار ماحول، واقعے، کردار یا جذبے کے اظہار کو فنی تقاضوں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ افسانے میں اشاریت، اختصار، وحدت تاثر اور ایمائیت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ پلاٹ، کردار، ماحول اور فضا کے ساتھ ساتھ افسانے میں حقیقت نگاری اور کرداروں کا جاندار ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

افسانہ معاشرے کے مجموعی رویوں کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ افسانے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ تاریخ کو اپنے اندر سمونے کا ہنر رکھتا ہے۔ اردو افسانے کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں قیام پاکستان کے دلخراش واقعات، ہجرت و شہادت کے مناظر، قدرتی آفات، دہشت گردی،

غربت کی چکی میں پستے عوام، کرپشن خوری، ڈکٹیٹرشپ و مارشل لاء، سیاسی حالات، بدعنوانی، عورتوں سے ظلم غرض معاشرے کا ہر موضوع اور ہر مسئلہ شامل ہے۔ افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ معاشرتی بے حسی و بے رحمی جیسے رویوں کو اپنے دامن میں سمولینے کا ہنر رکھتا ہے۔

اردو افسانے کی خوش بختی ہے کہ اسے آغاز ہی سے تین اہم رویے نصیب ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم نے جہاں اسے اپنے رومانی رجحانات بخشے، وہیں پریم چند نے حقیقت نگاری کی بنیاد پر اردو افسانے کی عمارت استوار کرنے میں مدد دی، اسی طرح راشد الخیری نے اپنی کہانیوں کے سبب روحانی اور اسلامی طرز کا اخلاق عام کرنے کی کوشش کی۔ مگر اردو افسانے کی پہلی جست "انگارے" کی اشاعت کو تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی ترقی پسند تحریک کا نقطہ آغاز تھا۔ اس تحریک نے معاشرتی حقیقت نگاری اور اپنے انقلابی شعور کے نتیجے میں اردو افسانے کو نئے مضامین سے روشناس کروایا۔ اسی عہد میں اردو افسانے کے وہ بہترین افسانہ نگار پیدا ہوئے جن کی بدولت اس عہد کو اردو افسانے کا ''عہدِ زریں'' قرار دیا جاتا ہے۔ عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور کرشن چندر نے اردو افسانے کی عظمت و رفعت میں اضافہ کیا۔ قیام پاکستان کے دوران تقسیم، ہجرت اور فسادات نے اردو افسانے کو نئے موضوع عطا کیے۔

اسی طرح ترقی پسند تحریک کے بعد حلقہ ارباب ذوق عمل میں آیا۔ جس کے تحت لکھنے والوں میں انتظار حسین، ممتاز مفتی، حسن عسکری، الطاف فاطمہ، رشید اور آغا بابر شامل ہیں۔ اس حلقے نے علامت نگاری کو فروغ دیا۔ اس دور میں افسانہ نگاروں کی ایک ذہین نسل ابھر کر سامنے آئی۔ جس نے افسانے کے دامن کو وسعت دی۔ جیلانی بانو، انتظار حسین، رام لعل، بانو قدسیہ، واجدہ تبسم، جمیلہ ہاشمی اور غلام ثقلین نقوی وغیرہ کی بدولت اردو افسانے کے کینوس کو وسعت ملی۔ انتظار حسین نے افسانے کو علامتی واساطیری جبکہ انور سجاد نے تجدیدی اور استعاراتی انداز عطا کیا۔ آمریت، جبر اور اظہار رائے پر پابندیوں کے نتیجے میں پاکستانی افسانے میں علامت نگاری نے جگہ پائی۔ امجد، مظہر الاسلام، جوگندر پال، قرۃ العین حیدر اور منشا یاد وغیرہ نے علامتی طرز کے اظہار کے لیے اردو افسانے کو شعور و آگہی بخشی۔ اس دور میں جدید عہد کے انسان کی ہوس پرستی، حرص و طمع و اخلاقی بحران، جبر، خوف و تنہائی اور بے یقینی افسانوں میں کھل کر سامنے آئی۔ 65 کی جنگ نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دور کے افسانوں میں محبت و خود شناسی جیسے موضوعات ابھر کر آئے۔ اسی طرح جہاں ستر کی دہائی میں علامتی افسانے لکھے گئے تو سقوط ڈھاکہ جیسے سانحے کے نتیجے میں افسانے میں اجتماعی دکھ اور کرب ابھر آیا۔ اسی کی دہائی میں جدید افسانے میں مابعد جدید افسانوں کی ابتدا ہوئی

اورافسانے نے ذات کے دائروں سے باہر نکل کراپنا رشتہ سیاسی، معاشی،اورسماجی مسائل وحقائق سے وابستہ کیا۔اس دور میں افسانے کے اجزائے ترکیبی اورفنی لوازمات پرازسرِ نوغورکیا گیا۔اس دور میں مارشل لاء کے نتیجے میں مزاحمتی ادب وجود میں آیا۔نوے کی دہائی میں اردوافسانے میں حقیقت نگاری اورابلاغ وترسیل نے جگہ پائی۔اس دور میں افسانے نے متنوع موضوعات اپنائے۔اکیسویں صدی میں سیاسی،معاشی اورمعاشرتی موضوعات کے علاوہ ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے مسائل، ایٹمی دھماکے،سیلابی نقصانات ،دہشت گردی ،نائن الیون اور خودکش حملوں جیسے موضوعات نے افسانے میں جگہ پائی۔اس دور کا افسانہ بین الاقوامی صورت حال کا ایک حسین نمونہ پیش کرتا ہے۔ ہمارے دورِ جدید کا افسانہ آج ترقی کی منازل بڑی تیزی سے طے کررہا ہے۔آج کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کوایک نیا رنگ اورنئی جہت دی ہے،معاشرے کے افراد کی نجی مجبوریوں اورذاتی افکارکوافسانے میں اس طرح اجاگر کیا گیاہے کہ پورا سماجی اورسیاسی نظام افسانے کے دامن میں سمٹ آیا ہے۔آج کے افسانوں میں معاشرتی زندگی ،سیاسی حالات،انسانی افکار، بین الاقوامی تناؤ،اقتداراورنظریات کی بہترین انداز سے ترجمانی ملتی ہے۔جدید دور کےافسانہ نگاروں میں ناصر عباس نیر،سلمیٰ اعوان ،حمیرا اشفاق ،مستنصر حسین تاڑر،شہناز نقوی ،اکبر علی ناتق اورنجم الدین احمد وغیرہ کے نام شامل ہیں۔یہ افسانہ نگار اپنے بہترین ترین افسانوی ادب کے باعث اردوافسانے میں گرانقدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔اردوافسانے نے اپنے ارتقاء سے اب تک مسلسل ترقی کی منازل طے کی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری وساری ہے،بلاشبہ ہمارے افسانہ نگاروں نے تکنیکی ،ہیتی اوراسلوبیاتی حوالے سے اردوافسانے میں کامیاب تجربات کیے۔

موضوعات کے حوالے اردو افسانے کا دامن کافی وسیع ہے۔ معاشرتی مسائل ہوں، نفسیاتی پریشانوں کا ذکر ہو،معاشی حالات ہوں،سیاسی صورت حال ہو یا جنسی ومزاحمتی مسائل،اردو افسانے میں ہرایک کا ذکر بہترین انداز سے ملتا ہے۔اردوافسانہ اپنے آغاز سے لےکراب تک اپنے فن، ہیئت،تکنیک زبان اوراسلوب کی سطح پر بہت سارے تجربات سے ہوتے ہوئے اپنے دامن میں خاصی وسعت، گہرائی اورتنوع پیدا کر چکا ہے۔اردوافسانے کے منظرنامے پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دورافسانے کا تجرباتی دور ہے۔یہ دور کہانیوں کے اعتبار سے سابقہ ادوار کی نسبت زیادہ زرخیز ہےاوران شاءاللہ یہ دوراردوافسانے میں ہمیشہ زندہ وجاوید رہے گا۔ہمارااردوافسانہ آج جس مقام پر ہے وہ ہمارے افسانہ نگاروں ہی کی بدولت ہے،کہ جنہوں نے اپنی محنت اورکوشش سے افسانے کو دیگر اصناف میں اس قدر ممتاز مقام دلوایا۔ پریم چند اور دیگر افسانہ نگاروں نے

جہاں افسانے کی پرورش اور نوک و پلک سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا، وہیں مختلف ادوار میں مختلف تحریکوں اور فکشن نگاروں نے اس کی عزت اور وقار کو بلند کیا، آج اکیسویں صدی میں اردو افسانہ جن افسانہ نگاروں کی بدولت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ انھی کی صف میں کھڑے ہمیں دو جدید اور بہترین اسلوب کے مالک افسانہ نگار مہر غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان بھی نظر آتے ہیں۔ جو اپنی محنت اور لگن سے ادب کے لیے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں کے موضوعات اسی معاشرے سے جنم لیتے ہیں، اور جس بے بسی اور لاچارگی کے دور سے ہم گزر رہے ہیں اس کی جھلکیاں ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہیں۔

مہر غلام فرید کاٹھیا جدید اردو افسانے میں ایک ابھرتا ہوا نام ہیں۔ جنھوں نے افسانہ نگاری کے علاوہ سیاست کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کا نعرہ لگانے والی پیپلز پارٹی کے MNA اور MPA ہونے کے ساتھ ساتھ سید یوسف رضا گیلانی کی کابینہ کے وزیر مملکت برائے تعلیم بھی رہ چکے ہیں۔ آپ اکیسویں صدی کے جدید افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی خاص بات ان کا اختصار اور زبان کی سادگی ہے جو انھیں اپنے ہم عصر ادیبوں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے۔ مہر غلام فرید کاٹھیا کے اب تک 3 افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جو کہ بالترتیب ''لمحوں کی قید''، ''سرسوں کا پھول'' اور ''سفید تتلیوں کا ہار'' کے نام سے قارئین آپ کے ذوق کی تسکین کا باعث بن رہے ہیں۔ مہر غلام فرید کاٹھیا اپنے افسانوں کے ذریعے غربت کی چکی میں پسنے والے غریبوں محتاجوں اور لاچاروں پر جاگیرداروں اور وڈیروں کی جانب سے ہونے والے ظلم کو بیان کیا گیا ہے۔ آپ کے افسانے غریبوں کے استحصال اور ان سے کی جانے والی ناانصافیوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ کارل مارکس اور ترقی پسند تحریک کے تحت جس طرح ہمارے افسانہ نگاروں نے پسماندہ طبقہ کے مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کے مسائل کو جس عمدگی سے اپنے افسانوں میں بیان کیا اسی کی ایک کڑی غلام فرید کاٹھیا بھی ہیں، جن کے افسانوں کا موضوع پسماندہ طبقے کے مسائل ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں غریب ہاریوں، کسانوں، اور دیگر طبقوں کو درپیش مشکلات کی عمدہ عکاسی کی ہے۔

غلام فرید کاٹھیا کے اکثر افسانوں میں غریب مزدوروں کو درپیش مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ آپ کے افسانے بتاتے ہیں کہ ایک غریب مزدور کو دوران ملازمت ٹھیکیداروں اور اپنے سے اعلیٰ طبقے کی طرف سے استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ٹھیکیدار انھیں چھوٹی سی غلطی پر کام سے نکال دیتے ہیں، اور دوسری جگہ مزدوری نہ ملنے کے باعث انھیں بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ

ٹھیکیدار مزدوروں سے ناجائز اور غلط کام کرواتے ہیں اور بدلے میں انہیں کام سے نکالنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ وہ انہیں زیادہ مشقت کے بدلے کم اجرت دیتے ہیں۔ ان پر طرح طرح سے ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ ان بیچارے غریبوں کو صحت کی سہولیات بھی میسر نہیں ہوتیں، مہنگائی کے سبب ان کے گھریلو حالات بہت تنگ ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی بہت بڑی بیماری کا علاج کروانے کے لیے پرائیویٹ یا سرکاری ہسپتالوں کے خرچے اٹھاتے پھریں۔ اس لئے ان غریبوں کو اپنے قریبی کلینکوں سے ہی دوائی لینا پڑتی ہے، جو انہیں تھوڑے وقت کے لیے تو افاقہ دیتی ہے تاہم یہ اندر ہی اندر ناسور کی شکل اختیار کر کے بعد میں کسی بہت بڑے حادثے یا بیماری کا نتیجہ بنتی ہے۔ حکومت کی جانب سے ان غریبوں کو ریلیف اور سبسڈی دینے کا تو اعلان کیا جاتا ہے تاہم یہ حقیقت سے پرے فقط دعوے ہی ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کی جانب سے آج مزدوروں کے روزگار کے عدم تحفظ کے لیے قدم اٹھانا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ مزدور ہی ملکی معیشت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ یہ دن رات اپنی محنت کی وجہ سے ان امیروں اور کے خزانوں کا منہ بھرتے رہتے ہیں تاہم انہیں ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ غلام فرید کاٹھیا اپنے افسانوں میں غربت میں پسے ہوئے طبقے کے مسائل اور سماجی عدم مساوات جیسے موضوعات کو معاصر زندگی کے تناظر میں اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عام آدمی کے دکھ اور مشکلات کے علاوہ جاگیردانہ اور سرمایہ دارانہ افراد کی طرف سے جنسی درندگی کا نشانہ بنتی مظلوم خواتین کا بھی ذکر ملتا ہے۔ آپ کے افسانوں ''ٹھنڈے ہونٹ''، ''اندھیروں کا رقص'' اور ''لمحوں کی قید'' میں مزدوروں، ہاریوں اور غریب کسانوں کے خاندان کی عورتوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان گاؤں کے وڈیروں اور چوہدریوں کی نگاہ میں ان غریبوں کی بیٹیوں اور خواتین کی کوئی عزت نہیں ہوتی، ان کا جب جی چاہے یہ جس مرضی غریب کے گھر کی عورت کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور اپنی جنسی درندگی و ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ آپ کا افسانہ ''ٹھنڈے ہونٹ'' معاشی مجبوریوں کے باعث گھر سے باہر نکل کر محنت مزدوری کرنے والی عورتوں جبکہ ''اندھیروں کے رقص'' عورت کی پسند ناپسند کی نفی اور معاشی مجبوریوں کی عکاسی کرتا ہے۔ عورتوں سے متعلق آپ کے یہ تمام افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت آج کس طرح بے دردی سے جنسی ہوس کا نشانہ بن رہی ہے۔ یہ غریب مزدور، ہاری اور کسان ان جاگیرداروں کی زمینوں پر محنت و مشقت کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں یہ چوہدری اور وڈیرے عیاشی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بدلے میں انہی کی بیٹیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں ہمارے معاشرے کے ایک بنیادی مسئلے

یعنی مذہبی قدامت پسندانہ رویوں اوراس کے نتیجے میں غریبوں پر کیے جانے والے جبر کو پیش کیا ہے۔

غلام فرید کے کئی افسانے امیری غریبی، ذات پات کی اونچ نیچ اور حسب ونسب کے باعث نکاح جیسے مقدس رشتے میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں اور مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ان کے افسانے ''ڈائریکٹر جنزل''، ''ہیلو ہائے'' اور ''انتظار'' امعاشرے میں غریبوں کو بے وقعت سمجھنے والوں کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''لمحوں کی قید'' افسانہ وڈیروں کی زیادتیوں،غریبوں کی بیٹیوں کے اغوا اور اُن سے جنسی زیادتیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ وڈیرے اپنی ہوس اور لالچ کی وجہ سے کبھی بھی کسی کو بھی پولیس کے ذریعے قتل یا چوری کے جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر جیل بھجوا دیتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانے اپنے اندر تجسس، روزمرہ زندگی کے واقعات اور بھرپور دلچسپی کے عناصر سموئے ہوئے ہیں۔ان کے افسانوں میں منفی جاگیردارانہ سوچ کا اظہار کھل کر دیکھنے کو ملتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں پاکستان کے ایک بہت بڑے مسئلے یعنی غربت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ غربت کی وجہ سے غریبوں کی زندگی بہت دشوار ہوگئی ہے۔غربت کی وجہ سے جہالت اور ناخواندگی وجود میں آرہی ہے اوراس کے سبب غریبوں کو کھانے کے لیے دووقت کی روٹی تک میسر نہیں۔

غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے "انّو" میں غربت کی وجہ سے محنت مزدوری کرنے پر مجبور بچے انو کی داستان بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح چھوٹے بچوں کو معاشی مجبوریوں کی وجہ سے کھیلنے کودنے کی عمر میں ہی کام کاج پر جانا پڑتا ہے۔افسانہ نگار نے متوسط طبقے کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔آپ کا افسانہ ''ڈائریکٹر جنزل'' درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک لڑکے سروش کو حصول ملازمت کے لیے درپیش مشکلات کو اجاگر کرتا ہے،افسانہ نگار نے اس کہانی کے ذریعے معاشرے میں پھیلے ہوئے رشوت اور بدعنوانی کے جال سے پردہ اٹھایا ہے۔

غلام فرید کاٹھیا نے ناگہانی آفات خصوصا زلزلوں کے نتیجے میں غریبوں کو پیش آنے مسائل کا بھی اپنے افسانوں میں تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس مشکل کی گھڑی میں ان لوگوں کی مدد کے لیے کوئی نہیں آتا۔ غلام فرید کاٹھیا کا افسانہ ''اندھیروں کا رقص'' پسے طبقے کے دکھوں کا احاطہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ان غریبوں کے دکھ ان کے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے،ان کے خاندان میں اگر کسی کی فوتگی ہوجائے تو اس کے لئے کفن دفن کا انتظام کرنا ان مجبوروں کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں پسماندہ طبقے کو پیش آنے والی مشکلات کا ذکر بڑی ہی دردمندی سے کیا ہے۔ ان کے افسانے سرمایہ داروں، چوہدریوں، وڈیروں اور

جاگیرداروں کے ظلم وستم، جھوٹی شان وشوکت، اور خودغرضی اور منافقت کو اجاگر کرتے ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا کی خاص بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے ان مسائل کو اجاگر کیا ہے جن پر آپ سے قبل بہت کم لکھا گیا۔ یوں تو پسماندہ طبقہ کے مسائل کی فہرست کافی طویل ہے، مگر افسوس کہ آپ نے جن موضوعات پر لکھا آپ سے قبل ان پر زیادہ کھل کر بات نہیں کی گئی، کیونکہ ہمارے اکثر افسانہ نگاروں کے افسانے ہمیں دولت مند طبقے ہی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں، جن میں افسانے کا مرکزی کردار کسی امیر کبیر باپ کی بگڑی ہوئی اولاد یا کسی سرکاری عہدے پر فائز کوئی فرد ہوتا ہے۔ اس وجہ سے غریبوں کے حوالے سے لکھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ کیونکہ اعلیٰ طبقے کا اپنے حصار سے باہر نکل کر لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے جن فکشن نگاروں نے پسے ہوئے طبقے کی تکلیف کو اپنے افسانوں کا موضوع خاص بنایا وہ قابل تحسین ہیں۔ کیونکہ انھوں نے سچائی کے ساتھ غریبوں کی تکلیفوں کو محسوس کر کے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ غلام فرید کاٹھیا ایک ایسے فنکشن نگار ہیں کہ جن کے افسانے دیہاتی زندگی کی مشکلات، تعلیم کی کمی، عورتوں کے جنسی استحصال، مزدوروں سے جبر کے واقعات، ذات پات کی تفریق، طاقتور کی بد معاشیوں، علاج معالجے کے مسائل اور غریب محنت کشوں پر ظلم کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھنے سے ہمیں حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں مصنوعی زندگی، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے دوغلے چہروں، ان کی خود پسندی وخودغرضی، انا، لالچ وطمع اور اندرونی غلاظت کا عمدگی سے اظہار کیا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانے مہنگائی کے شکار غریبوں کی پریشانیوں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے مظالم اور جیل کے قیدیوں کی تکلیفوں کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ غرض منفرد اسلوب کے مالک اس فکشن نگار نے غریبوں کی زندگی کے تمام ہی موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ بلاشبہ آپ جدید اردو فکشن نگاروں کے ساتھ مل کر اردو ادب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

شاہد رضوان اردو افسانے کی روایت سے جڑا وہ بہترین افسانہ نگار ہے جس نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ آج ہم جس بے بسی اور تنہائی کا شکار ہیں اس کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہیں۔ شاہد رضوان ملک کے ابھرتے ہوئے ان افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جن کے افسانوں کے موضوعات میں خاصا تنوع ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے چاہے وہ وطن سے محبت کے جذبات ہوں، پیاروں کے بچھڑنے کا دکھ ہو، زندگی کا کرب ہو، عورت کو درپیش معاشرتی مجبوریاں ہوں، بے وفائی ہو، ظلم کا راج

ہو، جنسی رویے ہوں یا کہ غربت کی کہانیاں ہوں، حتیٰ کہ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو، شاہد رضوان کے ہاں ہر ایک کا اظہار ملتا ہے۔ شاہد رضوان کے افسانوں میں موجودہ دور کے معاشرے کا عکس جھلکتا ہے۔

شاہد رضوان کے افسانوں میں ہمیں محاکمہ نگاری، تفصیل نگاری، اور جزیات نگاری بڑے شاندار انداز میں نظر آتی ہے۔ شاہد رضوان کا بیانیہ سادہ، مؤثر اور ابہام سے پاک ہے۔ شاہد رضوان کے افسانے اپنے دامن میں حقیقت نگاری کے واضح نمونے سموئے ہوئے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کو حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ آپ نے معاشرے کی بے رحمی، سیاسی ثقافتی اور سماجی فضا کی اپنے افسانوں میں بھرپور انداز سے عکاسی کی ہے۔ شاہد رضوان کے افسانے طبقات کی اونچ نیچ، حسب نسب، معاشرتی ناانصافیوں اور ظلم کی داستانوں پر محیط ہیں۔ ان کے ہاں غلام عباس جیسا پھیلاؤ اور منٹو جیسی جنسی سفاکی کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ شاہد رضوان موجودہ دور کے انسان کی نفسیات کو بڑی خوبی سے اپنے افسانوں میں جگہ دیتا ہے۔ شاہد رضوان کے ہاں دلچسپی کا ایسا عنصر پایا جاتا ہے کہ قاری کہانی شروع کر کے اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔

شاہد رضوان کے افسانوں کے کردار نچلے اور متوسط طبقے کے ہیں، جو اپنے طبقے اور ماحول کی زبان کی خوب عکاسی کرتے ہیں۔ شاہد رضوان کی کچھ کہانیاں اپنی ثقافت کی آئینہ دار بھی ہیں۔ شاہد رضوان کے افسانے زندگی کی حقیقتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار اپنے قارئین سے بات چیت کرتے، اپنے دکھ سکھ بانٹتے، اور زندگی کی حرارت سے بھرپور جیتے جاگتے کردار معلوم ہوتے ہیں۔ شاہد رضوان کے افسانوں میں اچھائی اور برائی کے کردار بڑے واضح انداز میں نظر ہیں۔ شاہد رضوان کے اکثر افسانوں میں کہانی کا اختتام نہیں ملتا بلکہ وہ اسے قاری ہی پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود سوچے اور نتیجہ اخذ کرے۔ ایک بہترین افسانے میں جن تمام خصائص کا پایا جانا ضروری ہے ان سب خوبیوں کا شاہد رضوان کے ہاں پایا جانا ان کی افسانے سے گہری وابستگی کا ثبوت ہے۔ اب تک شاہد رضوان کے چار افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں جو ان کی فکری وفنی پختگی اور ثابت قدمی کا منہ بولتا اظہار ہیں۔

شاہد رضوان کے اب تک چار افسانوی مجموعے جو بالترتیب ''پتھر کی عورت''، ''پہلا آدمی''، ''آوازیں'' اور ''ادھوری کہانی کی تصویر'' کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ شاہد رضوان کے افسانوں میں متوسط طبقے کی عورت کے مختلف روپ بڑی خوبصورتی سے دکھائے گئے ہیں۔ آپ نے اپنے افسانوں میں شادی شدہ خواتین کی آرزوؤں، مرد کے ہاتھوں عورت کے استحصال، قدرتی آفات، دہشت گردی، جبری شادی، وراثت کے معاملوں، کرپشن، خواتین کی

معاشرتی مجبوریوں، جھوٹے پیروں فقیروں غرض زندگی کا ہر پہلواور ہر رنگ جھلکتا ہے۔شاہد رضوان کے افسانوں کے دامن میں کئی رنگ برنگی دلچسپیاں نظر آتی ہیں جو انسان کے اندر اور باہر کے تضاد کی کشمکش اور ضمیر کی جنگ کو اجاگر کرتی ہیں۔

آج ہمارے معاشرے میں عورت پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ وٹہ سٹہ، قرآن سے نکاح، کاروکاری، غیرت کے نام پر تو کہیں جنسی استحصال کے روپ میں عورت کو ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ شاہد رضوان نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت پر ہونے والے مظالم پر قلم اٹھایا ہے۔آپ کے افسانوں میں غریب اور متوسط طبقے کی عورت کے مختلف روپ دکھائی دیتے ہیں۔پھر چاہے وہ ''پتھر کی عورت'' کی رضیہ ہو، چندا کی آنکھوں میں سجے خوشحالی کے خواب ہوں، ''آوازیں'' مجموعے میں ''بانجھ عورت'' کی کنول ہو، آخری سیڑھی کی نیلوفر ہو، مائی مستانی کا کردار ہو یا پھر ''کتیا'' افسانے کی شگفتہ کی کہانی ہو یہ سب عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور زاویوں کو واضح کرتی ہیں۔اسی طرح ''پہلا آدمی'' میں ''جوگی چوک'' اور ''سفید بال''، مجموعہ ''ادھوری کہانی کی تصویر'' میں ''تارکول کی سڑک''، ''ٹھیکے دار''، ''دجال''، ''غارت گر لمحہ'' اور ''ٹرمینل'' وغیرہ ایسے ایسی شاندار کہانیاں ہیں جو تانیثی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔شاہد رضوان کے افسانوں میں تعلیمی اداروں کی بچیوں سے لے کر گھریلو ظلم سہتی خواتین تک کی پریشانیوں اور مسائل کا ذکر ملتا ہے۔شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں نئی نویلی دلہنوں، معاشی مجبوریوں سے تنگ اور محنت ومزدوری کرتی عورتوں، نوجوان لڑکیوں اور مردانہ ظلم کا شکار خواتین کی مشکلات کو بڑی دردمندی سے بیان کیا ہے۔آپ کا افسانہ ''مزدور'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے زندگی کے بے عزت تقاضوں کے ساتھ لڑنے کے بعد اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے۔ یہ کہانی عورت کے وجود کا اظہار بن کر سامنے آتی ہے۔آپ نے طوائفوں اور پیشہ کرنے والی خواتین کی مجبوریوں اور مشکلات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔مثلاً آپ کا افسانہ ''جوگی چوک'' اور ''مآل کار'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔شاہد رضوان کا افسانہ ''حج اکبر'' جائیداد کے لین دین اور رشتوں کی کشمکش میں پھنسی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کا شوہر جائیداد نہ لانے پر اسے طلاق کی دھمکیاں دیتا اور مارتا پیٹتا ہے جبکہ اس کے والدین زمینی لالچ کی وجہ سے اسے زمین کا ٹکڑا دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔یوں دوہرے چنگل میں پھنسی عورت نہیں جانتی کہ وہ آگے جائے یا پیچھے کو لوٹے۔

شاہد رضوان کا یہ افسانہ مختلف رشتوں کو سنبھالتی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کے ماں باپ اسے اس کا زمینی حق دینے کی بجائے حج پر چلے جاتے ہیں، مصنف نے اس افسانے کو طنزیہ طور

پر ''حج اکبر'' کا نام دیا۔غلام فرید کاٹھیا کا یہ افسانہ معاشرتی حرص و لالچ کو ظاہر کرتا ہے۔اسی طرح آپ کا افسانہ ''تارکول کی سڑک''ایک مزدور ماں کی معاشی مجبوریوں کو اجاگر کرتا ہے جو اپنی بیٹی کو غربت کے سبب جسم فروشی کی اجازت دیتی ہے۔ہمارے معاشرے میں عورت کو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی باتوں اور طعنوں کا سامنا کرنے کے علاوہ بانجھ ہونے جیسے القابات سننے پڑتے ہیں۔جنہیں عورت اکثر چپ چاپ سہہ لیتی ہے۔''بانجھ عورت''ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنے خاوند کی کمزوری کا راز رکھ کے اپنے خاندان اور محلے والوں کی باتیں سنتی ہے۔یہ سب اس کی روح کو چھلنی کر دینے والا ہوتا ہے مگر وہ سب برداشت کرتی ہے لیکن جب اس کا اپنا مجازی خدا اس کی کردار پر الزام تراشی کرتا ہے تو وہ تڑپ جاتی اور حقیقت کو عیاں کرتی ہے شاہد رضوان کا یہ افسانہ عورت کی باطنی کیمسٹری کا بہترین اظہار ہے۔افسانہ نگار نے بڑی حویلیوں کی بلند دیواروں کے پیچھے سسکتی ایسی عورتوں کی بھی کہانیاں بیان کی ہیں جو جنہیں قرآن کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔''اونچی حویلی'' افسانہ اس ظلم کو بیان کرتا ہے۔''پکنک پوائنٹ''سلاب کی تباہ کاریوں کو کیمرے کے لینز میں محفوظ کرنے والوں اور ایک ایسی ستم زدہ لڑکی کی کہانی ہے جو معاشرے کے چہرے پر زوردار طمانچہ رسید کرتی ہے۔اسی طرح ''آخری سیڑھی''معاشرے کے کرداروں کی باطنی خباثتوں اور خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے۔

شاہد رضوان کے افسانوں میں رشوت خوری کرنے والوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو لوگوں کا خون چوس چوس کر اپنے بینک بیلنس میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔''باباجی''اس موضوع پر لکھا گیا ایک بہترین افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے محمود نامی ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی ہے جسکی ساری زندگی زمین کا ایک پلاٹ الاٹ کروانے میں گزر گئی۔پٹواری،منشی،کلرک،چوکیدار اور آفیسر ہر کسی نے اسے فائلوں کے چکروں میں پھنسا کر اپنے اپنے طور پر لوٹا۔شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں ہمارے معاشرے کے ان سادہ لوح دیہاتیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔جنہیں چالاک لوگ ان کی معصومیت کی وجہ سے لوٹ لیتے ہیں۔آپ کا افسانہ''سائیں جی''جھوٹے پیروں فقیروں کی حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔ہمارے وطن کے کروڑوں غریبوں پر چند ہزار امیروں کی حکومت ہے۔جو سیاہ وسفید کے مالک بنے غریبوں کو لوٹ رہے ہیں شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں ایسے افراد کا بھی ذکر کیا ہے۔آپ نے غریبوں کے مسائل کی بہترین انداز سے عکاسی کی ہے۔شاہد رضوان کے بعض افسانے دہشت گردی کے نتیجے میں معصوم لوگوں کی شہادت،انسانی جانوں کے ضیاع اور دہشت گردوں کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔مثلاً آپ کا افسانہ''انتظار''ایک جنونی دہشت گرد کے مذموم مقاصد کو عیاں کرتا ہے۔اسی طرح آپ کا افسانہ''مسلی ہوئی پتیاں''دہشت گردی کے نتیجے میں

شہید ہونے والے غریبوں کے خاندانوں کی معاشی بے بسی، ایک عام آدمی اور ایک لیڈر کی موت پر نظر آنے والے متضاد معاشرتی رویوں اور معاشرے میں پائی جانے والی اونچ نیچ کو بیان کرتا ہے۔شاہد رضوان کے افسانوں کے موضوعات خاصے وسیع ہیں۔آپ نے معاشرے میں پائے جانیوالے منفی رویوں کو بڑی دردمندی سے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔آپ کا افسانہ ''بچھو'' انسانی فطرت کی شرانگیزیوں پر گہرا طنز ہے،افسانے کی کہانی مذہبی انتہا پسندی کواجاگر کرتی ہے۔شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں غریب طبقے کو درپیش مشکلات کا ذکر کیا ہیاور بتایا ہے کہ امیر طبقہ غریبوں کو ہر لمحہ ظلم وستم کا نشانہ بناتا ہے۔امیر اپنی مفاد پرستی، لالچ اور دولت کی وجہ سے غریبوں کی تذلیل کرتے ہیں۔غریبوں کو کوئی بھی کام کروانا ہوتو انہیں ان امیروں کی جیبیں بھرنے کے لیے رشوت ادا کرنا پڑتی ہے۔

شاہد رضوان نے اپنے افسانوں میں عدل کے کمزور نظام، امیروں کی مفاد پرستی وخود غرضی، معصوم دیہاتیوں کی جعلی اور نوسر باز فقیروں کے ذریعے لٹے جانے، رشوت خوری، وراثتی لالچ، زہر آلود انسانی رویوں، قدرتی آفتوں، زلزلوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں،عورتوں پر معاشرتی ظلم، زندگی سے خواتین کے سمجھوتوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کو بڑے ہی بہترین انداز سے بیان کیا ہے۔ دراصل افسانہ نگار نے معاشرے کے جھوٹے اور منافقانہ چہرے سے نقاب ہٹانے کی بہترین کاوش کی ہے،اور وہ بہت حد تک اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ بلاشبہ شاہد رضوان جدید اردو افسانے میں بہترین اضافہ ہیں۔

غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان عہد حاضر کے دو ایسے بہترین اور فاضل افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کا دائرہ کار خاصا وسیع اور جن کے افسانوں کے کردار معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ان کے افسانوی کردار زندگی کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والی فضا میں اپنے فیصلوں پر چلتے نظر آتے ہیں۔دونوں کے نسوانی کردار بڑے ہی جاندار، قول وعمل کے خود ذمہ دار، آپ اپنی پہچان کرواتے اور اپنے دور کے انسان کی خوشیوں اور غموں، شادمانیوں اور محرومیوں، تمنّاؤں اور آرزوؤں کا واضح اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ دونوں افسانہ انگاروں کا اسلوب سادہ، دل نشین، اور موثر ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے لوگوں کے درپیش مسائل کو اپنے ہاں جگہ دی۔ معاشرے کی حقیقتوں اور لوگوں کے منفی رویوں کو قارئین کے سامنے لائے۔دونوں افسانہ نگاروں کے افسانے سچائیوں پر مبنی اور معاشرے کے مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ سماجی ظلم کے باعث جنم لینے والے المیے ان کے افسانوں میں خاص طور پر جگہ پاتے ہیں۔غلام فرید

کاٹھیا اور شاہد رضوان کے افسانوں کے کردار اسی سماج کی دین ہیں اور جس بے بسی، دکھ اور تنہائی کا آج ہم شکار ہیں اسے عیاں کرتے ہیں غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر پسماندہ طبقے کے غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور ہاریوں پر سرمایہ داروں اور وڈیروں کی طرف سے کیے جانے والے ظلم کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ شاہد رضوان کے اکثر افسانوی موضوعات درمیانے طبقے کی پریشانیوں، عورتوں کی معاشرتی مجبوریوں، طبقاتی کشمکش، سماجی ناانصافیوں اور ظلم کی داستانوں پر مشتمل ہیں۔ ہمارے ان دونوں افسانہ نگاروں نے بڑے ہی بہترین انداز سے انسانی زندگی کو درپیش مشکلات کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ دونوں کے اکثر موضوعات کافی متنوع ہیں تاہم مزدوروں کا استحصال، خواتین سے جنسی زیادتیاں، رشوت، پولیس گردی، قدرتی آفات، ناانصافی اور غربت وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو دونوں کے ہاں مماثل ہیں۔ دونوں فکشن نگاروں کے افسانوی کردار عورت کے احساسات، اسکی نفسیات اور مرد کے ذریعے اس کے استحصال کو بیان کرتے ہیں۔ شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا دونوں ہی کے افسانوں کی زبان سادہ، سلیس اور عوامی ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوی موضوعات خاصے منفرد اور توجہ طلب ہیں۔ چونکہ شاہد رضوان اور غلام فرید کاٹھیا دونوں کے افسانے اسی سرزمین کی پیداہوئے اسی لئے ان میں اس معاشرے کا سچا عکس اور خالص پن نظر آتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا اور شاہد رضوان کے افسانوں کے تمام کردار اپنے اپنے طبقے کی فضا، اپنے علاقے کی زبان اور سماجی رویوں کی بڑے ہی جاندار و موثر انداز سے عکاسی کرتے ہیں۔ بلاشبہ دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں معاشرے کے مسائل کی بہترین انداز میں تصویر کشی کی ہے، دونوں کے افسانے معاشرتی سچائیوں کے آئینہ دار ہیں اس بنا پر کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا اور تقابل کرنا خاصا دشوار ہے تاہم دونوں افسانہ نگاروں کے خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غلام فرید کاٹھیا کے افسانہ اظہار کی زیادہ بہتر اور موثر سطح پر نظر آتا ہے۔ بلاشبہ دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنا زندہ معاشرہ محفوظ کر دیا ہے۔ جس کی بنا پر تاریخ انہیں یاد رکھے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

کتابیات

بنیادی ماخذات

☆ شاہد رضوان، ادھوری کہانی کی تصویر، دانیال پبلشرز، چیچہ وطنی، 2020ء

☆ شاہد رضوان، آوازیں، سانجھ پبلشرز، لاہور،، 2015ء

☆ شاہد رضوان، پتھر کی عورت، دانالل پبلشرز، چچہا وطنی، جنوری 2010ء

☆ شاہد رضوان، پہلا آدمی، دانا،ل پبلشرز، چچہ، وطنی، 2013ء

☆ مہر غلام فرید کاٹھاد لمحوں کی قدل، محکمہ ادبی مرکز، شادمان ٹاؤن، ساہویال 2008ء

☆ مہر غلام فرید کاٹھا،، سرسوں کے پھول، ناصر بک سنز، لاہور، 2019ء

☆ مہر غلام فرید کاٹھا،، سفد وتتلونں کا ہار، ساہومال 2021ء

ثانوی ماخذات

☆ Third York, New knops, a Afred Quinn 1958Robison Edition,

☆ Literature, of Encyclopedia (Ed) S.H., Steinberg vol.1.1953

☆ ابوالخیر کشفی، سید، ادب اور قومی شعور، مشمولہ، پاکستانی ادب، جلد اول، مرتبین، رشید امجد، فاروق علی، ایف جی سرسید کالج، روالپنڈی، مئی 1981ء

☆ اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ تعبیر وتنقید، نئی دہلی، ماڈرن پبلشرز ہاؤس، 2006ء

☆ پروین اظہر، ڈاکٹر، اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس۔

☆ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب (مرتبہ)، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 2009ء

☆زینب النسا، نئے افسانے کے موضوعات مشمولہ: روحِ ادب، جلد 14، شمارہ 51۔
☆سبینہ اویس، ڈاکٹر، افسانہ شناسی، فیصل آباد، مثال پبلشرز، 2015ء
☆شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ (تنقید)، کراچی، منظر پبلشرز، 1982ء
☆صغیرا افراہیم، پروفیسر، اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، طبع دوم، 2009ء
☆ طاہر طیب، ڈاکٹر، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، فیصل آباد، مثال پبلشرز، 2015ء
☆ عارف ثاقب، ڈاکٹر، بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس، لاہور، کتاب نما، 1999ء
☆ عائشہ سلطانہ، ڈاکٹر مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ (1947ء سے تا حال)، دہلی، ایجوکیشنل پبلشرز ہاؤس
☆فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، 2005ء
☆ قمر رئیس، ڈاکٹر، مضامین پریم چند (مرتبہ)، دہلی: علی پرنٹنگ پریس، 1960۔
☆ محمد احسن ڈاکٹر، کرشن چندر اور مختصر افسانہ نگاری، نئی دہلی، موڈرن پبلشرز ہاؤس، 1989ء
☆ محمد عالم خاں، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانوی رجحانات، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، 1958ء
☆ مولوی نیر الحسن نیر، نور الغات (جلد دوم) لاہور، سنگ میل پبلشرز، س ن۔
☆ وقار عظیم، افسانہ نگاری، آلہ آباد: سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، 1930

☆☆☆☆☆☆☆